لسانی جائزے



مصنف: ڈاکٹر گیان چند جین

مرتبہ: ڈاکٹر فیض رسول انصاری

لسانی جائزے

لسانی جائزے

ڈاکٹر گیان چند جین
مرتب: ڈاکٹر فیض رسول انصاری

بک ٹاک
میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور

لسانی جائزے

ڈاکٹر گیان چند جین

ناشر ——— بک ٹاک، لاہور

اشاعت ——— 2018ء

طابع ——— پرنٹ یارڈ پرنٹرز، لاہور

قیمت ——— -/640 روپے

بک ٹاک ——— میاں چیمبرز، 3- ٹمپل روڈ لاہور

فون ——— 042-36374044-36370656-36303321

Email:book_talk@hotmail.com

www.booktalk.pk

www.facebook.com/booktalk.pk

فہرست

''لسانی جائزے'' ایک تعارف

ڈاکٹر گیان چند جین (۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء۔ ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء) اردو ادب کے معروف محقق، نقاد، غالب شناس، ماہر اقبالیات، خاکہ نویس، مورخ ادب، عظیم استاد اور ماہر لسانیات تھے۔ اُن کا تحقیقی و تنقیدی کام بہت متنوع اور معیار و مقدار کے لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ انہوں نے بھوپال، علی گڑھی، لکھنؤ اور سری نگر کی جامعات میں بطور صدر شعبۂ اردو خدمات سرانجام دیں۔ ان چاروں یونیورسٹیوں کا تعلق ہندوستان کے تین متنوع مزاج علاقوں سے ہے۔ مختلف مزاج خطوں میں رہتے ہوئے انہیں زبان و ادب کی باریکیوں سے روشناس ہونے کا خوب موقع ملا۔ اس طرح انہوں نے ادبی تحقیق اور لسانیات پر رجحان ساز کتب سے اردو ادب کو نوازا۔ ڈاکٹر گیان چند کی شہرۂ آفاق کتب، جنہوں نے انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا، اُن میں سے ''اردو کی نثری داستانیں''، ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' اور ''تحقیق کا فن'' شامل ہیں۔ یہ کتب اپنے موضوع اور تحقیقی معیار کے لحاظ سے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ اُن کی دیگر تصانیف میں ''پرکھ اور پہچان''، ''اردو کی ادبی تاریخیں''، ''رموزِ غالب''، ''تفسیر غالب''، ''ابتدائی کلام غالب''، ''شخصیات و تاثرات''، ''ادبی اصناف''، ''اردو ادب کی تاریخ'' بہ اشتراک ڈاکٹر سیدہ جعفر ہیں۔ علاوہ ازیں لسانیات پر بھی اُن کا خاصا کام ہے۔ اس ضمن میں ''عام لسانیات''، ''لسانی مطالعے''، ''لسانی رشتے''، ''لسانی جائزے'' اور ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر اُن کی تصنیف ''لسانی جائزے'' کا تعارف ہے جو اس وقت آپ کے

زیر مطالعہ ہے۔ ''لسانی جائزے'' ڈاکٹر گیان چند کی ایک معتبر تصنیف ہے، جسے ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ یہ تصنیف دو سو اسّی (۲۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب ''ملک کے چوٹی کے اردو ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی'' کے نام ہے۔ یہ کتاب تیرہ مضامین اور دو تبصروں پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون ''لسانیات کے مطالعہ کی افادیت'' سے متعلق ہے۔ اس کے آغاز میں لسانیات کی نامقبولیت کا ذکر ہے اور خاص طور پر بتایا گیا ہے کہ اردو اور ہندی میں لسانیاتی کتب کا تناسب ایک اور پچاس کا ہوگا، اس سے کم نہیں۔ گریرسن کے ہندوستانی لسانی جائزے کو نامکمل قرار دے کر خطے میں ازسرِ نو جائزہ لیتے ہوئے مختلف مقامی بولیوں کا اطلس تیار کرنے اور صوتیات کے مطالعہ کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ مختلف ممالک کے رسم الخط کے حوالے سے باہمی موازنہ بھی شامل ہے۔ لسانیات کی اقسام (لسانی زمانیات، اسلوبیات، تجزیاتی لسانیات اور کمپوٹری لسانیات) بیان کرتے ہوئے ان کی باریکیوں، آوازوں، مصوتوں، مصمتوں، عروض و صوتیات، زبانوں کی قواعد کا لسانیاتی اصولوں کے مطابق مرتب کرنے، زبان کو جاننے اور اس کے اسرار و رموز کے مطالعہ کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون ''آغاز زبان کے نظریات'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں سولہ نظریات کا خلاصہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے، ان میں سے پانچ نظریات کو فکر انگیز قرار دیا گیا ہے، مثلاً ہنری سویٹ کا نظریہ، ریویز کا نظریہ، تاراپوروالے کا نظریہ، استرتے وانت کا نظریہ اور ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کا نظریہ وغیرہ۔

آخر میں ابتدائی زبانوں کے آغاز کے متعلق تو نہیں البتہ خصوصیات کے بارے میں چھ نکات کی صورت میں اظہار خیال ملتا ہے۔ ''ہندوستان کے رسوم الخط'' کے موضوع کے تحت تیسرا مضمون شامل ہے۔ اس میں ہندوستان کے دو قدیم ترین رسم الخط کا ذکر ہے، مثلاً کھروشٹھی اور براہمی۔ اوّل الذکر نے کسی دوسرے خط کو جنم نہیں دیا۔ اس لیے اس کی اہمیت بہت کم ہے۔ اس کے برعکس دوسرا رسم الخط ''براہمی'' ہے۔ ہندوستان کی تمام لپیاں اسی کی

اولاد ہیں۔ بعدازاں براہمی خط کے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں مختلف اسالیب اور شاخوں کا ذکر ہے۔ اسی مضمون کے نصف حصے کے بعد دسویں صدی کے قریب ابھر کر نمایاں ہونے والے جدید رسوم الخط کا تذکرہ ہے جن میں دیوناگری، بنگلہ، گرنتھ خط، وٹ لتو خط اور تامل خط شامل ہیں۔

زیرِ نظر تصنیف میں چوتھا مضمون ''اردو کی ہکاری آوازیں اور حروف'' ہیں۔ لسانیات میں ہکاری آوازوں سے مراد دو چشمی (ھ) والی آوازیں ہیں۔ اس مضمون میں صرف ہکاری آوازوں اور ہائے مخلوط والے حروف کا تعین کیا گیا ہے۔ ہندی میں دس ہکاری مصمتے مشہور ہیں لیکن اس سے پہلے اردو کی جدی زبانوں میں ہکاری مصمتوں اور ہکاری حروف پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ اس میں معروف ماہرین لسانیات مثلاً ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر شیام سندر داس، سرسوتی سرن، مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری، اسماعیل میرٹھی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رشید حسن خاں اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مضامین اور کتب کے حوالے سے سیر حاصل بحث ملتی ہے۔

پانچواں مضمون ''یائے اضافت اور ہمزہ'' کی بحث پر مشتمل ہے۔ آغاز میں زبان کے مسائل کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر کا ذکر ملتا ہے۔ مزید بحث میں بتایا گیا ہے کہ فارسی قواعد کی روح سے یائے اضافت کے ساتھ ہمزہ نہیں آتا۔ اردو کا کوئی رسالہ دیکھ لیں، ۹۵ سے ۹۹ فیصد مقامات پر یائے اضافت کے اوپر ہمزہ لکھا نظر آئے گا۔ صرف ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا عرشی اور مالک رام صاحب جیسے ماہرین علوم شرقیہ کی مطبوعہ تحریریں اس سے پاک ہوں گی۔ حصول مقصد کے لیے رسائل، کتب، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، عہد بہ عہد کے مخطوطات اور عربی و فارسی کے حوالے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

چھٹے مضمون ''اردو زبان اور فارسیت'' میں فاضل مصنف نے میر احسن کے تذکرے کے بعد شاہ میراں جی شمس العشاق اور اُن کے فرزند شاہ برہان الدین جانم اور ولی دکنی کے شعری حوالوں مضمون سے مزین کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شمالی ہند کی پہلی تصنیف افضل کی ''بکٹ

کہانی"، میر جعفر زٹلی، فائزہ و حاتم، میر و میرزا اور فضلی کی "کربل کتھا" فورٹ ولیم کالج اور مرزا غالب تک نثری حوالہ جات سے مضمون کو چار چاند لگائے گئے ہیں۔ آخر میں بتایا گیا ہے کہ فارسی پرستی کا پہاڑ سرسید کے تیشے سے ٹوٹا اور اس کے بعد اردو نثر کو بنیادی اسلوب میسر آیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض احباب اپنی تحریروں کے بعض حصے فارسی سے گراں بار کرتے رہے، جن میں ابوالکلام اور شاعر مشرق شامل ہیں۔ "بھوپالی اردو" کے عنوان سے ڈاکٹر گیان چند نے بھوپال میں بولی جانے والی زبان اردو کو صوتی اور نحوی لحاظ سے بیان کیا ہے اور معنوی لحاظ سے اسے شقوں میں تقسیم کر کے بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔

"کلام اکبر میں انگریزی الفاظ" کے نام سے آٹھواں مضمون ہے۔ اس میں کلام اکبر میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کی فہرست ملتی ہے۔ ان الفاظ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح نواں مضمون "اردو میں دخیل انگریزی الفاظ کی جنس" میں مجموعی طور پر الفاظ کی مذکر و مونث کی بحث کے بعد زیادہ تر کتابی اور روزمرہ بول چال میں شامل انگریزی الفاظ کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ اس سے آگے چار مضامین بالترتیب: لسانیات کا ایک محسن سنتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بحیثیت ماہر لسانی خدمات، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ: لسانی تناظر کے عنوانات کے تحت ان کے مختصر حالات زندگی، تصانیف اور لسانی خدمات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ حصہ "ج" جلیل مانک پوری کی تصنیف "مسائل زبان اردو" اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کی تصنیف "اردو زبان کی تاریخ" پر پُر مغز تبصرے ملتے ہیں۔

مندرجہ بالا مختصر تعارف کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب میں ہر مضمون آگاہی ہے اور معلومات کا بیش بہا خزانہ اندر سموئے ہوئے ہے۔ تاہم آغاز زبان کے نظریے، رسوم الخط، ہکاری آوازیں اور حروف اور یائے اضافت اور ہمزہ لسانی ادب میں قاری کے لیے دلچسپی کا سبب بنتے رہیں گے۔

یہ درست ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں ہندوستانی کتب کا حصول ممکن تھا

لیکن اب ناممکنات میں سے ہے، قاری کو ہندوستانی کتب کے حصول کے لیے دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ لاہور (ایکسپو سینٹر) میں منعقد ہونے والے "بک فیئرز" میں ہندوستانی پبلشرز کے اسٹال نظر نہیں آتے۔ اس طرح اکثر قاری ہمسایہ ملک کے ادبا و محققین کے افکار تازہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔

ہم اپنے کرم فرما اور محسن جناب رانا سلطان محمود صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے نہ صرف زندہ دلانِ لاہور بلکہ پورے پاکستان کے لیے ہندوستانی کتب کے حصول کو آسان بنا دیا ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے اپنے معروف اشاعتی ادارے "بک ٹاک" سے کتابی سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے لاہور میں عارضی قیام کے دوران (۲۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء) اس امر پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ "پاکستان میں میرے مضامین کے موضوع وار مجموعوں کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔ کئی علمی ادارے یہ مجموعے شائع کر رہے ہیں۔" پاکستان میں زیرِ نظر کتاب کی اشاعت کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایسی کتب جو صرف ہندوستان کے قارئین کے لیے لکھی گئی ہیں انہیں پاکستان میں بھی روشناس کرایا جائے تاکہ زبان و ادب کے شائقین کو تحریک مل سکے۔

مجھے اُمید ہے معلومات کی تازہ کاری کے علاوہ دیدہ زیب کمپوزنگ و طباعت کی بنا پر نہ صرف لسانیات بلکہ عام قاری کے لیے بھی یہ تصنیف باعثِ کشش ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر فیض رسول انصاری
(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو)
گورنمنٹ کالج راوی روڈ
شاہدرہ، لاہور

لسانیات کے مطالعے کی افادیت

اس مضمون کو ایک نجی تجربے کے بیان سے شروع کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک بار میرے ایک کرم فرما نے کہا:

"آپ نے یہ کیا لسانیات پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ ادبیات پر لکھیے! آپ مجھے معاف کریں گے۔ جس طرح پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ اسی طرح آج کل یہ سچ ہے کہ بگڑا ادیب لسانیات نگار۔"

ان کا یہ مفروضہ صحیح ہو کہ نہ ہو لیکن اس سے یہ سچائی ضرور سامنے آ جاتی ہے کہ اردو میں لسانیات کس قدر نامقبول ہے۔ کسی رسالے میں لسانیات پر کوئی اصطلاحی مضمون لکھیے تو دل کو یہ خلش رہتی ہے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے والے مشکل سے دس افراد ہوں گے۔ بقیہ یہی کہیں گے کہ قابلیت کی نمود کر رہا ہے۔

محمد حسین آزاد نے نیرنگِ خیال کے دیباچے میں انگریزی کے مقابلے میں اردو ادب کی تنگ دامانی پر ماتم کیا تھا کہ تہذیب کے دربار میں آج اردو صفِ آخر میں کھڑی ہے۔ کیا تمھیں اس کی یہ بیکسی گوارا ہے!

انھوں نے جو بات اردو انشا کو پیش نظر رکھ کر کہی تھی وہی بات آج لسانیات کو لے کر اردو پر صادق آتی ہے۔ مغربی زبانوں کو تو چھوڑیے، ہندوستانی زبانوں کا دربار ہو تو اس میں بھی اردو سب سے پیچھے رہے گی۔ اردو والے لسانیات کیوں پڑھیں اور اس موضوع پر کیوں لکھیں! اس مسئلے کے افادی پہلو پر غور کرنے سے پہلے یہ دلیل سامنے آتی ہے کہ اردو والوں کو لسانیات

اس لیے پڑھنی چاہیے کہ ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں والے پڑھ رہے ہیں۔ چاند پر زندگی کے آثار نہیں لیکن اس کے باوجود امریکہ اور روس دونوں وہاں پہنچنے کی قیمتی دوڑ میں لگے تھے محض اس لیے کہ فریق ثانی اس شغل میں لگا تھا اور ایک دوسرے سے پیچھے نہ رہنا چاہتا تھا۔ اردو کو بھی دوسری ہندوستانی زبانوں کے دوش بدوش چلنا ہے۔

لسانیات میں اردو کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ ہر سال گرمیوں میں منعقد ہونے والے گرمائی اسکول لسانیات میں ہوتا ہے۔ ان میں تقریباً سوا سو متعلم شرکت کرتے ہیں۔ پانچ سات کے علاوہ یہ متعلم دراصل کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کسی زبان و ادب کے شعبے کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد ہندی کے معلموں کی ہوتی ہے اور سب سے کم اردو کے۔ اردو والے دو یا تین سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ واضح ہو کہ نصاب کسی مخصوص زبان سے وابستہ نہیں ہوتا۔ درس صرف انگریزی زبان میں دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جنوب کی چاروں ریاستوں، مہاراشٹر، گجرات وغیرہ میں ہندی کے پڑھانے والے انھیں ریاستوں کے اصل باشندے ہوتے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی کا شعبۂ ہندی تامل بولنے والے اساتذہ پر مشتمل ہے تو میسور، بنگلور کا کنٹر بولنے والوں پر۔

لسانیات اسکول میں تمام زبانوں اور ریاستوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہاں اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لسانیات کے بڑے علماء غیر ہندی والوں میں سے ہیں، ہندی والے نہیں۔ طلبہ میں بھی (جو دراصل اپنی درس گاہوں میں لیکچرر ہوتے ہیں) دوسری زبان والوں کو لسانیات میں جو دخل اور درک ہوتا ہے وہ ہندی والوں کو نہیں ہوتا اور اس کی خاص وجہ انگریزی کا ذریعۂ تعلیم ہونا ہے۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ ہندی والے لسانیات میں کئی دوسری زبانوں سے پیچھے ہیں ہندی اور اردو کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

مختلف یونیورسٹیوں سے ایم۔ اے ہندی کرنے کے بعد ہندی کے کسی لسانیاتی موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والون کی تعداد دیکھیے وہم وقیاس سے زیادہ ہوتی ہے۔ آگرہ یونیورسٹی کی فہرست نظر سے گزری جس میں اب تک ہندی میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کے نام اور

موضوع بھی دیے تھے اور ان کے بھی جو آج کل محور ریسرچ ہیں۔ اس فہرست میں لسانیات کے اتنے زیادہ اور اتنے متنوع موضوعات تھے کہ دیکھ کر ہوش پرآں ہو گئے۔ ہندی کی کوئی بولی اور کوئی اہم مصنف باقی نہیں جس کا لسانیاتی مطالعہ نہ کیا گیا ہو۔ کسی کالج یا یونیورسٹی کی لائبریری میں ہندی کا سیکشن دیکھیے موٹی موٹی جلدیں رکھی ہوں گی۔ سور کی بھاشا، تلسی کی بھاشا وغیرہ۔ اردو میں کسی ادیب کی زبان پر ایک کتاب نہیں۔ بلا مبالغہ اردو اور ہندی میں لسانیاتی کتابوں کا تناسب ایک اور پچاس کا ہوگا اس سے کم نہیں۔

اردو میں لسانیات کی قابل ذکر کتابیں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور یہ جس موضوع پر جس معیار کی ہیں ہندی میں اس موضوع اور اس معیار کی کتابیں اردو کی کتابوں سے کم از کم تیس سال پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کو تو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، اس کا ہر طرف بول بالا ہے۔ اردو کو کون پوچھتا ہے؟ لیکن پاکستان میں تو اردو کو سرکاری پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ہم اردو کے ذخیرے پر نظر کرتے ہیں تو ہندو پاک دونوں کی تحریروں کو شامل کر لیتے ہیں کیونکہ ابھی تک اردو ادب کی تقسیم نہیں ہوئی ہندو پاک کا اردو ادب ایک اکائی ہے۔ اس طرح لسانیات کے باب میں اردو کے بے نہایت افلاس کے سبب اردو میں لسانیات کے ذکر و فکر کی اشد ضرورت ہے۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں گریرسن نے ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ لیا تھا۔ یہ جائزہ سرانجام دے کر گریرسن نے ہمارے ملک کی بہت بڑی علمی خدمت کی لیکن اس کا طریق کار سائنسی نہ تھا۔ اس نے نثر کے ایک ایک دو صفحات لکھ کر کلکٹروں کو بھیج دیے اور انھوں نے پٹواریوں کی مدد سے ان کا مقامی بولی میں ترجمہ کروایا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر گریرسن نے فیصلہ کیا کہ کس علاقے کی کون سی بولی ہے اور کس زبان اور بولی کا کون سا علاقہ ہے۔ جہاں زبانوں یا بولیوں کے ڈانڈے ملتے ہیں وہاں کا تشفی بخش مطالعہ لسانیات میں تربیت یافتہ شخص ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے سے اب تک آبادی میں بہت کچھ نقل مکانی ہوا ہے جس کی وجہ سے گریرسن کا جائزہ موجودہ صورتِ حال کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا۔ اشد ضروری ہے کہ ماہرین

لسانیات کی مدد سے خطے کا از سر نو لسانیاتی جائزہ لیا جائے۔

بھارت میں مردم شماری کے انداز پر اس جائزے کے لیے دو ہزار والنٹیر وں کی ضرورت ہوگی۔ وہ کہاں ہیں! ۱۹۵۳ء تک ہمارے ملک میں صرف درس گاہوں کلکتہ یونیورسٹی اور دکن کالج پونا میں لسانیات کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ لسانیات میں تربیت یافتہ والنٹیر وں کی ضروری تعداد بہم پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پانچ ہفتے کا اسکول کیا جائے جس کی مدد سے پندرہ بیس سال میں لسانیات کے مبادیات جاننے والے کافی تعداد میں مل سکیں گے۔ موسم گرما کے یہ اسکول بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت کب لسانیاتی جائزے کا منصوبہ بناتی ہے۔ آج جو یہ بحث ہوتی ہے کہ پنجاب و ہریانہ یا میسور و مہاراشٹر کے سرحدی اضلاع کی زبان کیا ہے اگر ایک باقاعدہ سائنٹفک لسانیاتی جائزہ ہوا ہوتا تو ہر مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ ہر سوال کا صحیح صحیح غیر جانب دارانہ جواب پہلے سے ہی موجود ہوتا۔ مغرب کے ممالک میں بولیوں کے مفصل اٹلس بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کو بھی زبانوں اور بولیوں کا اٹلس تیار کرنا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے لسانیاتی جائزے کے وقت اردو والے لسانیاتی والنٹیر قابل قدر تعداد میں مل سکیں تاکہ اردو کے حقوق محفوظ رہ سکیں۔

اردو بولنے والی آبادی کے لحاظ سے ایسے لسانیات داں رضا کار نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مختلف یونیورسٹیوں میں ایم اے اردو کے نصاب میں لسانیات کا پرچہ بھی ہوتا ہے، لیکن یہ اکثر محض انگلی میں لہو لگا کر شہید ہونے کے مترادف ہے۔ اردو کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشت الفاظ جیسے موضوعات کو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب تک تجزیاتی لسانیات نہ پڑھی جائے زبان کی ساخت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ زبان کی بنیاد آوازیں ہیں۔ اس لیے صوتیات کے مطالعے کے بغیر لسانیات کا علم محض خام اور ناقص ہے۔ صوتیات ہی طلبہ کو سب سے زیادہ بوکھلا دینے والا مضمون ہے۔ الجبرے کی طرح عملی زندگی میں اس کی کوئی افادیت محسوس نہیں ہوتی لیکن ایسی بات نہیں۔ ذیل میں اردو کے مخصوص مسئلے سے قطع نظر عام طور پر لسانیات کے مطالعے کی اہمیت روشن کی جاتی ہے۔

قومیت نے بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ پچھلی دو صدیاں سامراجیت کے عروج کا زمانہ تھیں۔ حاکم قوم محکوم قوم کو ایک فروتر مخلوق سمجھتی تھی۔ اٹھارویں صدی میں جب تاریخی و تقابلی لسانیات کو فروغ ہوا تب معلوم ہوا کہ قوموں کی تقسیم محض جغرافیائی ہے نسلِ انسانی کی تقسیم نہیں۔ اسی صدی کے آخر میں جب سر ولیم جونس نے کالی داس کی شکنتلا کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ سنسکرت یونانی اور لاطینی ایک خاندان کی زبانیں ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ یورپ کے گورے اور ہندوستان کے کالے باشندے ایک ہی نسل کے ہیں۔ اس سے انگریزوں کے احساس برتری کو بڑا دھکا پہنچا لیکن اس سے وسعتِ نظر بھی پیدا ہوئی۔ قوموں کی طرح لسانیات بھی پوری بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں بانٹتی ہے لیکن لسانی گروہ بہت بڑے ہیں اور اکثر انھوں نے ملکی سرحدوں کو مسمار کر دیا مثلاً آئرلینڈ سے بنگال تک ایک نسل ہے۔ انڈونیشیا اور دور افتادہ مدغاسکر کی زبان مماثل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اہلِ مدغاسکر چل کر انڈونیشیا تک پہنچے۔

رسم الخط کے اشتراک کا پھیلاؤ زبان کے پھیلاؤ سے بھی زیادہ ہے۔ تبتی رسم خط ہندوستان سے ماخوذ ہے۔ چین اور جاپان کے لوگ بہ ظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی زبانوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود دونوں کا رسم خط ایک ہے۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک بار ایک پبلک سروس کمیشن کے صدر نے میرے ساتھ نجی بات چیت میں اردو رسم الخط پر اعتراض کیا کہ اور سب لکھاوٹیں بائیں طرف سے دائیں طرف کو لکھی جاتی ہیں لیکن اردو خط الٹی گنگا بہاتا ہے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ اردو اور انگریزی خط ایک ہی نسل سے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اردو رسم خط بھی سامی سے ماخوذ ہے اور یونانی رسم خط بھی۔ یونانی کے ابتدائی حروف تہجی ایلفا، بیٹا، گاما، ڈیلٹا، عبرانی ابجد کے الف، بیت، جمل اور دالتھ کی ترمیم شدہ شکلیں ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ بعض انگریزی حروف کی ترتیب آج بھی عرب ابجد سے مماثلت کا اعلان کر رہی ہے۔ ملاحظہ ہو!

K	L	M	N	
ک	ل	م	ن	کلمن یعنی
Q	R	S	T	
ق	ر	ش	ت	قرشت یعنی

مختلف ملکوں کی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے تاریخ کے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ آریہ نسل کے باشندوں کا اصل وطن کیا تھا یہ قدیم ترین ہند آریائی زبانوں کے بعض الفاظ سے معلوم ہو سکا ہے۔ قبل تاریخ دور میں آریہ کس طرح مختلف گروہوں میں مختلف مقامات پر آباد ہوئے۔ پھر وہاں سے ان کی کون کون سی شاخیں پھوٹیں۔ یہ سب آریائی زبانوں کے باہمی تعلق اور ان کے شجرے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ یونانی سے لاطینی کا نکلنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آریہ پہلے یونان میں بسے اور وہاں سے ان کی ایک ٹکڑی اٹلی میں گئی۔ انگریزی کا جرمن خاندان سے ہونا اور فرانسیسی سے نسبتاً دور ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انگریز قوم لاطینی گروہ سے پہلے جدا ہوئی اور جرمن سے اس کے بعد۔ یورپ کے خانہ بدوش قبائل کی ہندوستانی آمیز زبان اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں ہندوستان سے یورپ گئے۔ کشمیری زبان کی باقی ہند آریائی زبانوں سے علیحدگی صاف بتاتی ہے کہ کشمیر میں آریوں کا کوئی دوسرا گروہ آباد ہوا جو بقیہ ہندوپاک کے باشندوں سے الگ تھلگ اس برعظیم میں وارد ہوا۔

مغرب میں لسانیات کو ریاضی کے انداز پر ڈھالا جا رہا ہے۔ لسانی زمانیات Glotto Chromology لسانیات کا ایک نیا شعبہ ہے جس سے زبانوں کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ایک اندازہ ہے کہ ایک صدی میں زبان کے ذخیرے میں کتنے فی صدی الفاظ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ دو قرابت دار زبانوں میں الفاظ کے اختلاف کی مقدار دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ کب ایک دوسرے سے جدا ہوئیں۔ اس سے ایک لسانی برادری کے ذیلی گروہوں کے نقل مکانی کا زمانہ معلوم ہو سکتا ہے۔

زبان و ادب کا تعلق اتنا عیاں ہے کہ بیان کی ضرورت نہیں۔ زبان کا آغاز اور ارتقا

لسانیات کا موضوع ہے جس پر نظر رکھے بغیر ادب کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ محض ادیب اس میدان میں جس سراب میں کھو کر رہ جاتا ہے لسانیات اس سے نکال کر صراط مستقیم دکھاتی ہے۔

اردو ادب کے آغاز کے بارے میں ادیبوں نے نہ معلوم کیا کیا طوطا مینا اڑائے۔ جب ماہرین لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس موضوع کو لیا تب کوئی مدلل بات سامنے آئی۔ قدیم ادب کی فرہنگ کی تفہیم میں تو لسانیات سے مدد ملتی ہے بعض اوقات قدیم ادب کی رسم تحریر بھی ماہرین لسانیات کے طفیل ہی واضح ہوتی ہے۔

بعض اوقات ادبی مخطوطوں کا زمانہ متعین کرنے میں لسانیات سے مدد ملتی ہے۔ فارسی زبان کے عالم جانتے ہیں کہ نویں صدی کے آخر تک فارسی میں دال اور ذال دو الگ حروف نہ تھے بلکہ متبادل آوازیں تھیں جو حسب ضرورت بدلا کرتی تھیں۔ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں کیمیائے سعادت کا جو مخطوطہ ہے اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مصنف امام غزالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد (۱) نے اس کا معائنہ کیا تو اس میں دال ذال کا وہ فرق نہ پایا جو قدیم کتابت میں ہونا چاہیے۔ اس کی بنا پر انھوں نے طے کیا کہ یہ مخطوطہ غلط طور پر ان سے منسوب ہے۔ اسی طرح فارسی خط (۲) کی کچھ اور خصوصیات ہیں، مثلاً ساتویں صدی ہجری تک کاف بیانیہ "کہ" "کو" کی لکھا جاتا تھا۔ بارہویں صدی ہجری تک گ کو ک ہی لکھا جاتا تھا۔ اردو میں پہلے پہل "ٹ" "ڈ" "ڑ" کے بالائی ط کے لیے چار نقطوں کا استعمال ہوتا تھا جن مخطوطوں میں ان موقعوں پر "ط" لکھا ہوا ہو وہ زیادہ پرانے نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کسی مخطوطے میں ہائے مخلوط کا دو چشمی ھ سے لکھا ہونا اس کے نئے پن پر دلالت کرتا ہے۔ زبان اور کتابت کے ارتقا سے یہ واقفیت تحقیق میں بہت سی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ لسانیات کی ایک نئی شاخ ہے اسلوبیات۔ اس میں دریافت کیا جاتا ہے کہ کن آوازوں اور اجزائے الفاظ کی تکرار اور کمی بیشی سے اسلوب میں جان پڑتی ہے۔ یہ شعبہ اس کے ہیئتی تجزیے میں بعض اصولوں کی کارفرمائی دریافت کی جا سکتی ہے۔

الفاظ آوازوں کے مجموعے ہیں جنھیں رسم الخط کا لباس دے کر کاغذ پر ٹانک دیا جاتا

ہے۔ کسی زبان کی آوازوں یعنی مصوتوں اور مصمتوں کو دریافت کرنا صوتیات کا کام ہے۔ اس لیے صحیح رسم الخط صوتیات کی نگرانی ہی میں تیار ہو سکتا ہے۔ کسی زبان کے موجودہ رسم الخط میں جو خامیاں ہیں ان کی گرفت اور تدارک صوتیات ہی کر سکتی ہے۔ جو بزرگ جدید صوتیات سے بے بہرہ ہیں وہ جب اس موضوع پر کچھ لکھتے ہیں تو ہوا میں لاٹھی چلانے کی مثال ہو جاتا ہے۔ جو معالج جسم انسانی کی ساخت اور تشریح اعضا سے واقف نہ ہو وہ کیا تشخیص مرض کرے گا اور کیا علاج تجویز کرے گا۔

صوتیات کا ایک اور مفید کام یہ ہے کہ جن زبانوں کے پاس رسم الخط نہیں ہے۔ ان کی آوازوں کا تجزیہ کرے اور اسے ایک رسم الخط دے۔ اگر اسے کسی دوسری زبان کا خط دیا جائے تو اس میں حسب ضرورت ترمیم و اضافہ کرے۔ قبائلی زبانوں میں تحریر کا رواج نہیں ہوتا۔ ماہرین صوتیات ان زبانوں کو سیکھ کر اور آوازوں کی صحیح صحیح تفریق کر کے ان کے لیے رسم تحریر پر فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح ان زبانوں کا عوامی ادب قلم بند کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ کشمیری جیسی ترقی یافتہ اور ہم سے اتنے پاس کی زبان کے معاملے میں یہ کوئی بڑا کارنامہ معلوم نہ ہو لیکن جب دور دراز افریقہ کے قبائل کی اجنبی زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کی آوازوں کا تعین ہی بڑا مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ ماہرین لسانیات اس سے دوچار ہیں۔

جو زبانیں ابھی تک تقریری منزل میں ہیں صوتیات انھیں تو رسم الخط میں ڈھالتی ہی ہے ان کے علاوہ اگر کبھی کبھار ترقی یافتہ زبانوں کے اقتباسات یا الفاظ کو دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھنا پڑتا ہے تو صوتیات ہی اس کی مخصوص آوازوں کی ادائیگی کی ضمانت کرتی ہے۔ پنجابی کا مخصوص رسم الخط گورمکھی ہے جو اس کی آوازوں کا احاطہ کرتا ہے لیکن پنجابی اگر اردو یا ہندی خط میں لکھنا ہو تو اول الذکر کی چند مخصوص آوازوں کے لیے صوتیات کی مدد سے نشانیات وضع کر نے ہوں گے۔ اس قسم کا عمل ہر زمانے میں ہوا ہے۔ فارسی نے جب عربی رسم الخط اختیار کیا تو اپنی مخصوص آوازوں پ۔ چ۔ گ۔ ژ کے لیے مماثل عربی حروف میں نقطوں یا مرکز کے اضافہ سے کام چلایا۔ اردو نے فارسی رسم الخط لیا تو ٹ۔ ڈ۔ ڑ اور ہائے مخلوط والی آوازوں کے لیے

نشانات وضع کیے۔ یہ اختراع خواہ کسی نے کی ہو لیکن یہ صوتیات کا عمل تھا اور ان کا مخترع اس حد تک ماہر صوتیات تھا۔ آج بھی یہ عمل جاری ہے۔ ہندی میں انگریزی کے اس مصوتے کے لیے جو آ اور او کے درمیان ہے ایک مخصوص ماترا ایجاد کی گئی ہے اور وہ آ کی ماترا کے اوپر ایک الٹے قوس کا اضافہ ہے۔ اس نازک مصوتے کی گرفت اور ترجمانی ماہرین صوتیات ہی نے کی ہے۔

موجودہ رسم الخط اپنی زبان کی آوازوں کو بھی سو فی صدی ادا نہیں کر پاتے چہ جائیکہ دوسری زبانوں کی آوازوں کو۔ صحت کے اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھ کر بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط ایجاد کیا گیا جس میں حسب ضرورت ترمیم واضافہ سے ہر زبان صحیح صحیح تلفظ کے مطابق ضبط تحریر میں لائی جا سکتی ہے۔

عروض اور صوتیات کا تعلق ظاہر ہے۔ شعر کا وزن کیا ہے لفریزے کے طول یا بل کی گونا گوں کی ترتیبیں۔ انگریزی عروض بل پر مبنی ہے۔ اردو اور ہندی عروض صوت یا لفریزے کے طول پر لیکن لسانی حس یہ بتاتی ہے کہ اردو عروض بھی گاہے گاہے لفظ کے بل سے متاثر ہوتا ہے۔ میں نے اس مجموعے کے ایک مضمون "اردو عروض اور لفظ کا بل" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اردو عروض کی اصلاح اور تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ہندی اور انگریزی عروض سے بھی فائدہ اٹھانا ہوگا اور مروجہ عروض کو صوتیات کی اصطلاحوں میں ڈھال کر زیادہ سہل اور زیادہ سائنٹفک بنانا ہوگا۔ عروض صوتیات کے سوا کیا ہے۔ اس کی تراش وخراش صوتیات کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک سیاح یا مبلغ افریقہ، آسٹریلیا یا جنوبی امریکہ کے ایسے قبائلیوں کے بیچ پہنچتا ہے جہاں اب تک کوئی باہر کا آدمی نہیں گیا، وہ ان قبائلیوں کی زبان نہیں جانتا اور یہ قبائلی اس کی زبان نہیں جانتے، یہ لسانیات ہی کا کرشمہ ہے کہ ان انجان قبائلیوں کی زبان کو سمجھا اور سیکھا جا سکتا ہے اور سیکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مسیحی مشنریوں کی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ قبائلیوں کی تہذیب کو باقی دنیا سے متعارف کرانا انھیں ماہرین لسانیات کا کام ہے جن کے لیے زبان سیکھنا ثانوی مقصد تھا۔ امریکہ میں تجزیاتی لسانیات کے فروغ کی یہی وجہ ہے کہ اس کے

ذریعے ان قبائل تک رسائی ہو سکتی ہے جو دوسروں کے لیے ایک بند کتاب ہیں۔ اصل مقصد ان کو عیسائی بنانا یا سیاسی طور پر اپنا ہم خیال اور پیرو بنانا ہے۔ یہ مبلغ قبائلیوں کی زبانوں کو اس حد تک سیکھ لیتے ہیں کہ اہلِ زبان کی طرح بول سکتے ہیں۔

امریکہ کی فوج کے تینوں بازو، بحری، بری اور ہوائی صوتیات کا شعبہ بھی رکھتے ہیں۔ ان شعبوں میں صوتیات کی مسلسل تحقیق ہوتی رہتی ہے۔ مغربی ممالک نے جس طرح سائنس دانوں کو ایٹم بم، کیمیائی اور جراثیمی آلاتِ حرب کی تحقیق کے لیے حلقہ بگوش کر لیا اسی طرح لسانیات کو بھی فوجی ضروریات میں ملوث کر لیا۔ فوج میں شعبہ لسانیات کے قیام کی واحد وجہ جاسوسی کے فن کی تکمیل ہے۔ دنیا کا ہر ملک اپنے سفیروں اور فوجیوں کو پیغام بھیجنے کے لیے ایک کوڈ استعمال کرتا ہے جو تھوڑے عرصے کے بعد بدلتا رہتا ہے۔ فوج کے شعبہ صوتیات کے دو کام ہیں:

۱۔ روز روز اپنی حکومت کے لیے ایسا کوڈ تیار کرنا جو دوسروں کے لیے لاینحل ہو۔

۲۔ دوسری حکومتوں کے کوڈ کو فاش کر کے ان کے خفیہ پیغام جان لینا۔

امریکہ میں مجلس اقوام کا بھی دفتر ہے جہاں ہر حکومت کے نمائندے رہتے ہیں اور اپنی حکومتوں سے مراسلت کرتے ہیں۔ گویا جاسوسی کے مواقع سرزمین امریکہ پر کچھ بہتر میسر ہیں۔ امریکی حکومت ان نمائندوں کے خفیہ پیغام جاننے کے لیے ان کی کوڈ توڑ لیتی ہے۔ اس معاملے میں دوست دشمن کی کوئی تمیز نہیں، ہر ملک کا کوڈ دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوڈ کو فاش کرنے کے طریقے بالکل وہی ہیں جن سے ماضی کی مردہ زبانوں کے مجہول رسم الخط پڑھے گئے۔

امریکہ میں لسانیات کو بالکل سائنس اور ریاضی بنایا جا رہا ہے۔ لسانیات کی ایک قسم ہے کمپیوٹری لسانیات (Computer Linguistics) اس کی مدد سے جملہ اور زبانوں کے ترجمہ کرنے کی مشین بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مماثل زبانوں مثلاً مغربی یورپ کی زبانوں میں ایک دوسرے سے مشینی ترجمہ ممکنات میں سے ہے اور لسانیات یہ کر کے دکھائے گی۔ اس

کے علاوہ مشینوں کے ذریعے سے دنیا کی تمام زبانوں کے بیچ ایک قدر مشترک کی کھوج جاری ہے۔اس کی تشکیل ہو جائے تو کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ مشکل نہ رہے گا۔

اسکولوں میں زبانوں کی جو قواعد پڑھائی جاتی ہے اس میں مختلف اصولوں کے تحت مستثنیات کی فہرست بھی ہوتی ہے۔جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ یہ اصول جامع نہیں۔زبانوں کا مروجہ صرف ونحو بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔لسانیات کا دعویٰ ہے کہ اس کے اصولوں کے تحت کسی زبان کا صرف ونحو لکھا جائے تو وہ جامع بھی ہوگا اور سہل بھی۔میں نے اس قسم کی کوئی قواعد نہیں دیکھی۔ترقی یافتہ زبانوں کی ایسی قواعد نہیں لکھی گئی لیکن قبائلی زبانوں میں سے بعض کی لکھی گئی ہے۔

سنسکرت میں اسم کی آٹھ حالتیں (Cases) ہوتی ہیں جن کی تقلید میں ہندی کے قواعد نویس بھی آٹھ حالتیں لکھتے ہیں۔لسانیات نے انھیں مختصر کر کے محض تین حالتوں سے کام چلا لیا ہے (Direct, Obligue, Vocative) چند سطروں کے ایک چارٹ میں زبان کے ہر قسم کے اسما (مذکر،مونث،واحد،جمع) کی حالتوں کا احاطہ کر لیا جاتا ہے۔اردو کے افعال کے مختلف زمانوں اوران کے گردان کے قواعد بھی بڑے پیچیدہ ہیں۔لیکن ماہرین لسانیات نے ان سب کو ایک چارٹ میں محصور کر دیا اور اس میں تمام فعلی تبدیلیاں واضح کر دیں۔

معنی کی حامل سب سے چھوٹی اکائی مارفیم کی دریافت سے لفظوں کی ساخت اور تبدیلی کا بیان بڑا آسان اور سائنٹفک ہو گیا ہے۔ ہماری قواعد میں مصدر کو بنیادی مادہ مان کر اس میں تبدیلیوں کا ذکر کیا جاتا تھا۔لسانیات نے مصدر میں سے علامتِ مصدر 'نا' حذف کر کے مادہ کا تعین کیا اور اس میں مختلف اضافوں کو صوتیات کی اصطلاحوں میں ادا کیا۔

دراصل ہمارے مروجہ اسکولی قواعد اہل زبان ہی کے پڑھنے کے لیے ہے۔ دوسری زبان والوں کو اس قواعد کے ذریعے زبان سکھانا بڑا بار دہ ہے۔ جو حضرات امریکیوں اور روسیوں وغیرہ کو اردو پڑھاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صوتیات اور لسانیات کے صرف ونحو کے بغیر قدم آگے بڑھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ان طلبہ کو اس کی تاب نہیں کہ وہ دو سال تک قواعد پڑھی

جائے اور تب زبان سیکھی جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تین مہینے میں ہی وہ کچھ شد بد بول سکیں۔ مغربی ممالک میں ماہرینِ لسانیات نے ایسے طریقے نکالے ہیں جن سے کسی زبان کو تھوڑے عرصے میں سیکھا جا سکتا ہے۔ آج کے مصروف آدمی کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ کئی برس زبان سیکھنے ہی کی نذر کر دیے جائیں۔

مولیر کا ایک کردار چالیس سال تک نثر میں باتیں کرتا رہا۔ جب اسے نثر کی تعریف بتائی گئی تو حیران ہوا کہ جس چیز کو چالیس سال سے استعمال کر رہا ہے اس سے واقفیت بھی نہ تھی۔ ہم سب بھی زبان کو ایک عمر سے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم تو مولیر کے کردار کے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم زبان کے بارے میں نہ صرف جانیں بلکہ اس کے دروں کے عارف بھی ہو جائیں۔ زبان کے اس عرفان کے عمل کو لسانیات کہتے ہیں اور اس کے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی

۱،۲۔ تحقیقِ و تصحیحِ متن کے مسائل از ڈاکٹر نذیر احمد مشمولہ نقوش بابت مارچ ۱۹۶۳ء

☆

آغازِ زبان کے نظریے

یونانی مفکرین نے جس طرح دوسرے علوم کے آغاز پر غور وخوض کیا اسی طرح زبان کے آغاز کے مسئلے پر بھی نظریاتی انداز سے سوچا۔ انھوں نے کئی نظریے پیش کیے جو لسانیات کے مطالعے کی تاریخ کا جزو بن چکے ہیں۔ ۱۶۶۸ء میں ہابس (Hobbes) نے اپنی کتاب (Elimento Philosophae) کے دوسرے سیکشن کے دسویں باب میں زبان کے آغاز کی بحث بھی کی ہے۔ اٹھارویں صدی میں جب جدید لسانیات کا مطالعہ شروع ہوا تو فلسفیوں، حکیموں اور ماہرین لسانیات نے پھر اس مسئلے پر غور کیا اور طرح طرح کے نظریے پیش کرنا شروع کیے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں جب تقابلی طریقہ اور داخلی بازتشکیل کے قاعدے معلوم ہوئے تو بعض خوش فہم خیال پرستوں نے سوچا کہ ہم انھیں قاعدوں کا اطلاق کر کے اس قدر پیچھے تک جا سکیں گے کہ تمام زبانوں کی اصل قدیمی زبان (Proto-Language) تک پہنچ سکیں گے اور زبان کے ادارے کے آغاز کو گرفت میں لے آئیں گے۔

یہ خیال خام تھا۔ صرف غیر تربیت یافتہ لسانیات داں ہی یہ سودا رکھ سکتے ہیں کہ موجودہ زبانوں میں اصل قدیمی زبان کے کچھ الفاظ تلاش کر لیں۔ ہمارے پاس زبانوں کا مواد پانچ چھ ہزار سال پہلے تک ملتا ہے اور بس، لیکن زبان کا استعمال لاکھوں، غالباً پندرہ بیس لاکھ، سال سے ہو رہا ہے۔ موجودہ مواد اور لسانیاتی طریقوں سے ابتدا تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اس گئے گزرے زمانے کے بارے میں کوئی سائنسی تجربہ گاہ کی سی تحقیق، جو علت ومعلول کے اصولوں پر پوری اترے، ممکن نہیں، قیاس اور تخیل کو بروئے کار لانا ہی پڑے گا اس وجہ سے جب پیرس

میں ۱۸۶۶ء میں لسانیاتی سوسائٹی قائم کی گئی تو اس کے دستور کی دفعہ ۲ میں لکھ (۱) دیا گیا:

"سوسائٹی زبان کے آغاز یا ایک عالم گیر زبان کی تخلیق کے بارے میں کوئی مراسلہ منظور نہیں کرے گی۔"

اس فرمان کے علی الرغم دونوں ممنوع موضوعات ماہرین لسانیات کے منظور نظر رہے ہیں۔ اسپرنٹو اور اڈو (Ido) اور دوسری کئی عالم گیر زبانوں کی تخلیق ۱۸۶۶ء کے بعد ہی ہوئی ہے اور زبان کے آغاز کے نظریے انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل ہی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نصف دوم میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔ کیا ہم ذیل کے بنیادی مفروضوں سے انکار کی مجال کر سکتے ہیں:

۱۔ سائنس حیوان سے انسان کا ارتقا مانتی ہے۔ لسانیات جدید علم ہے۔ یہ کوئی دینیات کی شاخ نہیں، اس لیے ہمیں ڈارون کے نظریہ آغاز انواع (Theory of the origin of species) کو تسلیم کرنا ہوگا۔

۲۔ اگر ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان کا ارتقا حیوان سے ہوا تو یہ ضروری ہے کہ بالکل ابتدا میں وہ حیوانوں کی طرح غوں غاں کرتا ہوگا اور اسی سے رفتہ رفتہ تعلق انسانی نے ارتقا پایا ہوگا۔

حیوانی غرا ہٹیں اور دوسری آوازیں انسانی زبان میں کیوں کر تبدیل ہوئیں اس کے بارے میں متعدد نظریے ہیں۔ کیا ان سے چشم پوشی کر لی جائے یا کسی علم کے تحت ان کا مطالعہ کیا جائے۔ ماضی کے افکار سے، وہ آج ہمیں کتنے ہی فرسودہ کیوں نہ معلوم ہوں، واقفیت ضروری ہے کیونکہ ہم ماضی سے رشتہ قطع نہیں کر سکتے۔ آغاز زبان کا موضوع بشریات (Anthropology) کے تحت پڑھا جا سکتا ہے یا لسانیات کے تحت۔ چونکہ اس کا تعلق زیادہ تر زبان سے ہے اس لیے ہم اس شعبے کو بشریاتی لسانیات (Anthropological Linguistics) کہہ سکتے ہیں۔ عام لسانیات کے ذیل میں لسانیات کے تمام شعبوں کا تعارف آ جاتا ہے۔ زبان کی مطلق حیثیت کے بارے میں فکر سے زیادہ عمومی موضوع کون سا ہوگا اس لیے اس کا ذکر چھیڑنے میں کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ہمارے

ہم عصر کئی معتقد علمائے لسانیات مثلاً یسپرسن (۱) اسٹرتے وانت اور ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے زبان کے آغاز کے نظریے پیش کیے ہیں، اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ موضوع سائنسی نہیں فکری ہے۔ علمائے رفتہ کے نظریات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

لسانیات اس سوال کا جواب دینے میں معذور ہے کہ آیا دنیا کی تمام زبانوں کا منبع ایک ہے یا آزادانہ طور پر مختلف مقامات پر ایک سے زیادہ زبانوں کا آغاز ہوا۔ پہلی کو وحید خلقی (Monogenetic theory) اور دوسری کو کثر خلقی نظریہ (Polygenetic theory) کہتے ہیں۔ یہ سوال دراصل نسل انسانی کے آغاز کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا حیوان سے انسان کا ارتقا محض ایک جگہ ہوا یا کئی جگہ؟ وحید خلقی نظریہ سب سے پہلے لیپ نٹز (Leibntiz) نے پیش کیا جو برلن اکیڈمی کی ۱۷۱۰ء کی روئیداد میں شائع ہوا۔ کثر خلقی نظریے کے حامی کہتے ہیں کہ دنیا میں زبانوں کے متعدد خاندان ہیں جن میں سے بعض میں اتنا اختلاف ہے کہ ان کے درمیان کوئی نسلی رشتہ ممکن نہیں دکھائی دیتا۔ وحید خلقی نظریے والے یہ جواب دیتے ہیں کہ اب بھی ایک خاندان کی بعض زبانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور روسی یا اردو اور انگریزی کو دیکھ کر یہ کون سوچ سکتا ہے کہ یہ ایک مورث اعلیٰ کی اولاد ہیں۔ اس طرح لاکھوں سال میں ایک قدیمی زبان کے اخلاف اتنے مختلف ہو گئے ہیں کہ کوتاہی نظر کی وجہ سے ہم انھیں مختلف خاندان قرار دیتے ہیں۔

ذیل میں مختلف نظریوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ الہامی نظریہ: زبان کے آغاز کے بارے میں قدیم ترین نظریہ مذاہب کا ہے جن میں زبان کی اصل الوہی یا الہامی قرار دی گئی ہے۔ بعض مذاہب نے اپنی زبان کو قدیم ترین زبان قرار دیا ہے۔ انجیل کے مطابق ابتداء انسانوں میں محض ایک زبان عبرانی رائج تھی۔ اہل بابل نے ایک مینار بنایا تا کہ آسمان پر چڑھ کر خدا سے معرکہ کر سکیں۔ خدا نے اس امت کو سزا دینے کے لیے یہ عتاب نازل کیا کہ مینار میں چڑھتے ہوئے ہر شخص کی زبان مختلف کر دی۔ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔ انگریزی محاورہ

(Babel of tongues) اسی مینار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ روایت کے مطابق ان لوگوں کی مختلف زبانوں سے دنیا کی مختلف زبانیں پیدا ہوئیں۔ اسلامی عقیدے کے مطابق خدا نے حضرت آدمؑ کو اشیاء کے نام سکھائے۔ قرآن کلام اللہ ہے جس کے نتیجے میں عربی آسمانی زبان قرار پاتی ہے۔

ہندوؤں میں سنسکرت کو دیو بانی یا دیو بھاشا کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے مطابق سنسکرت زبان اور سنسکرت قواعد کے وہ بنیادی اصول جو پانینی کے چودہ سوتروں میں منظوم ہیں، شیو جی کی ڈگڈگی سے نکلے۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری (۲) کے مطابق بودھوں کا عقیدہ ہے کہ پالی دنیا کی قدیم زبان ہے جو ازل سے چل رہی ہے۔ تواری (۳) نے جینیوں کے یہ مبینہ عقیدہ بھی پیش کیا ہے کہ اردو ماگدھی پراکرت نہ صرف انسانوں کی ابتدائی اصلی زبان ہے بلکہ دوسرے حیوانات کی بھی ہے۔ چنانچہ مہاویر سوامی جب اردھا گدھی میں وعظ کرتے تھے تو دیوتا، انسان و چوش وطیور سب اس وعظ کو سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر تواری کو زبان کے بارے میں جین دھرم کا نظریہ سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جینیوں میں مہاویر سوامی چوبیسویں تیرتھنکر ہوئے ہیں۔ ان سے پہلے کے ۲۳ تیرتھنکر ملک کے مختلف مقامات کے تھے اور ان کی زبان مختلف رہی ہوگی۔ ان کی زبان کے بارے میں صراحت نہیں لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اردھ ماگدھی قدیم ترین زبان ہے۔ دراصل جینیوں میں کوئی زبان دوسروں کی نسبت مقدس نہیں۔ جس مذہب کی کوئی ایک مقدس کتاب ہی نہ ہو وہاں ایک زبان کو کیوں کر فضیلت دی جا سکتی ہے۔

۱۷۷۲ء میں برلن اکیڈمی (۴) نے زبان کے آغاز پر مقالہ نگاری کا ایک انعامی مقابلہ کیا جس میں ہرڈر (Herder) کا مقالہ بہترین قرار دیا گیا۔ اس نے الوہی نظریہ پر دو قیع اعتراضات کیے:

۱۔ اگر زبان خدا کی تخلیق ہوتی تو وہ بہت باقاعدہ ہوتی لیکن تمام زبانوں میں عجب بے اصولی اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔

۲۔ زبان میں بنیادی الفاظ فعل کے مادے ہیں جن سے متعدد اسما کا اشتقاق ہوتا ہے۔ اگر

خدا تخلیق کرتا تو ماجرا برعکس ہوتا۔ وہ انسان کو سب سے پہلے چیزوں کے نام سکھاتا۔ فعل بعد میں آتے۔ ۱۸۵۱ء میں گرم نے بھی اپنے "مقالہ آغاز زبان" میں زبان کی بے ترتیبی کو الوہی آغاز کے منافی قرار دیا۔ ان دونوں حضرات نے اپنے طور پر زبان کے آغاز کے بارے میں لکھنا چاہا لیکن وہ کوئی واضح اور معقول نظریہ نہ پیش کر سکے۔

۲۔ قدیم ترین زبانوں کا نظریہ: اسے الوہی نظریے ہی کا دوسرا رخ سمجھیے۔ فرق یہ ہے کہ وہاں زبان کی تخلیق میں خدا کا دخل تھا یہاں بعض افراد نے کسی تقدس کی آمیزش کے بغیر کسی زبان کو (جو اکثر انھیں کی ہوتی تھی) ازلی یا قدیم ترین قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک زبان بقیہ سب سے پہلے وجود میں آئی تو وہ باقی زبانوں کا سرچشمہ ہو سکتی ہے۔

کئی بادشاہوں کو انسان کی سب سے پہلی یا فطری زبان جاننے کی کد ہوئی۔ انھوں نے نوزائیدہ بچوں کو جنگل میں اس طرح پرورش کرایا کہ ان کے کانوں میں کسی زبان کا کوئی لفظ نہ پڑ سکے۔ اس قسم کے چار تجربے کیے گئے۔

(الف) قدیم مصری بادشاہ سام (Psammetichus) نے دو بچوں کو جنگل میں پرورش کرایا۔ کچھ سال بعد دربار میں لائے گئے تو ان میں سے ایک نے لفظ بیکوس (Bekos) کہا جو فریجین (Phrygian) زبان میں روٹی کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ فریجین ازلی زبان ہے۔ حالانکہ ہوا یہ تھا کہ روٹی دینے والا خادم فریجین تھا۔ کسی دن اس کے منہ سے یہ لفظ نکل گیا تھا۔ ممکن ہے اکثر نکل جاتا ہو۔ اس سے لڑکوں نے اسے دل میں ڈال لیا۔ فریجین غالباً کوئی آرمنی زبان تھی۔ جس پر یونانی اثرات تھے۔ اس کے آٹھویں صدی قبل مسیح کے کتبے ملتے ہیں۔

ب۔ شہنشاہ فریڈک دوم (۱۱۹۴ تا ۱۲۵۰ء) نے بھی ایسا تجربہ کیا لیکن بچے گویائی سیکھنے سے پہلے ہی مر گئے۔

ج۔ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمس چہارم (۱۴۸۸ تا ۱۵۱۳ء) نے بھی دو بچوں کو تنہائی میں نظر بند رکھا اور آخر میں ظل سبحانی نے فیصلہ کیا کہ وہ بہت اچھی عبرانی بولتے تھے۔

د۔ اکبر بادشاہ (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) نے بھی جنگل میں کچھ بچوں کی پرورش کرائی اور جیسا کہ ہونا چاہیے وہ بچے گونگے ثابت ہوئے۔

ان بادشاہوں کے علاوہ بعض افراد نے بھی اپنی زبان کو ازلی قرار دیا۔ ڈچ عالم بی کانس Becanus (۱۵۱۸ء تا ۱۵۷۲ء) ڈچ زبان کو قدیم ترین مانتا تھا۔ اس نے اس زبان کو Cymbrain نام دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دو علما (Johannes) (متوفی ۱۵۴۴ء) اور (Magnus متوفی ۱۵۶۸ء) گوتھک یعنی قدیم جرمن کو پہلی زبان مانتے تھے۔ سویڈن کا عالم Kemke (متوفی ۱۶۸۹ء) سنجیدگی سے دعویٰ کرتا تھا کہ باغ عدن میں خدا سویڈش زبان میں، آدم ڈینش زبان میں اور سانپ کی شکل میں شیطان فرنچ میں بات کرتا تھا۔ یعنی کیم کے مطابق اس کی زبان خدا کی، پڑوسی ملک ڈنمارک کی زبان آدم کی اور معتوب فرانسیسی شیطان کی زبان تھی۔

یہ سب نظریے وہ ہیں جنھیں مذاہب اور ان کے صحیفوں کی پشت پناہی نہیں ورنہ ان کی دلیل بھی کسی حد تک الوہی نظریے جیسی ہے۔

۳۔ فطری نظریہ: یہ نظریہ فیثا غورث (چھٹی صدی ق م) Hdrakritos (۵۷۶ ق م تا ۴۸۰ ق م) اور افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷ ق م) کا ہے۔ افلاطون نے اپنے مجموعہ مکالمات (Cratylus) میں لفظوں کے آغاز پر بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ لفظ اور اس کے نام میں کوئی فطری اور لازمی تعلق ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں مماثلیے (Analogists) بھی اس نظریے کو مانتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ زبان فطری اور باقاعدہ ہے اور لفظ کے صحیح معنی اس کی ہیت سے ہویدا ہو جاتے ہیں۔

یہ کہنا کہ اشیا اور ان کے ناموں میں کوئی پراسرار فطری تعلق ہوتا ہے ایسی بے تکی بات ہے جس کی تردید کی ضرورت نہیں۔ اس نظریے کے حامیوں کے سامنے محض یونانی زبان تھی۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ ہر چیز کے مختلف زبانوں میں مختلف نام ہوتے ہیں۔

۴۔ معاہدے کا نظریہ: یہ نظریہ زبان کو انسانوں کے باہمی معاہدے کا نتیجہ قرار دیتا ہے یعنی

انسانوں نے مختلف اشیا کے بارے میں اتفاق سے طے کیا کہ اس کا نام یہ رکھیں گے اور اس کا نام وہ۔ پانچویں صدی ق م میں ڈیموکرٹس (Demokrites) اور چوتھی صدی ق م میں ارسطو نے زبان کو باہمی قوم وقرار سے مستخرج کیا۔ اسی کو روسو نے ۱۷۵۴ء میں اور واضح کیا۔ اس نے ریاست کی طرح زبان کو بھی سماجی معاہدے کا نتیجہ قرار دیا۔ اس نظریے پر حسب ذیل اعتراض ہے:

ہم زبان کے آغاز کا نظریہ دریافت کر رہے ہیں زبان کی نشوونما کا نہیں۔ چیزوں کے نام رکھنے کا معاہدہ اسی وقت ہوگا جب تبادلۂ خیالات کے لیے زبان موجود ہو۔ اس طرح یہ نظریہ زبان کی بالیدگی کی تاویل کرسکتا ہے ابتدا کی نہیں۔

۵۔ حیوانی آوازوں کی نقل کا نظریہ (Bow-vow theory): اس نظریے کے مطابق انسان نے جانوروں کی بولیوں کی نقل میں زبان کے اولیں الفاظ اختراع کیے مثلاً میاؤں، بھوں بھوں، میں میں (میں کے گلے پر چھری)، ہنہنانا، ریگنا، غرانا انگریزی میں (Gmut, cock, cuckoo, purr, ba, mew) وغیرہ۔ میکس ملر نے طنزاً اس نظریے کو Bow-vow یعنی کتے کے بھونکنے کا نظریہ کہہ کر پکارا۔ اس کا اعتراض ہے کہ اس قسم کے الفاظ مصنوعی پھولوں کی طرح جامد ہیں جن سے دوسرے الفاظ مشتق نہیں ہوسکتے۔

یہ اعتراض سوفی صدی صحیح نہیں کیوں کہ اردو میں بھوں بھوں سے بھونکنا، میں میں نے ممیانا (ہیبت یا احساس کمتری میں بولنے کا لہجہ)، غرانا سے غراہٹ اور انگریزی میں ککو سے Cuckold اور کاک سے coquet جیسے باقاعدہ الفاظ بنے۔ رینان کے مطابق یہ تاریخی ترتیب کہ پہلے حیوانات بولے اور پھر اشرف المخلوقات نے ان کی نقل میں زبان ایجاد کی، بالکل لغو ہے۔

اس نظریے میں اس حد تک صداقت ہے کہ اس سے ہر زبان کے دس بیس الفاظ کی اصل معلوم ہوجاتی ہے۔ اور بس! یہ زبان کے بنیادی الفاظ بھی نہیں۔ بقیہ الفاظ کے بارے میں اس نظریے سے کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔

۶۔ اشیا کی جھنکار اور بصری پیکروں کی نقل کا نظریہ: اس نظریے کو بعض حضرات نے غلطی سے ڈنگ ڈانگ (Ding-Dong) نظریے کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن جیسا کہ آگے دکھایا جائے گا (۵) وہ ایک دوسرا نظریہ ہے۔ زیر بحث نظریے کا صحیح نام صوت نما نظریہ (Onomatopoeic) ہونا چاہیے۔ اس نظریے کے مطابق انسان نے مظاہر قدرت اور انسانی مصنوعات میں متعدد قسم کی گونج اور جھنکار سنی اور ان کو الفاظ میں اسیر کر لینا چاہا۔ اس طرح اولین الفاظ وجود میں آئے۔ ان ہی سے دوسرے الفاظ بنتے گئے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی مثالیں گڑ بڑ، گڑگڑاہٹ، گرج، چیر پھاڑ، ٹن ٹن، بھڑ بھڑ، کھٹ پٹ، چپا وغیرہ ہیں۔ انگریزی میں ایسے الفاظ بہت سے ہیں مثلاً:

Sizzle, thunder, clatter, thud, flutter, bang, bump, drizzle, honk, ding-dong.

ان کے بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے جو الفاظ آج صوت نما ہیں وہ اصلاً ایسے نہ ہوں مثلاً انگریزی لفظ Thunder لاطینی لفظ Tonet سے مشتق ہے اور Tonet کا مادہ Tena ہے جس میں بادل کے گرجنے کی کیفیت مفقود ہے۔

اس نظریے کے دوسری شاخ کے طور پر ہم ایسے الفاظ کو لکھتے ہیں جن میں کچھ اس قسم کا بصری پیکر ہوتا ہے جو معنی کی ایک جھلک پیش کر دیتا ہے مثلاً اردو میں جگ مگ، جھلمل، چکا چوند، زرق برق، گڑ بڑ جھالا، ڈگمگانا اور بڑ کھابڑ، انگریزی میں:

Flash, glow, glimmer, zigzag, dazzle, hotch-potch, topsy-twrvy, glare, flare, hocus-pocus.

دراصل پانچویں اور چھٹے نظریے ایک ہی ہیں۔ ایک میں حیوانات کی آواز کی نقل ہے دوسرے میں بے جان چیزوں کی آواز یا ہیت کی نقل۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری نے ان تینوں کو ایک ہی نظریہ مان کر اس کے تین پہلو قرار دیے ہیں۔

زیر نظر نظریے پر بھی حسب سابق تین اعتراض کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ اس قسم کے الفاظ زبان کے کل ذخیرے کا بہت قلیل حصہ ہیں۔

۲۔ یہ زبان کے آغاز کے دور کے نہیں کیونکہ یہ تو اتنے قدیم بھی نہیں کہ اپنی زبان کی مورث اعلیٰ یا مورث میں بھی ملتے ہوں۔ ہند یورپی خاندان کی مختلف زبانوں میں جب ان کے ہم معنی الفاظ کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ صوتی مطابقت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قدیمی اصلی ہند یورپی زبان کے الفاظ نہیں بلکہ بہت بعد میں صوتی مطابقت کی بنا پر اپنی اپنی زبان میں گڑھ لیے گئے ہیں۔ ہماری کھوج مطلق زبان یعنی نطق انسانی کے آغاز کی ہے۔

۳۔ یہ الفاظ زبان کے بنیادی مادے نہیں۔ ان سے بہت کم الفاظ مشتق ہو سکتے ہیں۔ مادوں کا نظریہ (Ding Dong or root theory) اس کے موجد پروفیسر ہیس (Heyse) ہیں۔ ان کے شاگرد ڈاکٹر اسٹائن تھال نے اسے تحریری شکل میں شائع کیا لیکن اس کی اہمیت میکس ملر کی وجہ سے ہے جس نے اپنے خطبات میں اس کی شرح کی۔ اس نظریے کے مطابق معنی اور صوت میں کوئی پر اسرار ہم آہنگی ہوتی ہے۔ فطرت کا یہ قانون ہے کہ جس شے پر ضرب لگائی جائے اس سے ایک مخصوص جھنکار پیدا ہوتی ہے، بنی نوع انسان کی طفولیت میں بشر میں ایک جبلی صلاحیت تھی کہ ہر خارجی شدید آواز انسان میں ایک صوتی ردعمل پیدا کرتی تھی۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ آدمی جوں ہی کسی شے کی جھنکار سنتا تھا اس کی صدائے بازگشت کے طور پر خود اس کے منہ سے ویسی ہی کوئی آواز نکل جاتی تھی۔ مثلاً دھات پر چوٹ پڑنے کے ساتھ اس کے منہ سے ٹن اور لکڑی پر ضرب پڑنے سے کھٹ نکلا ہوگا۔ یہ آوازیں ہی وہ مادے ہیں جن سے زبان کا استخراج ہوا۔ اس طرح کہ آوازیں ابتداءً بہت زیادہ تھیں لیکن اس نے ان میں سے تقریباً (۶) چار سو کی بنیادوں پر زبان کی تعمیر کی۔ زبان کی نشوونما کے بعد مادوں کی تخلیق کی ضرورت نہیں رہی اس لیے انسان میں سے یہ صلاحیت جاتی رہی۔

پانینی نے سنسکرت جیسی بے پایاں زبان کو ۱۷۰۶ مادوں پر مبنی قرار دیا تھا۔ انیسویں صدی

میں (۷) Edgean نے انھیں گھٹا کر ۵۸ تک پہنچا دیا۔ انگریزی کا آریائی الفاظ کا ذخیرہ صرف ۳۶۰ مادوں سے نکلا ہے مثلاً ایک مادے br یا bar سے Burden, bear, biet, bariey, birth, fertile, reference, conference, transfer وغیرہ متعدد الفاظ مشتق ہوئے۔ یہ مادہ فارسی میں بار اور سنسکرت میں بھار ہے۔ اس قسم کے جتنے مادے ہیں وہ افعال کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً بار: لے جانا، مار: رگڑنا، سٹا (sta): رکنا یا روکنا، تان: پھیلانا۔

یہ مادے حواس خمسہ سے شناخت کی جانے والی اشیا (Percept) پر دلالت نہیں کرتے بلکہ ایسے بہت سے تجربوں کے غیر مرئی جزو مشترک یعنی تصور (Concept) کو ظاہر کرتے ہیں۔ بعد میں عمومی تصور کو مخصوص تصورات میں تقسیم کر دیا گیا۔ مندرجہ بالا تفصیل سے میکس طر کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس پر کئی اعتراضات ہو سکتے ہیں۔

۱۔ یہ پورا نظریہ محض قیاس پر مبنی ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔

۲۔ اگر ایک زمانے میں انسان میں مادے تخلیق کرنے کی صلاحیت تھی تو وہ ہمیشہ کے لیے فنا کیوں کر ہو گئی۔

۳۔ دنیا کی بعض زبانوں مثلاً چینی میں سرے سے مادے اور مشتق کا جھنجھٹ ہی نہیں۔ ان کی توجیہ کیوں کر ہو۔

۴۔ جن فرضی مادوں سے اتنے سارے الفاظ ماخوذ کیے گئے ہیں صوتی اصول اس اشتقاق کی تائید نہیں کرتے۔

۵۔ بالفرض مادے چیزوں کی جھنکار کی صدائے بازگشت ہیں تو ان سے مشتق ہونے والے الفاظ کے لیے چھپے کیوں کر پیدا ہو گئے۔

۶۔ زبان اور قواعد کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی تخلیق کے ایک عرصہ دراز کے بعد انسان نے مادوں کی دریافت کی اور ان پر تصریف کے عمل سے دوسرے الفاظ کا اشتقاق کیا۔ ابتدائی جنگلی انسان کہاں سے صرف (Morphology) کا اتنا ماہر ہو سکتا تھا کہ مادوں سے نئے نئے الفاظ بنائے۔

۷۔ اس نظریے پر آخری اعتراض یہ ہے کہ وحشی انسان کے لیے مادی ادراک (Percept) پہلے آنا چاہیے، غیر مرئی تصور (Concept) بعد میں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ شمالی امریکہ کی چیروکی زبان میں ہاتھ دھونے، کپڑا دھونے وغیرہ کے لیے مخصوص الفاظ ہیں لیکن محض دھونے کے لیے کوئی نہیں۔ یا زولو زبان میں سفید گائے، سیاہ گائے، لال گائے کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں لیکن محض گائے کے لیے نہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مادی تجربے کے لیے لفظ پہلے وضع کیا گیا عام تصور کے لیے بعد میں۔

اس نظریے کے سب سے بڑے وکیل میکس مل کو بھی بعد میں اس کی خامیاں نظر آ گئیں اور اس نے اس سے انحراف کر لیا۔

۸۔ فجائی نظریہ (Pooh pooh theory): اسے میکس مل نے تضحیک کے طور پر پوہ پوہ نظریہ کہا۔ اس کے مطابق ابتدائی انسان عقل کے بجائے جذبے کے زیر اثر تھا۔ ہر جذبے کی شدت میں اس کے منہ سے کوئی اضطراری آواز نکل جاتی تھی۔ اس فجائیہ نعروں کی صفائی سے زبان میں آوازیں (مصوتے اور مصمتے) پیدا ہوئیں اور انھیں سے دوسرے الفاظ بنے۔ ڈارون نے شدت جذبات میں فجائیہ کلمات کی ادائیگی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو میں اس قسم کے الفاظ ہائے ہائے، آہ، واہ، اف وغیرہ ہیں۔ انگریزی میں fie, oh, pooh pooh وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ اس قسم کے الفاظ کی صحیح تشریح کرتا ہے لیکن ہر زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد کتنی ہوتی ہے محض دس بیس بقیہ بے نہایت الفاظ کی کیا تاویل ہو۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ الفاظ واقعی فجائی آوازوں کی نہایت ناقص لسانی تشکیل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زبانوں میں ایک ہی جذبے کا رد عمل مختلف الفاظ سے دکھایا جاتا ہے حالانکہ واقعی کراہنے یا قہقہہ لگانے میں ایک ہی قسم کی غیر ابجدی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ فجائی آواز میں زبان کا تخم تو در کنار زبان کا جزو بھی نہیں۔ یہ زبان سے ہی بروئے کار آتے

ہیں۔ کہا گیا ہے: ''Language begins where interjections end'' آخری وقیع اعتراض یہ کہ فجائی کلمات اشتقاق کے نقطۂ نظر سے بالکل جامد ہوتے ہیں۔ ان پر تعریف کا عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ الفاظ زبان کو کیوں کر جنم دے سکتے ہیں۔

۹۔ اجتماعی محنت کی ہانک کا نظریہ (Yo-he-yo theory): اس نظریہ کا بانی نوائر (Noire) ہے۔ جب انسان سخت محنت کرتے ہیں تو ہانپتے یعنی تیز تیز سانس لینے سے کچھ مدد ملتی ہے۔ تیز سانس کی آمد و رفت سے صوتی تاروں میں ارتعاش ہوتا ہے۔ غیر متمدن انسان جب اجتماعی طور پر کوئی کام کرتے تھے تو سہارے کی خاطر کوئی ہانک لگاتے تھے۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ یورپی ملاح کشتی کھینچتے وقت یوہی یو اور ہندوستانی مزدور ہیا ہیا کہتے ہیں۔ دھوبی اپنے پٹڑے پر کپڑے پٹکتے وقت چھیورام چھیورام بولتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس نظریے کے مطابق ابتدائی آوازیں اجتماعی مشقت کی پیداوار ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بالکل لغو ہے۔ کسی زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ ہوگی۔ ایک مصنف ڈائمنڈ کو اس نظریے پر ایک اور اعتراض ہے۔ اس نظریے کے مطابق سب سے پہلے الفاظ کسی بھاری چیز کو گھسیٹنا (Haul) اور کسی لکڑی یا پتھر کو کاٹنا (Heave) کے ہم معنی رہے ہوں گے۔ ڈائمنڈ کہتا ہے کہ قدیم ترین زبانوں میں کھینچنا یا کھسیٹنا کے مفہوم کا مادہ نہیں ملتا۔

اس نظریے کو نکھار کر دوسرے کئی علماء نے ایسے نظریے پیش کیے جن میں زبان کو جسمانی محنت کی ضمنی پیداوار قرار دیا۔ یہ نظریے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ تاتا نظریہ: اس کے مطابق انسان جب کوئی محنت کرتا تھا تو نادانستہ طور پر اس کے اعضائے نطق محنت کرنے والے اعضائے جسم کی نقل کرتے تھے جس سے کچھ آوازیں بلکہ آوازوں کے مجموعے پیدا ہو جاتے تھے۔ آوازوں کے انھیں مجموعوں یعنی بے معنی الفاظ سے زبان کا ارتقا ہوا۔

اس نظریے پر دو اعتراضات ہیں۔ اول کہ اب انسان محنت مشقت کرتے وقت ''ہوں'' جیسی آواز کے علاوہ آوازوں کے متصل یا متنوع خوشے ادا نہیں کرتا۔ کیوں کر کہا جائے کہ وحشی انسان جو زبان سے نا آشنا تھا اور جانور کی طرح تھا ایسی آوازیں منہ سے نکالتا تھا جو ''لفظ'' کی طرح ہوں۔ دوسرے یہ صاف نہیں کہ ان بے معنی آوازوں سے مصوتوں اور مصمتوں والے با معنی الفاظ کیوں کر بنے یہی تو اصل مسئلہ ہے جس کی حقیقت ہمیں جاننی ہے۔

۱۹۲۳ء میں ایک شخص مرے (Murray) (۸) نے بھی زبان کو ابتدائی انسان کی حرکت بازو کی نقل قرار دیا۔ اس کے نزدیک ہر مشقت کے عمل کے ساتھ ایک مخصوص بے معنی لفظ زبان سے ادا ہوتا تھا۔ یہ الفاظ زبان کے جنم داتا تھے۔ مرے کے نزدیک ایسے ابتدائی مادے محض تو ہیں مثلاً: Ag, wag, hwag, hrag ان کے معنی ضرب پہنچانا، ہلانا وغیرہ ہیں۔ معلوم نہیں مرے کے یہ تمام مادے آگ (ag) ہی پر کیوں ختم ہوتے ہیں۔

مرے کے نظریے کو ڈائمنڈ نے اور ترقی دی۔ آغاز زبان پر اس کی کتاب ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے نظریے کا نچوڑ اسی کے ان الفاظ میں ہے: (۹)

Speach originated in vocal sounds automatically accompanying effort of the arm.

زبان کے ابتدائی الفاظ کھینچنا، کاٹنا، پھاڑنا وغیرہ کے مفہوم کو ظاہر کرتے تھے اس نظریے اور یو ہیو نظریے میں یہ دو فرق ہیں:

الف۔ یو ہیو کے مطابق زبان کی ابتدا اجتماعی محنت سے ہوتی ہے جب کہ ناتا میں یہ انفرادی محنت کی دین ہے۔

ب۔ یو ہیو میں محنت کے ساتھ منہ سے آوازیں نکالنے کا مقصد تھکن کم کرنا تھا۔ مرے اور ڈائمنڈ کے یہاں یہ عمل کسی مقصد کے بغیر ہوتا تھا۔ ان کے یہاں آلات نطق لازماً حرکت بازو کے متوازن نہیں چلتے۔

اس نظریے میں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ محنت کے ساتھ ساتھ زبان سے آواز نکلتی ہے

لیکن وہ آوازیں اس قسم کی نہیں ہوتیں جنھیں زبان کے قدیم ترین مادے کہا جا سکے۔

۱۰۔ اشارات وحرکات کا نظریہ: یہ نظریہ مندرجہ بالا نظریے سے اس بات میں مختلف ہے کہ اول الذکر میں زبان کو محنت مشقت کے عمل کی ضمنی پیداوار قرار دیا تھا۔ زیر نظر نظریے میں محنت کا ذکر نہیں بلکہ گفتگو کے ساتھ کی حرکات (Gestures) کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

اس کے وکلا میں چار اشخاص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے اسے پولی نیشیائی زبانوں کے عالم ڈاکٹر رائے نے پیش کیا۔

۲۔ اس کے بعد ڈارون نے چھ غیر متعلق زبانوں کے تقابلی مطالعے کی بنا پر اس کی حمایت کی۔

۳۔ ۱۹۳۰ء میں سر رچرڈ پیجز (Richard Pages) (۱۰) نے حرکات دہنی کا نظریہ (Mouth gesture theory) پیش کیا جو اس طرح ہے:

کھانا کھاتے وقت زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے کچھ آواز پیدا ہوتی ہے اس سے وحشی انسان کو دریافت ہو گیا کہ حلق سے باہر ہوا نکالنے سے آواز پیدا کی جا سکتی ہے اور وحشی انسان جو کچھ حرکات اور اشارے کرتا تھا غیر شعوری طور پر زبان اور ہونٹ بھی اسی سے متوازی حرکتیں (Gestures) کرتے تھے۔ ان حرکات دہنی سے مختلف آوازیں پیدا ہوئیں۔

۴۔ آئس لینڈ کی زبان کے عالم الگزینڈر جوہانسن نے ہند یورپی، عبرانی، قدیم چینی ترکی اور چند اور زبانوں کے مطالعے کے بعد اس نظریے کو تفصیل سے پیش کیا۔ ان کے مطابق نطق کے ارتقا میں چار منزلیں ہیں۔

پہلی منزل ان حیوان نما آوازوں کی ہے جن میں انسان اپنے بنیادی جذبات مثلاً خوف، غصہ، غم، خوشی، جنسی خواہش وغیرہ کا اظہار کرتا تھا۔ اس منزل کی آوازیں غوں غاں قسم کی رہی ہوں گی۔

دوسری منزل میں اس نے مختلف جانوروں کی آوازوں اور بے جان اشیا کی جھنکار کی نقل کی اور انھیں صوت نما الفاظ میں ظاہر کیا۔

تیسری منزل میں انسان نے ایک طرف تو اپنے جذبات کو حرکات (Gestures) کی مدد سے ادا کیا، دوسری طرف غیر شعوری نقل کے طور پر اعضائے نطق (زبان اور ہونٹوں) نے اس کی ان حرکتوں بالخصوص ہاتھوں کی حرکتوں کی نقل کی۔

گانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ موسیقار آواز کی ادائیگی کے لیے مسلسل ہاتھوں کی حرکت سے مدد لیتا ہے۔ جو ہانسن نے اس کے برعکس ہاتھوں کی حرکت کو اولیت دی جس کی نقل آلات نطق نے کی۔ اعضائے نطق کی جنبش سے الفاظ متشکل ہوئے۔ لیکن یہ الفاظ مادی اشیا کے لیے رہے ہوں گے۔ اس منزل کو جو ہانسن نے اہم ترین قرار دیا ہے۔

چوتھی منزل میں تخلیق الفاظ کا کام اور ترقی کر گیا اور اس منزل میں لطیف تصورات کے لیے الفاظ وضع کیے گئے۔

انھوں نے نطق کی واحد آوازوں یعنی مصوتوں اور مصمتوں کا معنی کے ساتھ تعلق بھی قائم کیا جو بڑا عجیب ہے۔ اس کی دو مثالیں ہیں:

چونکہ مصمتہ (ر) ادا کرنے میں زبان کو آگے بڑھنا ہوتا ہے اس لیے قدیم زبانون میں (ر) سے شروع ہونے والے مادے کے معنی رفتار یا دوڑنے (Run) کے ہیں۔ انھوں نے عبرانی زبان کے مادوں ر ب گ (ملانا) اور ر گ ب (چڑھنا، سوار ہونا) کو مثال میں پیش کیا۔ لیکن دوسری کلاسیکی زبانوں میں ایسے بہت سے مادے ملتے ہیں جن کے معنی میں "حرکت" شامل ہے لیکن وہ (ر) سے شروع نہیں ہوتے۔

(م) کو ادا کرنے میں چونکہ ہونٹ بند ہو جاتے ہیں اس لیے "م" سے شروع ہونے والے مادوں کے معنی خاموشی (Mum) یا بند کرنے کے ہوتے ہیں۔

جب ہم اپنی موجودہ زبانوں کو دیکھتے ہیں تو "ر" اور "م" کی اس تاویل کی تصدیق نہیں ہوتی۔ انگریزی الفاظ rust, rest, remain اور اردو لفظ رہنا میں حرکت کا شائبہ نہیں۔ اس کے برعکس انگریزی الفاظ (Mash, move) کے معنی میں سکون کے بجائے حرکت پائی جاتی ہے۔

جو ہانسن کا نظریہ ایک فلسفیانہ خوش فکری ہے۔ یہ قائل نہیں کرتا۔ اعضائے نطق کا اپنے جسم کی حرکات کی نقل میں آوازوں کو جنم دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ بالفرض اسی طرح کچھ آوازیں پیدا بھی ہوں تو وہ غیر لسانی آوازیں ہوں گی۔ ان سے لسانی آوازیں اور الفاظ کیوں کر بنے ہوں گے اس کی کوئی تاویل نہیں۔ جو ہانسن نے مفرد آوازوں کے جو معنی متعین کیے ہیں وہ بہت تھوڑے سواد کو دیکھ کر طے کر دیے گئے ہیں۔ اب مختلف علماء کے پیش کردہ چھ مفصل نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔ جو ہانسن کے نظریے کی طرح ان سب میں کئی منزلوں کا تصور کیا گیا ہے۔

۱۲۔ ہنری سویٹ کا نظریہ: یہ انیسویں صدی کے ماہر لسانیات تھے۔ انھوں نے کئی نظریوں کی مدد سے اپنا نظریہ قائم کیا۔ ان کے مطابق ابتدا میں زبان اشاروں (Gestures) اور مجموعہ اصوات (لفظوں) دونوں پر مشتمل تھی۔ مجموعہ اصوات کی بنا پر لفظوں کا ارتقا ہوا۔ ابتدائی الفاظ تین قسم کے تھے:

الف۔ صوت نقل الفاظ مثلاً سنسکرت کاگ (کوا)، انگریزی کوکو (کوئل) قدیم مصری ماؤ (میاں بلی) بعض اوقات ایسے الفاظ صوت کی صحیح نقل نہیں ہوتے تھے۔

ب۔ فجائی الفاظ جو شدت جذبات کی پیداوار ہوتے ہیں مثلاً ہائے، آہ، واہ، شاذ و نادر ایسے الفاظ مادے بن کر دوسرے الفاظ کو جنم بھی دیتے ہیں مثلاً انگریزی میں پوہ پوہ سے (Pooh poohed) ہندی میں دھکار سے دھکارنا۔

ج۔ رمزی (Symbolic) الفاظ: یہ وہ الفاظ ہیں جن میں اتفاق یا کسی نحیف مماثلت یا رشتے کی وجہ سے کوئی مخصوص معنی فرض کر لیے جاتے ہیں۔ ان کی ہیئت اور معنی میں دور کا تعلق ہوتا ہے مثلاً بچہ دودھ پینے میں ہونٹوں کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے اسے ہونٹوں کی جنبش کی مشق ہو جاتی ہے۔ ہونٹوں کو ہلانے سے دو لبی آوازیں، پ، ب، م پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس نے شروع میں پاپا، بابا، ماما جیسے الفاظ ادا کیے، ماں باپ نے انھیں خود سے موسوم کر دیا۔ پنگوڑے کے یہ الفاظ (Nursery words) مختلف زبانوں میں اسی

طرح کے رمزیاتی معنی میں لے لیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: عبرانی اور عربی، اُم، اب۔ یونانی phrater, pater, meter (بھائی)۔ لیٹن (frater, pater, mater) جرمن: (muhme, bruder, vater) انگریزی ماما، پاپا۔ ہندی اردو ماں، اماں، بابا، ابا، بھائی وغیرہ۔

اسموں کے علاوہ کچھ ضمیر اور فعل بھی اسی قسم کے ہیں۔ ضمائر میں سنسکرت توم، یونانی to، لاطینی tu، انگریزی you, than اور ہندی تو، میں سامنے کے آدمی کے لیے منہ سے اشارہ مضمر ہے۔ اسی طرح اشاری ضمائر 'یہ' 'وہ' (that, this) اور جرمن (das, dies) وغیرہ میں آواز کے ساتھ اشارہ شامل ہے اور اس اشارے کی وجہ سے ان الفاظ کو ان کے معنی دیے گئے۔

افعال میں لاطینی bibere انگریزی blow، ہندی پی وغیرہ میں ہونٹوں کی ایسی حرکت شامل ہے جیسی پھونک مارنے یا پانی پینے میں ہوتی ہے۔

کچھ ایسے بھی الفاظ ہوں گے جو صوت نما بھی ہوں اور رمزی بھی مثلاً rush وغیرہ۔ ابتدا میں رمزی الفاظ کی تعداد بہت رہی ہوگی۔ بعد میں ایسے الفاظ باقی رہ گئے جو بقائے نسب میں پورے اترے یعنی جو سننے، بولنے اور مفہوم کی ادائگی میں بہتر تھے۔ ابتدا میں زیادہ تر الفاظ اشیا کے نام رہے ہوں گے انھیں سے لطیف تصورات اخذ کیے گئے مثلاً جنوبی افریقہ کی ساسوتو زبان میں مکھی کو اس کی آواز کی بنا پر "ن ت سی" (ntse) کہتے ہیں۔ مکھی کی طرح چکر لگانا خوشامدیوں کا بھی شعار ہوتا ہے اس لیے "ن ت سی" کے معنی چاپلوسی کرنا بھی ہو گئے۔ اس طرح استعارہ، مماثلت وغیرہ کی بنا پر مختلف غیر مرئی تصورات کو نام دیے گئے۔

سویٹ نے جن الفاظ کو رمزی کہا ہے ان میں سے ماں، باپ، بھائی کے معنی کے الفاظ اس قسم کی علامتیں ہو سکتی ہیں لیکن زبان کے بیشتر الفاظ میں ہیئت اور مفہوم میں دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

۱۳۔ نغمائی نظریہ: (sing song theory): گو اسے ڈارون اور اسپنسر نے بھی کسی حد تک مانا ہے لیکن شرح وبسط کے ساتھ اسے ڈنمارک کے مشہور ماہر لسانیات یسپرسن

(Jesperson) نے اپنی کتاب (Language) میں پیش کیا۔ یسپرسن کی تفصیلات کے پیش نظر اسی کو اس نظریے کا موجد مانا جاسکتا ہے۔

اس کے نزدیک زبان کی ایجاد خیالات کی ترسیل کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ لہو ولعب کے جذبہ نشاط کا ابال ہے۔ وحشی انسان کی ضرورتیں کم تھیں وہ بآسانی فطرت سے اپنی بنیادی ضرورتیں مثلاً خوراک حاصل کرلیتا تھا اس لیے نوجوان اپنا بیشتر وقت ناچ گانے اور پیار محبت میں بسر کرتے تھے۔ ان مشاغل میں ان کے منہ سے کچھ بے معنی فقرے نکلے ہوں گے مثلاً ایک نوجوان نے موسم بہار میں اپنی محبوبہ کو دیکھ کر ایک طویل بے معنی فقرہ نعرے کے انداز میں ہانک دیا ہوگا۔

hey-and-a-ho-and-a-hey-nomino

اس کے دوستوں نے اس نوجوان کو اسی فقرے سے موسوم کردیا ہوگا۔ یا ایک گروہ نے اپنے جانی دشمن کو شکست دے کر مار دیا ہو اور سب اس کی لاش کے گرد ایک بے معنی فقرہ Terra-ra- boom-de-ay کہہ کر ناچنے لگے ہوں تو بعد میں اس فقرے کو کچھ بھی معنی پہنا دیے گئے ہوں گے۔ مثلاً ہم نے خطرناک آدمی کو مار ڈالا۔ بعد میں ان فقروں کو لفظوں میں توڑ لیا ہوگا اور ہر لفظ کے کوئی معنی متعین کرلیے گئے ہوں گے۔ اس طرح زبان میں پہلے طویل فقرے یا جملے آئے، بعد میں الفاظ۔

حیرت ہے کہ یسپرسن جیسا بالغ نظر عالم اس قسم کا بے بنیاد نظریہ پیش کرے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ حیوانی غوں غاں کے بعد اگلی منزل یک رکنی مجموعہ اصوات مثلاً آ، با، پا، سے ما، مے وغیرہ کی ہوگی۔ یہ ممکن نہیں کہ نطق کی ابتدا کئی کئی لفظوں پر مشتمل فقروں، کئی کئی صوت رکنوں پر مشتمل الفاظ اور طرح طرح کے مصمتوں پر مشتمل صوت رکنوں سے ہو۔

پھر یہ صحیح نہیں کہ ابتدائی انسان کی زندگی اتنی سہل بلکہ عیاشانہ تھی۔ وہ اجنبی اور مہیب مظاہر فطرت کے درمیان گھبرایا رہتا ہوگا۔ اسے ہر دم رقص ونغمہ اور رومان کی مہلت نہ ہوگی۔

۱۴۔ ارتباطی نظریہ (Contact theory): اسے ماہر نفسیات ریویز (Revesz) نے پیش

کیا۔ انھوں نے حیوانات، بچوں اور غیر مہذب انسانوں کی نفسیات کا مطالعہ کرکے یہ نظریہ قائم کیا جو حسب ذیل ہے:

انسان مدنی الطبع ہے۔ ابتدائی انسانوں میں چھوٹے چھوٹے گروہ رہے ہوں گے اور ہر گروہ کے بیچ ابتدائی جذبات مثلاً بھوک پیاس، جنسی خواہش وغیرہ کی ترسیل کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ اس سماجی ربط کے لیے وہ لمس اور آوازوں دونوں کا سہارا لیتا ہوگا۔ جیسے جیسے سماجی ارتباط بڑھتا گیا۔ ترسیل کرنے والی آوازوں کا ارتقا بھی ہوتا گیا۔ ابتدا میں یہ ارتباط جذباتی سطح پر رہا ہوگا لیکن بعد میں ذہنی سطح تک آ گیا ہوگا۔ اس منزل میں آ کر زبان کے ارتقا کی رفتار بڑھ گئی ہوگی۔ ابتدائی آوازیں سادہ رہی ہوں گی بعد میں پیچیدہ ہو گئی ہوں گی۔

ریویز فجائی کلمات مثلاً آہ، واہ، وغیرہ میں ترسیل کا عنصر مضمر نہیں مانتا لیکن ان کا اور ترسیلی آوازوں کا تعلق ضرور ہے۔ ترسیلی آوازوں میں سب سے پہلے اطلاعی الفاظ مثلاً چلانا، پکارنا، کے مفہوم والے ظہور پذیر ہوئے ہوں گے۔ ابتدائی الفاظ کو معینہ موقعوں پر استعمال کرنے کی وجہ سے ان میں کوئی مفہوم مخصوص ہو گیا ہوگا۔

الفاظ کی تخلیق میں انھیں سے ایسی آوازیں بنیں جنھیں وہ (Contact sound) کہتا ہے۔ ارتباط کی ان آوازوں سے اطلاعی آوازیں ارتقا پذیر ہوئیں۔ اطلاعی آوازیں چلانے اور پکارنے جیسے مفہوم ادا کرتی ہوں گی۔ اس کے بعد زبان کے ابتدائی لفظ بنے۔ ایک لفظ کو مخصوص موقعوں پر استعمال کرنے سے اس میں کچھ مخصوص معنی متعین ہو گئے ہوں گے۔ ابتدائی الفاظ رشتہ داروں اور اشیا کے ناموں سے متعلق ہوں گے لیکن یہ اصلاً اسم نہ ہو کر فعل رہے ہوں گے۔ ایک لفظ سے پورے جملے کا مفہوم لیا جاتا ہوگا مثلاً "ماں" کے معنی "ماں دودھ جو" جیسے رہے ہوں گے۔ اس طرح پہلے لفظ جملوی مفہوم والے فعل رہے ہوں گے جن سے بعد میں اسم ماخوذ ہوئے۔

مزید ارتقا ہونے پر لفظوں کو ملا کر چھوٹے چھوٹے جملے بنائے گئے ہوں گے لیکن بولنے والوں کو جملے کے اجزا کا شعور نہ ہوگا۔ بلکہ پورے جملے کا ایک مفہوم سمجھتے ہوں گے۔ آہستہ

آہستہ خیالات کی زیادہ ترسیل کے ساتھ زبان کا ارتقا ہوتا گیا۔ راقم الحروف کو اس نظریے میں دو کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے۔

(الف) آغاز زبان کے بارے میں قیاس کیا جائے تو یہ سوجھتا ہے کہ وحشی انسان نے پہلے مادی اشیا کے نام (Persepts) رکھے ہوں گے اور بعد میں غیر مرئی تصورات (Concepts) تک پہنچا ہوگا لیکن زبانوں کو دیکھا جائے تو یہ عجوبہ دکھائی دیتا ہے کہ زبان کے مادے فعل سے بنے ہیں جو ایک تصور ہے۔ اس تضاد اور دبدھا کی تاویل مشکل ہے۔ ریویز نے اس سلجھانے کے بجائے قابل رحم طریقے سے الجھایا ہے۔ وہ ایک طرف کہتا ہے کہ ابتدائی الفاظ رشتہ داروں اور اشیاء کے نام رہے ہوں گے اور اسی کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ لفظ فعل رہے ہوں گے اسم نہیں۔ دونوں باتیں کیونکر ممکن ہیں۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ رشتہ داروں کے ناموں کے مفرد الفاظ میں جملے کا مفہوم رہا ہوگا۔

(ب) وہ زبان کی ابتدا مفرد لفظ سے کرتا ہے لیکن زبانوں کی نوعیاتی تقسیم میں اس نے دیکھا کہ شمولی نوعیت (Incorporating) کی زبانیں بہت پچھڑے ہوئے قبیلوں میں مستعمل ہیں، اس لیے اس نے یہ کہہ دیا کہ ابتدا میں جب انسان نے لفظوں کو ملا کر جملے بنائے تو وہ جملے کے اجزاء یعنی الفاظ کا الگ الگ مفہوم نہ لیتا ہوگا۔ یہ کیونکر؟ اگر اس نے ابتدا مفرد الفاظ کی تخلیق سے کی اور انھیں جوڑ کر جملہ بنایا تو وہ لفظوں کا شعور کیونکر کھودے گا۔ یہاں ریویز شمولی زبانوں کے طلسم میں اسیر دکھائی دیتا ہے۔

لسانیات کے بہت سے علماء ریویز کے نظریے کو آغاز زبان کی گتھیاں حل کرنے میں نا کافی سمجھتے ہیں۔

۱۵۔ تاراپوروالے کا نظریہ: ہندوستان کے تاریخی لسانیات کے عالم تاراپوروالے نے بھی زبان کے آغاز کا ایک نظریہ (۱۱) پیش کیا۔ وہ بچوں کے اکتساب زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بچے کے زبان سیکھنے میں کئی منزلیں ہیں:

۱۔ شروع میں بچہ جبلی خواہشوں کی آسودگی کے لیے محض غوں غاں کرتا ہے۔ یہ جبلی

خواہشیں بھوک، پیاس، خوف، خوشی اور جھنجھلاہٹ وغیرہ ہیں جو طرح طرح سے رو کر یا ہنس کر ادا کی جاتی ہیں۔

۲۔ اس سے اگلی منزل میں وہ آوازوں کی گڈمڈ سے الفاظ بنالیتا ہے۔ عام سامع کے لیے وہ بے معنی ہوتے ہیں لیکن والدین تجربے سے ان کے معنی کی قدر سمجھنے لگتے ہیں۔

۳۔ تیسری منزل باقاعدہ زبان کی ہے۔

ایسا ہی ابتدائی وحشی انسان کے ساتھ ہوا ہوگا۔ جب وہ حیوان سے انسان کی منزل میں داخل ہوا یعنی پوری طرح سیدھا کھڑے ہو کر چلنے لگا تو اس کا مغز کافی بالیدہ ہو چکا ہوگا۔ اس وقت وہ جانوروں ہی کی آوازوں میں اپنی جبلی خواہشوں اور جذبوں کا اظہار کرتا ہوگا۔

دوسری منزل میں بنیادی تصورات مثلاً بھوک، نیند، ڈر، جنسی خواہش وغیرہ کو ناقابل تجزیہ آوازوں (مصمتے اور مصوتے) کے مجموعے سے ظاہر کرتا ہوگا۔ یہ گڈمڈ آوازیں نہ جملہ کہی جاسکتی ہیں نہ لفظ۔ ایک پورے خیال کے لیے ایک صوتی خوشہ ہوگا۔ اس قسم کی مثالیں ایک بہت پچھڑی ہوئی امریکی زبان Tierra de Fuego میں ملتی ہیں۔ وہاں پر تجربے کے اظہار کے لیے اصوات کے گروہ ہیں اور یہ گروہ کیسے پیچیدہ ہیں مثلاً Mamihapina ta pai کے معنی ہیں۔

''دو آدمی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں اس امید میں کہ دوسرا اس کام کو کردے گا جو دونوں چاہتے ہیں۔ لیکن خود نہیں کرنا چاہتے۔''

اس طویل لفظ یا جملے کو مختلف معنی دار اجزا میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ ایک اور شمالی زبان Old Huron iroquois میں ذیل کے جملوی لفظ ملاحظہ ہوں:

میں پانی تک گیا ہوں	Eschoirhon
پانی تک جاؤ	Setsonha
بالٹی میں پانی ہے	On de quoha
برتن میں پانی ہے	Daustant ewa charte

ان فقروں میں پانی کے لیے کوئی جزو دکھائی نہیں دیتا یعنی بظاہر ایک مشترک تصور کی کمی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ "بالٹی میں پانی ہے" اور "برتن میں پانی ہے" جیسے مفاہیم کو ادا کرنے والے فقرے بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں میں جملوی مفہوم کے لیے ایک فقرہ یا لفظ ہے جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاراپوروالے کے نزدیک وحشی انسان نے دوسری منزل میں اس قسم کے صوتی گچھوں سے بنیادی تصورات کی ترسیل کی ہوگی۔

تیسری منزل میں ان جملوی فقروں کو مفرد تصورات یعنی لفظوں میں تقسیم کیا ہوگا۔ شروع میں مادی اشیا اور ابتدائی تصورات کے لیے الفاظ کی تشکیل ہوتی ہوگی۔

چوتھی منزل میں قواعد زبان ارتقا پا گئی ہوگی۔

تاراپوروالے نے بچوں کی زبان سے اپنے نظریے کا استنباط کیا ہے لیکن بچوں کی زبان اور ابتدائی وحشی انسان کی زبان میں دو بڑے فرق ہیں (۱) بچے کو کوئی نئی زبان تخلیق نہیں کرنی بلکہ وہ اپنے ماحول میں پہلے سے موجود زبان کا اکتساب یا نقل کرنے کا معرکہ ہی سر کرتا ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ بچہ خود باقاعدہ بولنے سے کئی ماہ قبل والدین کے احکامات اور بنیادی جملوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ گویا بچہ زبان کے نفسیاتی پہلو پر پہلے ہی غور کر لیتا ہے اور میکانکی پہلو میں بھی سمعی حصے پر حاوی ہو جاتا ہے صرف ملفوظی میکانکی حصے کی مہارت کے لیے اسے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس ابتدائی وحشی انسان کو زبان کی تخلیق کا مسئلہ درپیش تھا۔ دوسرے یہ کہ بچے کا ذہن اور مغز بہت کم بالیدہ ہوتا ہے جب کہ بالغ وحشی انسان کا شعور، ذہن اور مغز کہیں زیادہ بالیدہ رہا ہوگا۔ تاراپوروالے کے ذہن پر تاریخی لسانیات کا یہ قدیم مفروضہ سوار ہے کہ زبانوں کا ارتقا شمولی سے امتزاجی اور امتزاجی سے تصریفی میں ہوا۔ اس لیے صوتیاتی زبان کی پہلی اکائیاں فقروی الفاظ کو قرار دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ حیوانی غوں غاں کے فوراً بعد انسان اتنے طویل اور پیچیدہ فقرے یا لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ ابتدا میں وہ ایک دو صوت رکنوں پر مشتمل الفاظ ہی کہہ سکا ہوگا۔

یہ ماننے کے لیے بھی شافی دلائل نہیں کہ ابتدا پورے خیالات کو ظاہر کرنے والے فقروں

یا طویل الفاظ سے ہوئی اور انھیں بعد میں لفظوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۶۔ ہمارے زمانے کے امریکی ماہر لسانیات ایڈگر اسٹر تے وانت نے اپنی کتاب ''این انٹروڈکشن ٹو لنگوئسٹک سائنس'' میں ایک نظریہ پیش کیا جو مندرجہ بالا بعض نظریوں سے جزوی طور پر مماثل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ شدت جذبات میں انسان منہ سے اضطراری طور پر کچھ آوازیں نکالتا تھا۔ بعد میں ان آوازوں میں اس مخصوص جذبے کا مفہوم رچ بس گیا۔ مثلاً کراہنا درد یا چوٹ کو ظاہر کرتا تھا چنانچہ کسی کو یہ بتانا ہو کہ اس کے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی ہے تو وہ کراہ کر دکھاتا تھا یعنی فجائی آوازیں اضطراریت کے بجائے بالقصد ادا کی جانے لگیں۔ فجائی آوازوں کے علاوہ انسان حرکات واشارات سے بھی کام لیتا تھا اور حیوانات کی آوازوں کی بھی نقل کرنے لگا۔ کوئی انسان شیر کو دیکھ کر جھپٹ کر پیڑ پر چڑھ گیا لیکن شیر نے ٹخنے کا کچھ گوشت اڑا دیا۔ اپنے ساتھیوں سے اس کا بیان کرنے کے لیے وحشی انسان کراہ کر پاؤں کا زخم دکھائے گا اور اس کے بعد شیر کی غراہٹ کی نقل کر کے بتائے گا۔ یہ شیر کی حرکت ہے۔ اگر اسے یہ کہنا ہوگا کہ ''بھیڑیا دوڑا'' تو وہ بھیڑیے کی سی آواز نکال کر چوپایوں کی طرح دوڑ کر دکھائے گا۔ آہستہ آہستہ غیر صوتی حرکات واشارات مفصل ہوتے گئے مثلاً کھلا ہاتھ آگے بڑھانے کے معنی مانگنا۔ مٹھی بند کر کے پیچھے کھینچنے کے معنی رکھنا یا جمع کرنا۔

آہستہ آہستہ صوتی اشاروں کو غیر صوتی اشاروں پر ترجیح دی جانے لگی کیونکہ یہ اندھیرے میں بھی کارآمد ہیں اور اس وقت بھی جب کہ فریق ثانی ہماری سمت نہ دیکھ رہا ہو۔ ترسیل جوں جوں صوتی ہوتی گئی مختلف صوتی خوشوں میں من مانے مفاہیم رچتے گئے اور یہی زبان کی ابتداء تھی۔

اس نظریے کا مرکزی حصہ محض وہ ہے جو آج بھی ہم ایک گونگے، انسان کو کرتے دیکھتے ہیں۔ وہی صوتی اور حرکتی اشاروں سے ملا جلا کر کام لینا۔ اصل مسئلہ اس نظریے میں گول کر دیا

گیا ہے کہ فجائی آوازیں یا حیوانات کی آوازوں کی نقلیں صوتیاتی الفاظ میں کیوں کر بدلیں۔

۱۷۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کا نظریہ: ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے اورینٹل کانفرنس کی صدارت کی اور اس کے خطبہ صدارت میں آغاز بیان کا ایک نظریہ پیش کیا۔ موصوف نے ساگر یونیورسٹی میں منعقدہ موسم گرمائی لسانیاتی اسکول میں کچھ دنوں درس دیا۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۶۱ء کے کلاس لکچر میں اپنے نظریے کی تفصیلات بتائیں جو اس طرح ہیں:

سب سے پہلے انھوں نے اپنے نظریے کا جوہر ذیل کے الفاظ میں سمادیا:

Language is vocal reaction to natural and physical conditions.

زبان طبعی حالات کا صوتی ردعمل ہے۔ مختلف جذبات مثلاً پیار، خوف، غصے وغیرہ کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص قسم کی شور نما آوازیں تھیں۔ یہ ایک گروہ یا قبیلے کے بیچ ایک قسم کی کوڈ تھیں۔ جس وقت انسان کا ارتقا ہو رہا تھا اس وقت اس کی بولی بیشتر حلقی غراہٹوں وغیرہ پر مشتمل تھی۔ اس وقت نطق انسانی جذباتی کیفیت کی سطح سے بالاتر ہوا اور مختلف کیفیات کے لیے لفظوں کے اختراع کی کوشش کی گئی۔ قدیم ترین انسانی آوازیں حنجرہ Larynx میں پیدا شدہ چٹکار (Clicks) اور دوسری حلقی آوازوں نیز دوہری مخلوط آوازوں پر مشتمل رہی ہوں گی۔

بصری تجربوں کی توسیع کے ساتھ آوازوں کی باریکیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ابتدائی دور سے زبان کی تشکیل میں کوئی ایک لاکھ سال لگے ہوں گے۔ اسی دوران میں انسان معاشرے میں منظم ہو گیا۔

تاریخی عصر سے اب تک جب ہم زبانوں کا ارتقا دیکھتے ہیں تو مختلف زبانوں میں ایک ہی تصور یا کیفیت کو ظاہر کرنے کے بالکل مختلف طریقے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے زبان کے ارتقا کے مطالعے میں ہمارے سامنے ایک بنیادی سوال ابھرتا ہے کہ تمام زبانیں ایک ابتدائی بولی سے نکلیں یا مختلف علاقوں میں چند زبانیں آزادانہ طور پر ظہور پذیر ہوئیں۔ اس سے انسانی

نسل کے بارے میں بھی یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تمام نوع انسان ایک اصل سے پیدا ہوئی یا آزادانہ دو چار جگہوں پر؟ آج تمام انسان ایک نوع کے فرد ہیں۔ ان سب کے بیچ جفت ہونے اور تخلیق کا عمل ممکن ہے۔ لیکن انسانوں میں تین بڑی اور واضح نسلیں دیکھنے میں آتی ہیں: آریہ، منگول اور حبشی انھیں دیکھ کر ایک نظریہ یہ بھی قائم کیا گیا کہ حیوان سے انسان کا ارتقا تین جگہ ہوا جس سے تین بڑی نسلیں ظاہر ہوئیں اور تین جگہ انسانی زبان وجود میں آئیں۔

ڈاکٹر چٹرجی نے یہ واضح نہیں کیا کہ حیوان نما آوازیں صوتیاتی آوازیں اور لفظوں میں کیونکر تبدیل ہوئیں۔

ہم مندرجہ بالا نظریات میں سے کسی ایک سے مطمئن نہیں لیکن ان کے سوا زبان کے آغاز کی کوئی اور صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ حیوانوں کی آواز، اشیا کی جھنکار اور فجائیہ آوازوں کی نقل کے نظریے اس حد تک درست ہیں کہ وہ موجودہ یا قدیم زبانوں کے چند الفاظ کی تشکیل کی توجیہ کر دیتے ہیں لیکن یہ مجموعی طور پر زبان کے آغاز کی توجیہ نہیں کرتے۔ اس نقطۂ نظر سے ذیل کے پانچ نظریے زیادہ فکر انگیز ہیں۔

۱۔ ہنری سویٹ کا نظریہ ۲۔ ریویز کا نظریہ ۳۔ تاراپوروالے کا نظریہ

۴۔ استرتے وانت کا نظریہ ۵۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کا نظریہ

حقیقت انھیں میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ میں اس کی نشان دہی کرنے کی جرات نہیں کرتا کیوں کہ ایسا کرنے سے ایک اور مخلوط نظریہ وجود میں آجائے گا اور میرے پاس ایک نیا نظریہ پیش کرنے کی دلیلیں ہیں نہ متاعِ علم۔

یسپرسن نے اس مسئلے کی کھوج کے لیے تین موضوعات کا مطالعہ تجویز کیا۔

۱۔ بچوں کی زبان کا مطالعہ ۲۔ غیر متمدن قبائل کی زبانیں

۳۔ موجودہ زبانوں کی قدیم ترین تاریخ

مندرجہ بالا نظریوں کے بانیوں میں سے اکثر نے ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا ہے

لیکن ان میں بھی قباحتیں ہیں۔ بچے وہ زبان سیکھتے ہیں جو ان کے چاروں طرف مکمل حالت میں موجود ہوتی ہے۔ وحشی انسان کا تخلیقِ زبان کا عمل اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ آج کے غیر متمدن قبیلوں کی زبانیں بھی ابتدائی زبان کی آئینہ دار نہیں کیوں کہ ان قبائل کی زبانیں ہزاروں بلکہ لاکھوں سال کے ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ ارتقا کی رفتار سست سہی لیکن پھر بھی موجودہ روپ سے ایک لاکھ سال پرانے روپ کے بارے میں نتیجہ نکالنا احتیاط چاہتا ہے۔ ہاں زبانوں کی گذشتہ تاریخ نسبتاً مفید ہے۔

قبائلی زبانوں اور موجودہ مہذب زبانوں کی قدیم تاریخ سے زبان کا آغاز تو معلوم نہیں ہو پاتا۔ ہاں ابتدائی زبانوں کی خصوصیات کے بارے میں کچھ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے جو کچھ اس قسم کا ہے۔

۱۔ قدیم زبانوں کی آوازیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ تھیں۔ افریقی زبانوں میں کتنی مشکل اور غیر معمولی آوازیں ہیں۔ وہاں لفظ کی ابتدا میں کئی مصمتوں کا اجتماع معمولی بات ہے۔ افریقہ کی بعض زبانوں میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن میں کوئی مصوتہ ہی نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں وہ کیوں کر ادا کیے جاتے ہیں۔ سنسکرت میں ؟ اور ؟ جیسی مشکل آوازیں تھیں جو ہندی میں آ کر بالکل سادہ ہو گئی ہیں۔

واضح ہو کہ یہ آوازیں ہمیں زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہیں ورنہ ان زبانوں کے بولنے والوں کے لیے یہ اتنی ہی فطری اور سہل رہی ہوں گی۔

۲۔ بالکل ابتدا کے بعد کی زبان میں الفاظ زیادہ طویل تھے۔ اب استعمال کی خراد پر چڑھ کر مختصر اور آسان ہو گئے ہیں۔ سنسکرت میں الفاظ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔ انگریزی اور فرنچ وغیرہ میں جو غیر ملفوظی حروف بھرے پڑے ہیں ظاہر ہے کہ کسی زمانے میں وہ بولے جاتے ہوں گے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے الفاظ مختصر ہوتے جا رہے ہیں۔

۳۔ قدیم زبانوں میں ترنم کا لہجہ غالب تھا۔ یعنی وہ سردار زبانیں (Tone languages)

تھیں۔ قدیم انسان جذباتی تھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں کم بولتا تھا۔ ویدک بھاشا اور سنسکرت اشلوکوں کو مخصوص نغماتی لہجے میں پڑھنے کا رواج تھا۔ یگ اور ہون میں اگر انھیں غلط لہجے میں پڑھ دیا جاتا تو اثر ہی زائل ہو جاتا۔

۴۔ ذخیرۂ الفاظ یقیناً کم تھا۔ اس میں بھی محسوسات اور مادی اشیا کے الفاظ زیادہ تھے۔ لطیف اور مجرد خیالات کے اظہار کے الفاظ ناپید تھے۔ مثلاً تسمانیہ کی معدوم زبان میں سخت، نرم، سرد، گرم کے لیے الفاظ نہ تھے۔

۵۔ قواعد کے اصول کم اور غیر واضح تھے۔ جامد الفاظ کی تعداد زیادہ تھی۔ تصریف اور اشتقاق بہت کم ہوتا تھا۔ فعل میں زمانہ اور اسم میں جنس اور عدد نہ ہوگا۔ سابقے، لاحقے، حروف جار وغیرہ نہ ہوں گے۔

۶۔ جملے میں اکثر الفاظ کو ملا دیا جاتا ہوگا۔

(نوائے ادب اکتوبر ۷۸، لسانی مطالعے طبع سوم)

حواشی

1. Jesperson: Language, its nature, development and origin, P.96.

۲،۳۔ بھاشا وگیان (ہندی) از ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری، ص ۲۹

4. Jesperson: Language P.27.

۵۔ بھولا ناتھ تواری: بھاشا وگیان ص ۳۰ طبع چہارم

6. Max Muller: Lectures on the Science of Language P. 37 London 1891.

7. Max Muller: Lectures on the Science of Language P. 39, London 1891.

8. Murray: History fo European Language, Edinburgh, 1923 as referred by Diamond: The History and origin of Language, P 274 Ist ed. 1959.

۹۔ ڈائمنڈ کی محولہ بالا کتاب

10. Sir Richard Pages: Human speech, 1930.

11. E.J Taraporewala: Principles of the Science of Language, P. 46.

☆

ہندوستان کے رسوم الخط

لسانیات کی دنیا میں ہندوستان کہہ کر عظیم تر ہند مراد لیا جاتا ہے جس میں جنوبی ایشیا کے سبھی ممالک شامل ہیں۔ یہاں کی قدیم ترین تہذیب وادی سندھ یعنی موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب ہے۔ مارشل کے مطابق یہ سوا تین ہزار سے لے کر پونے تین ہزار قبل مسیح کی ہے۔ اسی تہذیب کی دین ایک رسم تحریر ہے جسے آج تک پڑھنے میں کما حقہ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ پر اسرار رسم خط ہجائی نہیں تھا نہ اس نے ہندوستان میں فن تحریر کے ارتقا پر کوئی اثر چھوڑا اس لیے ہم نظر انداز کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

آریہ فن تحریر کے پر جوش حامی نہ تھے۔ وہ مذہبی صحیفوں کو ازبر کرنے پر زور دیتے تھے تاکہ ان پر ایک فرقے کی اجارہ داری رہے اور نچلے فرقوں کی ان تک رسائی نہ ہو سکے۔ ہندوستان میں فن تحریر کب سے ملتا ہے اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ رگ وید میں لکھا ہے کہ گایوں کے کانوں پر آٹھ کی گنتی لکھی ہوتی تھی۔ رگ وید کو بعد از بعد ۱۲۰۰ق م کا مانا جاتا ہے۔ اگر رگ وید کے اس اندراج کو پایۂ اعتبار نہ بھی دیا جائے تو چھاندوگیہ اپنشد کی ایک سطر میں اکشر کا لفظ ہے اور تیتریہ اپنشد کے ایک جملے میں صاف صاف ورن، سور اور ماترا کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس سے یقینی ہے کہ اس وقت تک فن تحریر مکمل ہو چکا تھا۔ اپنشدوں کا زمانہ ۸۰۰ق م تا ۶۰۰ق م ہے اور یہی ہندوستان میں تحریر کی بسم اللہ کا عہد ہے۔

ہندوستان کے قدیم ترین رسم خط دو ہیں کھروشٹھی اور براہمی۔ کھروشٹھی عظیم تر ہند کے

شمالی مغربی حصے میں رائج رہی۔ اس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح سے تیسری عیسوی تک کا مانا جا سکتا ہے۔ اس کے قدیم ترین نمونے شہباز گڑھی اور منصورہ میں اشوک کے دو شلا لیکھ ہیں۔ کھروشٹھی کو شمالی سامی کی آرامی شاخ سے ماخوذ کیا جاتا ہے۔ اس رسم خط نے کسی دوسرے خط کو جنم نہیں دیا اس لیے براہمی کے مقابلے میں اس کی اہمیت بہت کم ہے۔

جس طرح یورپ کے تمام خط یونانی سے ماخوذ ہیں اسی طرح ہندوستان کی تمام لپیاں براہمی کی اولاد ہیں۔ اس کا قدیم ترین نمونہ ضلع بستی کے گاؤں پپراوا کے ایک برتن پر اور ضلع اجمیر کے گاؤں بڑلی کے شلا لیکھ پر ملا ہے۔ رائے بہادر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کے مطابق ان کا زمانہ پانچویں صدی ق م کا ہے۔ لیکن دوسروں کے نزدیک کچھ بعد کا ہے۔ دوسرے قدیم نمونے چوتھی صدی ق م کے ملتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں فن تحریر کا آغاز آٹھویں صدی ق م میں ہو گیا ہو تو جب سے چوتھی ق م تک کے تحریری نمونے نہ ملنے کی یہ وجہ ہوتی کہ اس عہد میں بھوج پتر یا تاڑ کے پتوں پر لکھتے تھے جو استداد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اشوک کی لاٹیں زیادہ تر براہمی خط میں ہیں۔ اس کا استعمال چوتھی صدی عیسوی کے وسط تک رہا۔

براہمی صوتی اور ہجائی یعنی الفبائی خط ہے۔ ہجائی حروف یک بیک پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ کسی لفظ نقشی یا رکنی خط ہی سے ارتقا پا سکتے ہیں۔ براہمی کس خط سے نکلی؟ یہ ہندوستان کی ایجاد ہے یا باہر کی ان سوالوں پر غضب کا اختلاف رائے ہے۔ بیشتر علما اسے باہر کے کسی خط سے ماخوذ مانتے ہیں مگر چند ہندوستانی علما اسے ہندالاصل کہنے پر مصر ہیں۔ واضح ہو کہ کھروشٹھی کے بیشتر اور براہمی کے چند نمونے دائیں سے بائیں کو لکھے بھی ملتے ہیں۔

براہمی خط سے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں مختلف اسالیب اور شاخیں رونما ہوئیں۔ براہمی کا اصل زمانہ ۳۵۰ء کے قریب تک کا ہے۔ اس وقت اس کے تین خاص اسلوب تھے۔

۱۔ موریہ اسلوب جو اشوک کی لاٹوں اور شلا لیکھوں پر ملتا ہے۔

۲۔ کلنگ اسلوب جو اجنتا اور ایلیفنٹا کے غاروں میں ملتا ہے۔

۳۔ شنگ اسلوب جو دوسری عیسوی میں گرنار کاٹھیاواڑ میں ملتا ہے۔

براہمی کا وسطی دور چوتھی سے دسویں صدی تک کا ہے جب کہ براہمی کی اولادیں اور موجودہ خطوط کے سورث سامنے آتے ہیں۔ اس عہد میں دو اہم شاخیں گپت اور دولبھی ہیں۔

گپت خط کا تعلق مگدھ کے راجاؤں کے گپت خاندان سے ہے۔ اس خاندان کا پہلا بڑا راجہ چندر گپت اول چوتھی صدی عیسوی میں ہوا ہے اور یہی گپت خط کی ابتدا کا عہد ہے۔ اس سے دو مزید اسالیب ارتقا پذیر ہوئے۔

ا۔ ہمالیائی اسلوب جس سے تبت، نیپال اور آسامی قبیلوں کے کچھ خطوط نکلے۔

ب۔ گپت خط کی مغربی شاخ سے چھٹی صدی میں سدھ ماتر خط اور اس سے ساتویں صدی میں کٹل خط نکلا۔ یہ گیارہویں صدی تک مروج رہا۔ کٹل ہی نے آٹھویں صدی میں ناگری خط کو جنم دیا۔

ولبھی خط چوتھی صدی یا پانچویں صدی عیسوی میں براہمی کے سنگ اسلوب سے نکلا۔ گپت خاندان کے زوال پر کاٹھیاواڑ میں ولبھی راجاؤں کا عروج تھا۔ خط کی طرح ولبھی خط کا مرکز بھی کاٹھیاواڑ ہے۔

چوتھی صدی کے وسط سے براہمی کی دکنی شاخ علیحدہ ہو جاتی ہے۔ ولبھی خط کا دکنی شاخ پر واضح اثر ہے۔

دسویں صدی کے قریب جدید رسوم الخط ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ہم ایک ایک کو لیتے ہیں۔

دیوناگری: کٹل خط سے آٹھویں صدی میں ناگری کا ارتقا ہوا۔ دکن میں اسے نندی ناگری اور شمال میں دیوناگری کہا جاتا ہے۔ گیارہویں صدی تک اس کا شمال میں عام رواج ہو گیا تھا۔ اس میں سنسکرت، ہندی، مراٹھی اور نیپالی زبانیں لکھی جاتی ہیں۔ اس کی ترتیب حروف کسی ماہر صوتیات کی قائم کی ہوئی ہے۔ یہ دنیا کے بقیہ تمام خطوط کی نسبت آوازوں کو زیادہ صحت کے ساتھ ادا کرتا ہے گو یہ بھی ہماری جملہ آوازوں کو صحیح صحیح ظاہر نہیں کرتا۔ اس کا سب سے بڑا غیر سائنسی پہلو مصمتوں کو سارے اور آدھے میں تقسیم

کرتا ہے اور یہ یعنی زبر کے لیے کوئی ماترا نہ دینے کے باعث ہے۔ ساکن مصوتوں کو ادا کرنے کے لیے جو بھانت بھانت کی آدھی شکلیں لکھی جاتی ہیں انھوں نے اس خط کو کافی الجھا دیا ہے۔

ناگری کی شارٹ ہینڈ قسم کی کیتھی یا منڈی ہے جو مہاجنوں کے بھی کھاتے لکھنے کے کام آتی ہے۔ اس میں اوپر کی لکیر اور ماترائیں نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے اسے جو لکھے وہی صحیح پڑھ سکتا ہے۔

بنگلہ: اس کے آغاز کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایس این چکرورتی کے مطابق ساتویں صدی میں گپت خط کی مشرقی اور مغربی دو شاخیں ہو گئیں۔ مشرقی شاخ سے دسویں صدی میں قدیم بنگلہ نکلی۔ اتنا تو واضح ہے کہ بنگلہ اور ناگری کے تمام حروف کی ترتیب یکساں ہے۔ آسامی بھی بنگلہ خط میں لکھی جاتی ہے۔ بنگلہ ہی سے اڑیا اور بہار کے خط میتھلی کیتھی نکلے۔

گجراتی خط قدیم ناگری کی مغربی شاخ سے نکلا۔

اب لیجیے شمال مغرب کے خطوط کو۔

براہمی کی کٹل شاخ سے آٹھویں تا دسویں صدی میں شاردا لپی نکلی۔ یہ کشمیری زبان کی قدیم لپی ہے۔ شاردا سے کشمیر، ہماچل اور پنجاب کے موجودہ خطوط نکلے۔ ان میں ٹکری، لنڈا اور کشتواڑی اہم ہیں۔ ٹکری کو گریرسن شاردا خط کی بہن اور بوہلر شاردا کی بیٹی مانتا ہے۔ ٹکری سے ڈوگری اور چمبیالی خط نکلے۔ لنڈا سے قدیم سندھی اور گرمکھی خط نکلے۔ ٹیلر گرمکھی کو دیوناگری اور گجراتی کی درمیانی منزل قرار دیتا ہے اور جان بیمز اسے کٹل سے براہ راست ماخوذ کرتا ہے۔ لیکن کٹل لپی زیادہ سے زیادہ گیارہویں صدی تک ملتی ہے اور گرمکھی کئی صدی بعد کی ہے اس لیے اسے شاردا سے ماخوذ کرنا ہی صحیح ہے۔

اب دکنی لپیوں کی داستان سنیے۔ ۳۰۰ ق م ہی سے دکن میں براہمی کے کتبے ملنے لگتے ہیں۔ ان میں ابتدائی کلنگ خط اور ابتدائی آندھرا خط قابل ذکر ہیں۔ ان سے دوسری اور چوتھی

صدی عیسوی کے بیچ جو خط نکلے انھوں نے موجودہ دکنی لپیوں کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔

پیچھے کاٹھیاواڑ کے ولبھی خط کا ذکر آ چکا ہے اس سے چالوکیہ خط نکلا جو چھٹی صدی عیسوی میں شروع ہونے والے چالوکیہ خاندان سے متعلق ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں ضلع امراوتی میں چالوکیہ خط کے جو شیلا لیکھ ملتے ہیں انھیں کرشنا خط کہا جاتا ہے۔ اسی کرشنا خط سے تیلگو کنٹر خط ارتقا پایا۔ واضح ہو کہ تیلگو اور کنٹر ایک ہی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

گرنتھ خط: چونکہ تامل زبان میں بہت کم آوازیں ہیں اور اس کے خط میں بہت کم حروف ہیں اس لیے یہ خط سنسکرت صحیفوں کے ڈھب کا نہ تھا۔ تامل برہمنوں نے اپنے مقدس کتابیں لکھنے کے لیے پانچویں صدی میں گرنتھ خط کا استعمال کیا جو براہمی کی دکنی شاخ سے نکلا ہے۔ اس کے چار ادوار ہوئے ہیں۔ قدیم گرنتھ سے جدید گرنتھ خط چودھویں پندرھویں صدی میں ظاہر ہوا۔

وٹ لتو خط: وٹ لتو کے معنی ہیں مدور خط اور اس کے حروف گول ہوتے ہیں۔

تامل خط: بوہلر کے مطابق چوتھی یا پانچویں صدی میں یہ خط براہ راست براہمی کی جنوبی شاخ سے نکلا اور بعد میں گرنتھ خط سے متاثر ہوا لیکن برنیل کے بقول یہ گرنتھ خط سے نکلا ہے۔ اس کے آخری چار حروف وٹ لتو سے لیے گئے ہیں۔ پندرھویں صدی تک موجودہ تامل خط مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں دیوناگری کے مقابلے میں بہت کم حروف ہیں۔

نویں دسویں صدی میں گرنتھ خط سے تلو ملیالم خط نکلے۔ تلو خط خوشنما ہے۔ ملیالم خط بے ڈھنگا۔ سترھویں صدی سے ملیالم لکھنے کے لیے وٹ لتو کی جگہ یہ استعمال ہونے لگا۔ موجودہ ملیالم خط بے شک گرنتھ خط سے نکلا ہے لیکن وٹ لتو اور تامل خط سے بھی متاثر ہے۔

کچھ ایسے رسوم خط بھی ہیں جو براہمی کی وسیع قلم رو سے باہر ہیں۔ یہ ہیں عربی فارسی سے ارتقا یافتہ خط جو پشتو، بلوچی، سندھی، پنجابی، کشمیری اور اردو کے لیے استعمال ہوئے۔ پشتو اور بلوچی ایرانی زبانیں ہیں۔ اردو کے لیے فارسی خط میں کچھ نشانات کا اضافہ کیا گیا۔ سندھی میں

نشانات کی تعداد اردو سے بھی زیادہ ہے۔ وہاں کئی حروف چار نقطوں کی مدد سے لکھے جاتے ہیں۔ پنجابی کو سکھ گرمکھی میں لکھتے ہیں اور مسلمان اردو خط میں۔ کشمیری کے لیے بھی اب شاردا خط کے بجائے اردو خط ہی کا استعمال ہونے لگا ہے۔

اس جائزے سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان رسوم الخط کی جنت ہے۔ تمام سفید اقوام کے پاس اتنے رسوم الخط نہیں جتنے تنہا ہندوستان میں ہیں۔ سنسکرت زبان نے صرف ہند آریائی زبانوں کو جنم دیا لیکن براہمی خط نے نہ صرف ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں کے خطوط فراہم کیے بلکہ تبتی، برمی، سنگھالی، ہند چینی، جاوائی اور فلپینی زبان تک کو اپنے ہی روپ دیے۔ غرضکہ رسم الخط کا مطالعہ عظیم تر ہندوستان کی وحدت رفتہ کی دل کش داستان ہے۔

☆

اردو کی ہکاری آوازیں اور حروف

اس مضمون کا ارتقا کئی منزلوں میں ہوا ہے۔ رسالہ آہنگ گیا بابت ستمبر ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا مضمون ''دو چشمی ہے'' شائع ہوا۔ اس میں اس موضوع سے متعلق اہل صوتیات کے بیانات پر طنز تھا۔ میں نے اس کا مختصر جواب لکھ کر رسالہ آہنگ کو بھیج دیا۔ آہنگ بند ہو گیا تو میں نے اس کی نقل رسالہ شاعر بمبئی کو اشاعت کے لیے بھیج دی۔ ڈاکٹر ابو محمد میرے پرانے دوست اور کرم فرما ہیں وہ املا اور رسم الخط کے موضوع پر غور و خوض کر کے لکھ رہے ہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے جوابی مضمون کا لہجہ درشت تھا۔ میں نے رسالہ شاعر کو لکھ دیا کہ مضمون شائع نہ کریں۔ آہنگ کو نہ لکھا کیوں کہ وہ بند ہو گیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد یکا یک پرچہ دوبارہ جاری ہو گیا اور اس کے اکتوبر ۸۶ء کے پرچے میں میرا مضمون ہائے مخلوط چھپ گیا۔ مجھے افسوس ہوا میں نے ڈاکٹر سحر کو معذرت کا خط لکھا اور آہنگ کو معذرتی مراسلہ کہ اسے شائع کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے آہنگ پھر دم توڑ گیا ہے۔

اس اثنا میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کے بعض مضامین اور دوسروں کی تحریریں پڑھ کر میں نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون ''اردو کے ہائیہ حروف'' نخلستان، جے پور بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء تا مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی نے املا و رسم الخط پر ایک سیمینار کیا اس کے لیے میں نے نخلستان والے مضمون کی ابتدا و انتہا میں بہت کچھ اضافہ و ترمیم کے ساتھ ایک مضمون ''اردو کے ہکاری حروف'' لکھا اور وہاں پڑھا۔ یہ اس مضمون کی تیسری جون ہوئی۔ سیمینار میں اس موضوع پر دوسروں کے تبصرے سنے۔ اس کے بعد بھی بہتوں کا نقطہ

نظر واضح نہ ہوا۔ بعد میں مراسلت کے ذریعہ ان کے خیالات معلوم کیے۔ ان سب کی روشنی میں سیمینار والے مضمون کو نئی ترتیب اور ترمیم کے ساتھ آخری شکل دی۔ آئندہ اس موضوع پر مزید کچھ نہیں لکھنا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ مضمون کے سابق نقوش کو نظر انداز کر کے صرف موجودہ تحریر کو معتبر مانا جائے۔

ہ (ہائے ہوز) کی آواز حلقوم سے نکلنے والی صفیری آواز ہے جسے ادا کرنے میں اعضائے نطق کو دوسرے تمام مصمتوں کی نسبت کم محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسی کی شکل ہکاریت (Aspiration) ہے جس میں بعض مصمتوں کو ادا کرتے وقت معمول سے زیادہ ہوا کا اخراج کیا جاتا ہے پہلی ہے کو ہائے ملفوظی اور دوسری کو ہائے مخلوط کہتے ہیں۔ بمبئی میں رشید حسن خان نے مجھے یہ معرکے کی بات بتائی کہ کتابت کا یہ فرق فورٹ ولیم کالج میں طے کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۰۱ء کی میر امن کی تحریر میں اس کا خیال رکھا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جا کر عام طور پر یہ رواج ہو گیا کہ ہائے مخلوط کو محض دو چشمی ھ سے لکھا جانے لگا اور دو چشمی ھ کا استعمال ہائے ملفوظی کے لیے ممنوع ٹھہرا۔ رشید حسن خان نے اپنی عالمانہ کتاب ''اردو املا'' (دلی ۱۹۷۴ء) میں ذوق کے اس دلچسپ شعر کی طرف توجہ دلائی۔

ہائے رے حسرتِ دیدار، مری ہائے کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے (۱)

ذوق کے اس مشاہدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں بھی ہائے ملفوظی کو دو چشمی ھ سے لکھنا غیر معمولی صورت حال تھی۔ اب کوئی کاتب ایسا نہیں کرتا۔ دو چشمی ھ والی آوازوں کو لسانیات میں ہکاری آوازیں کہتے ہیں ''ہکاریت'' خوشگوار ترجمہ نہیں عربی (ہ) پر ہندی (کار) اور پھر فارسی (یت) کا لاحقہ لگایا گیا ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا یہ اصطلاح ہندی سے لی گئی ہے لیکن اہل ہندی سے معلوم ہوا کہ وہ اس سے واقف نہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ہائیت اور ہائیے کی اصطلاح استعمال کی ہے، ۱۵ مارچ ۱۹۸۶ء کے ہماری زبان میں پاکستان کی اصطلاحات املا پر ایک مضمون آیا اس سے معلوم ہوا کہ وہاں انھیں مخلوس آوازیں

اور تنفیس کہتے ہیں۔ یہ بہتر اصطلاحیں ہیں۔ لیکن اب ہمیں ترقی اردو بورڈ دلی کی اصطلاحوں کو قبول کرنا ہوگا۔

اس مضمون میں ہائے ملفوظی خارج از بحث ہے، صرف ہکاری آوازوں اور ہائے مخلوط والے حرفوں کا تعین کرنا ہے۔ ہندی میں دس ہکاری مصمتے مشہور ہیں۔ دیکھنا ہے کہ ہم انھیں پر اکتفا کریں یا چند اور ہکاری حروف کی شناخت کریں۔ آگے بڑھنے سے پہلے اردو کی جدی زبانوں میں ہکاری مصمتوں اور حروف پر ایک نظر ڈالنا مفید ہوگا۔

ہند یورپی: ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"دس ہائیے قدیم ہیں جو قدیم ہند یورپی میں بھی تھے" (۲)

مجھے اس بیان کی صحت میں شبہ ہے کیوں کہ سرسوتی سرن کیف نے اپنی انگریزی کتاب میں ہند جرمنی (ہند یورپی) میں حسب ذیل ہکاری مصمتے گنائے ہیں۔

۱۔ قھ (لہاتی یعنی منہ کے کوے سے ادا ہونے والا)

۲،۳۔ دو قسم کے کھ (ایک غشائی دوسرا تالوئی یعنی ایک تالو کے پچھلے حصے اور دوسرا اگلے حصے سے ادا ہونے والا)

۴،۵،۶۔ تین قسم کے گھ (ایک لہاتی، دوسرا غشائی، تیسرا تالوئی)

۷ تھ، ۸ دھ، ۹ پھ، ۱۰ بھ (۳)

ظاہر ہے یہ سنسکرت کے دس قدیم ہائیے نہیں۔

اوستائی اور یونانی۔ اردو کی حد تک یہ دونوں غیر متعلق ہیں لیکن دلچسپی اور معلومات کی خاطر ان کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، ڈاکٹر شیام سندر داس نے اپنی کتاب میں اوستائی آوازوں کی تفصیل دی ہے (ص ۱۴۰۔ ۱۴۳) ان میں کھ، گھ، پھ، تو ہماری آوازوں جیسے ہیں۔ تھ میں قدرے فرق معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مندرجہ بالا مضمون کے مطابق اوستا نے ہند، یورپی کے پانچ ہکاری مصمتے برقرار رکھے۔ کھ، گھ، تھ، دھ، پھ، شیام سندر داس نے دھ کی جگہ (ہندی لفظ) لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے یہ ہکاری مصمتہ نہیں۔ ممکن ہے (ذ) ہو۔ تھ

کے علاوہ ہند یورپی میں تھے ہی یہ پانچ ہکاری مصمتے ، سبزواری کے مطابق یونانی میں صرف تین ہائیے تھے، کھ، تھ، بھ، (مضمون ص ۵۳)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج انگریزی میں لفظ کی ابتدا میں صرف p, t, k کو قدرے ہکاری کر کے بولا جاتا ہے۔ گویا یونانی نے ہند، یورپی کے محض غیر مصمتی ہکاری، مصمتے لیے، مصمتی ہکاریے نہیں۔

ویدک بھاشا: ڈاکٹر شیام سندر داس نے اپنی ہندی کتاب میں ویدک بھاشا میں حسب ذیل ہکاری مصمتے بیان کیے ہیں۔

کھ، گھ، چھ، جھ، ڈھ، لھ، تھ، دھ، پھ، بھ (۴)

گویا ہندی کے دس بنیادی ہکاری مصمتوں میں ایک (لھ) کا اضافہ کیا ہے۔

سنسکرت، رشی پانینی پانچویں، چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوئے ہیں۔ وہ بہت بڑے قواعد دان اور ماہر لسانیات تھے۔ انھوں نے اپنے ۱۴ شوسوتروں میں سنسکرت کے جملہ مصوتوں اور مصمتوں کی طرح طرح سے گروہ بندی کی ہے۔ ڈاکٹر شیام سندر داس نے اپنی کتاب بھاشا وگیان میں یہ ۱۴ سوتر دیے ہیں (ص ۱۵۱۔۱۴۹) ان میں سے سوتر نمبر ۹۸، ۱۱ میں ہکاری مصمتے ہیں جو ہندی کے دس مشہور ہکاری مصمتے ہیں۔ ڈاکٹر بابورام سکسینہ نے بھی سنسکرت میں یہی دس ہکاری مصمتے مانے ہیں۔ (۵) وہ مزید لکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ک، گ وغیرہ کا ایک غیر ہکاری تلفظ تھا، دوسرا قدرے زیادہ تنفس کے ساتھ جیسے انگریزی ابتدائی 'k' کھ ہو جاتا ہے۔ سنسکرت میں یہ ہکارت نحیف تھی، بعد کی زبانوں میں بڑھ کر کھ، گھ، کی شکل اختیار کر لی۔

سرسوتی سرن نے اپنی انگریزی کتاب میں سنسکرت میں وہی دس ہکاری مصمتے تسلیم کیے ہیں (ص ۴۸)

پالی: ڈاکٹر شیام سندر داس کے مطابق پالی میں سنسکرت کی دس ہکاری آوازیں محفوظ رہیں ان پر اضافہ ہوا (ڑھ) کا۔ (ڑ) (ڑھ) پہلی بار پالی میں رونما ہوئے ہیں۔ اس طرح پالی میں ۱۱ ہکاری مصمتے ہیں (ص ۱۵۲)

بمبئی کے سیمینار میں مرزا خلیل احمد بیگ نے کسی کے حوالے سے کہا کہ ڑ، ڑھ کی آوازیں

بہت بعد کی ہیں یعنی جدید ہند آریائی ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ بابو شیام سندر داس سنسکرت کے بھی عالم ہیں، لسانیات کے بھی، میں ان کے قول کو غلط نہیں مان سکتا، پھر بھی میں نے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر اشوک کیلکر کو لکھ کر پوچھا، انھوں نے میرے نام مکتوب مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء میں لکھا کہ ویدک بھاشا میں ڈ، ڈھ کے علاوہ معکوسی ل اور معکوسی لھ موجود تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ان کے بیچ کی آوازیں، ڑ، ڑھ، بھی رہی ہوں گی جن کی حیثیت ہم صوت (ایلوفون) کی رہی ہوگی، صوتیے کی نہیں۔ اسی لیے اسے رسم الخط میں نہیں دکھایا گیا۔

گویا ویدک اور سنسکرت دور میں ڑھ کی آواز بولی جاتی ہوگی۔ لیکن رسم الخط میں پہلی بار پالی میں سامنے آئی ہے۔

شورسینی پراکرت: شیام سندر داس کے مطابق اس میں پالی کے جملہ ہکاری مصمتے بہ شمول، ڑھ، ملتے ہیں (ص ۱۵۲)

شورسینی اپ بھرنش: اس میں ۱۲ ہکاری مصمتے تھے۔ دس بنیادی مصمتوں میں محض تو ہیں، دھ، نہیں ان میں شامل کیجیے حسب ذیل تین ڑھ، بین دندانی مھ، دولبی مھ (شیام سندر داس ص ۱۵۳)

کھڑی بولی اگر شورسینی اپ بھرنش سے نہیں نکلی بلکہ اس کے پڑوس کی کسی دوسری اپ بھرنش سے نکلی ہے تو بہ گمان غالب اس میں بھی یہی ہکاری مصمتے رہے ہوں گے۔

ہندی۔ کیلاگ کی انگریزی کتاب ''اے گرامر آف دی ہندی لینگویج'' انیسویں صدی کے نصف دوم میں لکھی گئی اس وقت میرے پیش نظر نہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کے مطابق اس میں ہندی میں دس ہکاری مصمتوں کے علاوہ ذیل کی چھے آوازیں مزید ہیں۔

نھ، مھ، لھ، رھ، ںھ، وھ

انھیں کیلاگ نے معطوفی مصمتے قرار دیا ہے (٦)

ہندی رسم الخط میں محض دس ہکاری حروف ہیں جو یہ ہیں۔

کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، تھ، دھ، پھ، بھ۔

لیکن ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری نے اپنی بھاشا وگیان، میں لکھا ہے ''علما نے مانا ہے کہ ہکاریت بندشی مصمتوں ہی میں ہوتی ہے، یہ ماننا مناسب نہیں۔ صفیری آوازوں کے علاوہ بھی قسموں کے مصمتوں کے غیر ہکاری اور ہکاری روپ ہو سکتے ہیں جیسے نھ، رھ، لھ، ڑھ، چھ وغیرہ صفیری آوازوں میں یہ امتیاز نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ہوا کے زور دار بہاؤ کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ سب ہکاری ہوتے ہیں ہکاریت کی بنا پر ہم ہندی میں یہ ہکاری مصمتے رکھ سکتے ہیں۔

کھ، گھ، چھ، جھ، ٹھ، ڈھ، تھ، دھ، تھ، پھ، بھ، مھ، لھ، رھ، ڑھ۔ (۷)

اس طرح انھوں نے ہندی میں ۱۵ ہکاری مصمتوں کی شناخت کی ہے، دس قدیم مصمتوں کے علاوہ لھ، مھ، نھ، رھ، ڑھ، انھوں نے یھ، وھ کے حق میں شہادت نہیں دی۔

اب تاریخی ترتیب سے ایک مستشرق اور چند اہل اردو کے بیانات ملاحظہ ہوں۔ ان میں سے بعض نے حروف کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی تعین اصوات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

انشا: انشا کی دریائے لطافت ۱۲۲۲ھ میں مکمل ہوئی، ڈاکٹر عابد پیشاوری کے مطابق اس میں انشا نے اردو میں ۱۷ ہکاری مصمتے شمار کرائے ہیں۔ (۸)

دس قدیم مصمتوں کے علاوہ سات یہ ہیں۔

رھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ

پلیٹس: انشا کے بعد ۱۸۸۴ء میں پلیٹس نے اپنی اردو انگریزی لغت میں ۱۱ ہائیوں کا ذکر کیا ہے (مقدمہ ص ۷) ان میں دس قدیمی ہائیوں کے علاوہ 'ڑھ' بھی شامل ہے۔

اسماعیل میرٹھی: اسماعیل میرٹھی نے ۱۸۹۲ء میں اپنا قاعدہ شائع کیا۔ (۹) انھوں نے بھی پلیٹس کے ۱۱ ہائیوں کو تسلیم کیا۔ (۱۰) ممکن ہے انھیں پلیٹس ہی سے تحریک ملی ہو۔

عبدالحق: مولوی عبدالحق کی قواعد اردو آزادی سے قبل کی کتاب ہے۔ اس وقت ۱۹۸۶ء کا ایڈیشن پیش نظر ہے۔ انھوں نے اول دس کے بجائے ۱۱ سادہ ہکاری آوازوں کا ذکر کیا جن میں دس قدیم ہندی مصمتوں کے علاوہ 'ڑھ' کو بھی شامل کر لیا ہے۔ ان کے علاوہ

چار مزید رھ، لھ، مھ، نھ، کا ذکر کیا گیا گویا دس قدیم مصمتوں کے ساتھ پانچ مزید کو شامل کر کے ۱۵ ہکاری آوازوں کو اردو کے حروف تہجی میں شامل کرنے کی سفارش کی جس سے اردو میں کل پچاس حروف تہجی ہو گئے۔ (۱۱)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں: ان کا انگریزی رسالہ A Phonetic and phonological study of the word in Urdu سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ہکاری آوازوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمرے میں دس قدیم مصمتے نیز ڑھ ہیں۔ دوسرے میں وہ چھے جن کا ذکر کیلاگ نے کیا ہے یعنی نھ، مھ، لھ، رھ، یھ، وھ، لکھتے ہیں کہ موخر الذکر میں ہائیت لفظ کے ایک بڑے جزو پر پھیلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ عام 'ہ' کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے۔ (۱۲)

ان کے دو پرانے مضمون ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے مرتبہ مجموعے "اردو میں لسانیاتی تحقیق" (بمبئی ۱۹۷۱ء) میں شامل ہے۔ اپنے مضمون "اردو حروف تہجی کی صوتیاتی ترتیب" میں ان حروف کو دیوناگری رسم الخط نیز "بین الاقوامی صوتیات" کے اصولوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا ہے۔ ان کے چارٹ میں ۱۱ ہکاری حروف ہیں، دس قدیمی ہائیے گیارھواں ڑھ۔ اس کے بعد نوٹ دیتے ہیں۔

"یہ ترتیب دیوناگری رسم الخط کو سامنے رکھ کر گئی ہے جو ترتیب کے اعتبار سے مکمل رسم الخط ہے۔" (ص ۳۹)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ اس فہرست میں نھ، لھ، اور مھ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن انھیں شامل نہ کرنے کی دو خفیف وجوہ دیتے ہیں، پہلی یہ کہ ان آوازوں سے گنتی کے لفظ بنتے ہیں، دوسری یہ کہ دلھن اور دلہن کا تلفظ متعین بھی نہیں (ص ۴۲۔ ۴۱) ان کا دسرا مضمون اردو صوتیات کا خاکہ بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں صرف گیارہ ہکاری مصمتے تسلیم کیے ہیں دس قدیمی مصمتے نیز 'ڑھ' (ص ۸) گویا یہی ان کا آخری فیصلہ ہے، 'ڑھ' کے شمول کے بارے میں آگے بحث کی جائے گی۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور گیان چند۔ ان تینوں کے نظریات کو ایک ساتھ درج کیا جاتا ہے کیوں کہ تینوں کی تحریریں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں ساگر میں لسانیات کا موسم گرما کا کورس پڑھا۔ نئی نئی لسانیات پڑھی تھی، نمود کے لیے اپنی قلیل متاع کے ساتھ (جو ہنوز اسی طرح قلیل ہے) دھڑا دھڑ صوتیات کے موضوع پر لکھنے لگا۔ میں نے نقوش جولائی ۱۹۶۲ء میں ایک مضمون ''اردو کی اصوات اور صوتیے'' شائع کیا اس میں دس قدیم ہکاری آوازوں کو مفرد آواز نیز صوتیہ قرار دیا (ص ۴۰) جب کہ ڑھ، نھ، لھ، رھ، ڑھ کو مرکب۔ ان پانچوں ہائیوں کے علاوہ بولی میں مزید تین ہائیوں کا ذکر کیا ذھ یا زھ (مذہب) یھ (یہاں) دھ (وہاں)۔ جیسا کہ آگے واضح ہوگا میرے تجزیے میں بار بار تبدیلی ہوئی ہے لیکن دس قدیمی ہکاریوں کو مفرد آواز ماننے کا خیال کبھی ترک نہیں کیا۔

میرے مضمون سے تحریک پا کر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے نقوش، ۱۹۶۳ء میں اپنے مضمون، اردو کی ہائیہ آوازیں، میں لکھا کہ اردو کی ہائیہ اصوات وحروف ۱۷ ہیں جن میں سے دس قدیم ہیں اور ذیل کی سات آوازیں بعد کی پیداوار ہیں۔

رھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ،

ان کے مطابق پہلے دس کو مفرد آوازیں اور مستقل صوتیے کی حیثیت دینے کا خیال سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں امیش چندر سین نے ظاہر کیا (ملاحظہ ہو صوتیاتی علوم کی دوسری بین الاقوامی کانفرنس لندن کی روداد) دس ہائیوں کو مفرد اور سات ہائیوں کو مرکب ماننے پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

''میں اسے ناگری تحریر اور اس سے ماخوذ خطوط کا اثر سمجھتا ہوں اس کا ایک واضح اور قرین قیاس قرینہ ان میں سے بعض اہل علم کا قدیم وجدید ہائیوں میں فرق کرنا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند سنسکرت کے قدیم ہائیوں کو جن کی دیوناگری میں مستقل اور آزاد شکلیں ہیں، مفرد آواز مانتے ہیں۔ بقیہ کی ناگری میں کوئی خاص شکل نہیں یہ ان کے نزدیک مرکب اور مخلوط ہیں''۔ (ص ۵۰)

انھوں نے اپنے مضمون میں زور دے کر یہی کہا کہ سنسکرت کے دس قدیم ہائیے بھی مخلوط

اور مرکب آوازیں ہیں جو ایک بندشی مصمتے اور ھ کے امتزاج سے بنی ہیں۔ وہ قدیم اور جدید ہائیوں میں کوئی فرق نہیں پاتے۔ لکھتے ہیں کہ اگر قدیم ہائے ایک کوشش اور جھٹکے میں ادا ہوتے ہیں تو جدید ہائے بھی صرف ایک کوشش اور ایک جھٹکے میں ادا ہوتے ہیں (ص ۵۳) ایک کوشش میں ادا ہونے والی آوازوں کو مخلوط ماننا ڈاکٹر شوکت سبزواری ہی کا کام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سامعہ نازک صوتیاتی فرق کی گرفت نہیں کر پاتا تھا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کتابچہ "اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو" جولائی ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں ص ۲۵ پر انھوں نے دس قدیم ہائیوں کو اردو میں فونیم کا درجہ دیا ہے ان کے علاوہ کسی دوسرے ہائیے کو تسلیم نہیں کیا۔ بعد میں انھوں نے ان کی فونیمی حیثیت سے رجوع کیا۔ اردو نامے میں ایک مضمون لکھتے ہیں۔

"اردو رسم الخط میں ہکار آوازوں کو چوں کہ سادہ آوازوں کی علامت میں ہائے دوچشمی کے اضافے سے لکھا جاتا ہے: ب اور ھ، بھ، د اور ھ، دھ، اس لیے انھیں مرکب آوازیں سمجھنے کی غلط فہمی افسوس ناک حد تک عام ہے حالاں کہ یہ اعضائے صوت کی ایک ہی جنبش سے ادا ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت مرکب آوازوں کی نہیں بلکہ مفرد آوازوں کی ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں ان کی مفرد حیثیت تسلیم کی گئی ہے اور ان کے لیے الگ سے علامات مقرر ہیں۔ اردو میں ایسا نہیں ہے" (۱۳)

وہ آگے لکھتے ہیں کہ ل، م، ن، ر، ڑ اور عوامی بول چال میں ی، و، ز، میں انضمام جزوی ہے ہائے مخلوط کامل، ہائے مخلوط جزوی اور ہائے ملفوظی تینوں 'ایک فونیم' "ہ" کی ذیلی آوازیں ہیں۔

اس کے جواب میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۱۵ بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء میں ایک جوابی مضمون "اردو کے صوتیے" لکھا اس میں کہا۔

اردو میں، م، ن، ر، ڑ وغیرہ کے ساتھ (ہ) کی آمیزش ہوتی ہے جیسے پڑھ، ننھا وغیرہ لیکن چوں کہ یہ آمیزش سنسکرت میں نہیں اور دیوناگری حروف میں ان کے لیے الگ سے علامات

وضع نہیں، اس لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان میں اور سنسکرت کے ہائیوں میں فرق کر کے فرماتے ہیں وہاں انضمام کامل ہے یہاں جزوی۔

انضمام دونوں میں یکساں ہے، جس طرح "بھ" میں "ھ" کی آواز مصمتے کے بعد "جڑواں حالت میں اور کسی حد تک پہلی آواز میں ضم" ہوگئی ہے ٹھیک اسی طرح (نھ) میں (ہ) کی آواز (ن) میں منضم یعنی ملی ہوئی ہے، آج تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو ان دونوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز دکھائے اور یہ بتائے کہ (بھ) میں انضمام کامل ہے اور (نھ) میں ناقص" (ص ٧٦)۔

حقیقت یہ ہے کہ شوکت سبزواری کی تاریخی لسانیات میں نظر تھی لیکن صوتیات میں ان کا مطالعہ ناقص تھا۔ مندرجہ بالا مضمون میں جب وہ الم، علم، عام، آم، ہال، حال، کے جوڑوں کی بناء پر ع، ح، وغیرہ کو صوتیے کی حیثیت دیتے ہیں (ص ٧٣) تو یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ وہ فونیمیات کی ابجد بھی نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے کہاں صوتیات کا درس لیا تھا کہ صوتیاتی مشینوں کے بارے میں ایسا بلند بانگ دعویٰ کر دیا۔ انسانی نطق اور سامعہ دھوکا دے سکتا اور دھوکا کھا سکتا ہے لیکن آوازوں کی ایسی کوئی نازک سے نازک خصوصیت نہیں جو مشین کی گرفت میں نہ آ سکے۔

ڈاکٹر نارنگ نے شوکت سبزواری کے جواب الجواب میں اردو نامہ، شمارہ ۲۵، بابت ستمبر ۱۹۶۶ء میں "اردو کی آوازیں" کے عنوان سے مضمون لکھا اس میں انھوں نے واضح کیا۔

"ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ اصرار بالکل غلط ہے کہ بھ، پھ، اور ڑھ، نھ، میں انضمام یکساں ہے۔ ایسا کہہ کر وہ قاری کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں مودبانہ عرض ہے کہ ایسی مشین واقعی ایجاد ہو چکی ہے جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بھ، پھ، میں انضمام کامل ہے اور نھ، ڑھ میں ناقص۔ اس مشین کا نام سپکٹروگراف (Spectrograph) ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ماہرین لسانیات کے نزدیک (ہ) کا انضمام کامل صرف بندشی آوازوں کے ساتھ ہو سکتا ہے اور ن، ڑ کے بارے میں شوکت سبزواری صاحب کو بھی معلوم ہے کہ یہ بندشی آوازیں

نہیں۔ ناگری کے بارے میں بھی انھوں نے میرے بیان کو غلط طور پر پیش کیا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ اردو سنسکرت یا ناگری کی پابند نہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں ناگری اور اردو میں کہیں سبب اور نتیجے کا رشتہ قائم نہیں کیا۔

بمبئی کے دسمبر ۱۹۸۶ء کے سیمینار میں ڈاکٹر نارنگ نے انکشاف کیا کہ انھوں نے امریکہ میں صوتیاتی لیبارٹری میں سپکٹروگراف میں مختلف ہکاری آوازوں کا فوٹو لیا۔ دس ہکاری مصمتوں میں ہکاریت کا عکس آواز کے شروع ہی سے چھا جاتا تھا جب کہ بقیہ ہکاری مصمتوں میں ہکاریت کا عکس آواز کے وسط سے شروع ہوتا تھا۔ اس طرح حتمی فیصلہ ہو گیا۔

میں نے مئی ۱۹۶۲ء میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں گرمائی لسانیات اسکول میں درس لیا جہاں دو اساتذہ ڈاکٹر اشوک کیلکر اور ڈاکٹر سبرامنیم کے ساتھ کئی طویل نشستوں میں اردو کے آوازوں کے تجزیے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی دلی یونیورسٹی کے رسالے اردوئے معلی، لسانیات نمبر میں ڈاکٹر نارنگ کا مضمون نظر سے گزرا۔ میں نے ان کا تجزیہ قبول کر لیا اور ہائے مخلوط کی دس آوازوں کی فونیمی حیثیت ختم کر دی، میرا ترمیمی موقف میرے مضمون "اردو کی آوازیں" (اردو ادب) شمارہ، ۴۵، ۱۹۶۱ء ص ۵۶) میں دیا ہے۔ گو اس پرچہ میں سند اشاعت ۱۹۶۱ء چھپا ہے لیکن یہ بہت بعد میں آیا ہوگا کیوں کہ میں نے اس میں اپنے نقوش جولائی ۱۹۶۲ء کے مضمون کا ذکر کر کے اس سے رجوع کیا ہے۔ اس میں میرا موقف وہی ہے جو ڈاکٹر نارنگ کا اردو نامہ شمارہ، ۱۳ بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ء کے مضمون میں ہے۔ میں نے ترمیم شدہ تجزیے کو ایک بار پھر اپنے مضمون "اردو کا صوتی تجزیہ" (لسانی مطالعے، دہلی ۱۹۷۳ء) ص ۹۰۔۹۱ پر پیش کیا ہے۔ وہاں ان آوازوں کی ہکاریت کو محض ایک امتیازی وصف قرار دیا ہے جیسے کہ غنائیت ہوتی ہے۔

اب ذرا، ڑھ، پر بطور خاص غور کیا جائے پلیٹس اور اسماعیل میرٹھی نے دس قدیم ہائیوں کے ساتھ ڑ، کو شامل کیا تو کیا لیکن حیرت اس پر ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی ان کی تائید و تقلید میں ایسا کیا۔ جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ثابت کر چکے ہیں

کہ دس ہندی ہائیوں میں ہکاریت کا انضمام کامل ہے بقیہ پانچ یا سات میں بہ شمول، ڑھ، جزوی ہے۔ خود ڈاکٹر مسعود حسین خان ڑھ کی فونیمی حیثیت سے شد و مد سے انکاری ہیں۔ مقدمۂ تاریخ زبان اردو میں چارٹ بنا کر ڈھ اور ڑھ کو ایک فونیم کی ذیلی آوازیں قرار دے چکے ہیں (۱۴) مصمتوں کے اپنے چارٹ میں یا تو انہیں محض دس ہکاری مصمتوں درج کرنے چاہئیں تھے جنھیں بہت سے حضرات فونیم مانتے ہیں یا فونیم کو نظر انداز کر کے ۱۵ یا ہکاری مصمتوں کو شامل کر دیتے۔ جزوی ہکاری مصمتوں میں سے محض ڑھ کو چن لینا سمجھ میں نہیں آتا۔ یقیناً یہ اسماعیل میرٹھی اور مولوی عبدالحق کے زیرِ اثر کیا گیا ہوگا۔

بمبئی کے سیمینار میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ریڈر شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی نے دعویٰ کیا کہ ڑھ، اردو میں فونیم ہے کیوں کہ 'بڑا' اور 'بڑھا' جیسا اقلی جوڑا ملتا ہے اس سلسلے میں میرے دو معروضات ہیں۔

۱۔ کسی آواز کو فونیم کا درجہ دینے سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ مفرد آواز ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اسپکٹروگراف سے یہ طے کیا کہ ڈھ میں ڑ اور ہکاریت کا انضمام جزوی ہے یعنی یہ دو نہ سہی کم از کم ڈیڑھ آواز کے برابر ہے۔ اب کوئی دوسرا بڑا ماہر صوتیات لیبارٹری میں تجزیہ کر کے طے کرے کہ ڑھ بھی ڈھ کی طرح مفرد آواز ہے تو میں اس فیصلے کو قبول کر لوں گا۔

۲۔ اگر ڑھ کو مفرد آواز مان کر فونیم کا درجہ دیتے ہیں تو نہ صرف دس قدیمی ہائیوں کو بلکہ دوسرے پانچ جزوی ہکاریت والے مصمتوں کو بھی اس اعزاز سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ فونیمی حیثیت دینے کے لیے اقلی جوڑا حتمی ہوتا ہے لیکن یہ اگر نہ ملے تو مماثل جوڑا بھی کام دے جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دو آوازیں مماثل ماحول میں آ کر مختلف معنی دیتی ہیں۔ اب کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

مھ: اس کا تضاد کمہار اور کمار میں ہے۔ جس منطق کے تحت بڑا اور بڑھا کے سبب ڑھ کو فونیم کہا جا رہا ہے اسی منطق سے مھ بھی فونیم ہو جائے گا۔

لھ: آلھا اور آلہ کا اقلی جوڑا ملتا ہے۔ مماثل جوڑے کی مثال حسب ذیل ہے: گھر گھر ہیں دیالے چولھے۔ نئل گاڑی میں بدن کی چولیس مل گئیں۔

نھ: مغربی یوپی میں گنگا اشنان کے میلے کو عام بول چال میں 'نھان' کہتے ہیں 'نہان' کہنا بڑا تکلف ہے۔ گڑھ مکتیشور کے نھان کے میلے کا تضاد نان سے ہو سکتا ہے۔ مزید دیکھیے،

جن کی جمع جنوں سے تضاد جنھوں نے تمھیں تکلیف پہنچائی ان پر لعنت۔

جنوں نے تمھیں تکلیف پہنچائی ان پر لعنت۔

رھ سرھانا۔ ڈور کا سرا نا ملا۔

لیکن میں نہ لھ، مھ، نھ، رھ کو فونیمی حیثیت دینے کے حق میں ہوں نہ 'ڑھ' کو کیوں کہ میری ناقص رائے میں اردو میں ۱۱، ۱۵ یا ۱۶ فونیموں کے اضافے کی کوئی ضرورت نہیں۔

رشید حسن خاں۔ رشید حسن خاں کی عظیم عالمانہ کتاب، اردو املا، مئی ۱۹۷۴ء میں ترقی اردو بورڈ سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے ہائے مخلوط کے مسئلے پر بڑی ہوش مندی اور سلامت الطبعی سے نظر ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں۔

''صوتیات کی رو سے آواز اصل چیز ہے، اور اسی اصول کے تحت زبان کے نظام اصوات کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے، مگر اردو میں عربی، فارسی کے اثر سے، حرف کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ تصور جاگزیں ہو چکا ہے۔ صوتیات کی رو سے، ایک آواز کے لیے دو علامتیں نہیں ہو سکتیں، مگر حروف کی بنیاد پر ایسا ہو سکتا ہے اور اردو میں یہی صورت ہے۔''

(ص ۳۱۹)

''علمی سطح پر سچائی صوتیات کے پاس ہے اور اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا مگر علمی سطح پر روایت چھائی ہوئی ہے اور اس کو بھی آسانی کے ساتھ نہ توڑا جا سکتا ہے اور نہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ بہت سے قاعدے قانون روایت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ ہائے مخلوط کے سلسلے میں بھی قاعدے اور روایت کا اختلاف نظر آتا ہے اور یہ اختلاف بھی، حرف اور صوت کے اسی اختلاف پر مبنی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ صوتیات کے قاعدے کے مطابق بھ، تھ، وغیرہ

مفرد آوازیں ہیں، مگر روایت کی رو سے (جو حرف کے تصور پر مبنی ہے) یہ مرکب آوازیں ہیں جو ب، اور ھ، اور ت، اور ھ کے اتصال سے وجود میں آئی ہیں۔" (ص ۳۲۰)

"ب اور ھ کی مستقل شکلوں کے باعث اردو والوں کا ذہن (بھ) کی ایک آواز کو دو ٹکڑوں کے میل کا نتیجہ سمجھتی ہے۔ صوتیات کا کہنا برحق مگر روایت کے اس اثر کا علاج بہت مشکل ہے۔ اردو میں بھی پہلے سے ان آوازوں کے لیے مفرد شکلیں ہوتیں، تو شاید یہ صورت پیدا نہیں ہو پاتی۔" (ص ۳۲۲)

انھوں نے روایت اور صوتیات کے نقاط نظر کا فرق بڑے معروضی ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ روایت اور صوتیات میں سمجھوتا کر کے درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اختلاف اس پر رہے گا کہ کس حد تک روایت کا اتباع کیا جائے اور کہاں کہاں صوتیات کا۔ رشید حسن خاں اردو میں دس قدیم ہکاری آوازوں کے علاوہ دوسری چھے ہکاری آوازوں کو شامل کرتے ہیں۔

"اردو میں ہائے مخلوط والی آوازیں اور ان کی تحریری صورت یہ ہے۔

"بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ، یھ" (ص ۳۲۳)

یھ اور وھ کی آوازیں ایک ساتھ کی ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ یھ کو کلیجے سے لگاتے ہیں اور وھ کو دھتکار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"یہاں، وہاں میں بھی ہائے مخلوط ہے، مگر اب یہ صورتیں متروک ہیں اور ان کی جگہ یہاں، وہاں اور یاں واں بولتے اور لکھتے ہیں مگر یھ کی صورت (صوت) کو بھی شامل فہرست ضرور کیا جائے گا، آواز تو بہ ہر طور ہے اور آیندہ بعض اور الفاظ میں بھی اس کا دخل ہو سکتا ہے۔" (ص ۳۲۲)

میری رائے میں معیاری الفاظ یاں، واں کے علاوہ بول چال میں یھاں وھاں بولنے کا رواج عام ہے۔ میں نے کسی کو یاں، واں بولتے نہیں سنا۔ غالب تو اس معاملے میں اتنی شدت برتتے تھے۔ یہاں، وہاں اور یاں واں کو غیر فصیح سمجھتے تھے اور محض یھاں وھاں کو فصیح جانتے

تھے، عرشی صاحب نسخۂ عرشی کے حواشی شرح غالب میں لکھتے ہیں کہ غالب نے یوسف علی خاں کے مصرع:

"سیاح جہاں گرد ہیں، آنکلے یہاں بھی" پر اصلاح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہاں، بروزن وہاں فصیح نہیں۔ بے ضرورت نہ چاہیے۔ یہاں بہ یائے مخلوط التلفظ افصح ہے۔" (نسخۂ عرشی طبع اول ۱۹۵۸ء ص ۳۱۸)

لیکن انتخاب غالب میں کاتب نے وھاں لکھا تھا۔ غالب نے اپنے قلم سے تصحیح کر کے اسے (واں) بنادیا جس سے عرشی صاحب نے نتیجہ نکالا کہ آخر میں غالب اس لفظ کو بغیر ہائے مخلوط بولنے لگے۔ اس طرح یھاں، وھاں کو فصیح ماننے والا اتنا وکیل بھی نہ رہا۔

املا نامہ۔ اردو املا کے ساتھ ساتھ ترقی اردو بورڈ نے مئی ۱۹۷۴ء ہی میں اپنا (املا نامہ) شائع کیا۔ اس میں املا کمیٹی کی سفارشات ہیں۔ اس کمیٹی میں ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خان تھے۔ املا نامہ میں لکھا ہے۔

"یہ واقعہ ہے کہ پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ اور ڑھ اردو کی بنیادی آوازیں ہیں نیز رہ، لھ، مھ، نھ اور یھ میں بھی ہکاریت کا شائبہ ہو سکتا ہے۔" (ص ۶۰)

دس ہکاری آوازوں کے ساتھ ڑھ کو بھی اسی وجہ میں شامل کرنا مولوی عبدالحق کا اثر ہے، (پھ) کو لینا اور (وھ) کو نظر انداز کرنا کمیٹی کے ایک رکن رشید حسن خاں کے اصرار پر کیا گیا ہو گا کیوں کہ آخر الذکر کی کتاب میں بھی یہی کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ان کا مضمون "دو چشمی ہے" رسالہ آہنگ گیا بابت ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ وہ شوکت سبزواری کو ماہر صوتیات بجھ کر ان کے اردو نامے کے مضامین سے متاثر ہیں۔ وہ دس بندشی ہائیوں اور سات غیر بندشی ہائیوں کو مساوی درجہ دیتے ہیں (آہنگ ص ۸) اور اعتراض کرتے ہیں کہ محض اول الذکر دس کو مفرد اور آخر الذکر سات کو مرکب ماننا دیوناگری رسم الخط سے مرعوبیت کے سبب ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر نارنگ کا جوابیہ مضمون "اردو کی آوازیں" مشمولہ اردو نامہ، شمارہ، ۲۵ ستمبر ۱۹۶۶ء نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر نارنگ اور میں دیوناگری سے کسی

مذہبی جذباتی وابستگی کے سبب مرعوب نہیں بلکہ اس کی صوتی خوبیوں کے معترف ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں تو اردو حروف تہجی کو دیوناگری کے مطابق ترتیب دینے کو آمادہ ہیں کیوں کہ ان کی رائے میں دیوناگری ترتیب کے اعتبار سے مکمل رسم الخط ہے۔

ناگری حروف کی قدر شناسی کے لیے صوتیات کی ابتدائی معلومات ضروری ہے۔ میں نے اپنی کسی سابق تحریر میں لکھ دیا ہے کہ ناگری حروف کی گروہ بندی رشی پانِنی نے کی یہ درست نہیں۔ دیوناگری خط آٹھویں صدی عیسوی کے قریب ظاہر ہوا۔ یہ براہمی خط سے نکلا ہے جس کا قدیم ترین مستند کتبہ چوتھی صدی قبل مسیح میں ملتا ہے۔ دیوناگری حروف کی ترتیب براہمی کے مطابق ہے۔ براہمی کے مختلف حروف یا آوازوں کی ترتیب پانِنی کے رسالے میں بیان کردہ مخارج کی بنا پر کی گئی ہے۔ پانِنی نے اپنے سوتروں میں آوازوں کی طرح طرح سے گروہ بندی کی ہے جس کی باریکیوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس نے مصمتوں میں نہ صرف ہکاریت اور انفیت (غنائیت) کو پہچانا بلکہ حیرت پر حیرت یہ ہے کہ مصیتیت تک کو پہچان لیا۔ یہ حلقوم میں صوتی تاروں میں پیدا ہوتی ہے جسے کسی طرح آلوں کی مدد کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی کی بنا پر پ، ت، ک، وغیرہ بالترتیب، ب، د، گ، سے الگ آوازیں طے پاتی ہیں۔ آج کل تو یہ آلات کی مدد سے دریافت کر لیا گیا لیکن یہ کرامت ہے کہ پانِنی نے پانچویں چھٹی صدی ق م میں ان کا ادراک کر لیا۔ امریکہ کے ایک بڑے ماہر صوتیات گلیسن نے اپنی مشہور کتاب کے دیباچے میں پانِنی کے رسالے کو A Monument Of Human Intelligence قرار دیا ہے۔ (۱۵)

ڈاکٹر نارنگ نے اسپکٹر وگرام کے ذریعے ثابت کر دیا ہے کہ ہکاریت دس بندشی مصمتوں میں کامل ہے غیر بندشی مصمتوں میں جزوی ہے۔ ہم لیبارٹری میں نہیں جا سکتے۔ نطق و سامعہ کی مدد سے کچھ فیصلہ کر لیں۔ واضح ہو کہ آوازوں کے نازک صوتیاتی فرق کا ادراک کرنے کے لیے ذکی الحس سامعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا توجہ مرکوز کر کے کئی بار یہ فرضی الفاظ منھ سے ادا کیجیے۔

الف۔ اُبھ، اُکھ، اُٹھ

ب۔ اُمھ، اُنھ، اُلھ، اُرھ

ذکی الحس کان کو معلوم ہو جائے گا کہ اُ کے آواز میں ہکاری آواز مفرد معلوم ہوتی ہے جب کہ زمرہ ب کے الفاظ میں م، ن، ل، و، کے بعد گردن ٹوٹ جاتی ہے اور ہائے ملفوظ کے لیے کوشش کر کے بات آگے بڑھائی ہوتی ہے۔ م، ن، ل، ر، وغیرہ ھ کے ساتھ شیر وشکر نہیں ہوتے۔ ان کی ھ کے بعد ایک خفیف سا مصوتہ ابولنا ہوتا ہے۔ ان کی ھ لسانیاتی اصطلاح میں Syllabic Consonant کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

جزوی ہکاری مصمتوں میں آواز کی ثنویت جس طرح انفی مصمتوں (م، ن) میں کھل کر سامنے آتی ہے اس طرح دوسرے مصمتوں میں نہیں۔ کسی مشین کے بغیر محض مشاہدے سے ثابت ہو جائے گا کہ ان دونوں آوازوں کے ساتھ ہکاریت شیر وشکر نہیں ہوتی ملاحظہ ہو۔

م، ن، ان دونوں کے ادا کرنے میں منہ کا راستہ بالکل بند ہو جاتا ہے اور ہوا ناک کے راستے نکالی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ سب مصمتے بہ شمول (ہ) منہ کے راستے ادا ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت دو چشمی ھ کی ہے۔ یہ ناک سے ادا ہونے والے مصمتے کے ہمراہ نہیں، متعاقب ہی سے ادا ہو سکتی ہے پہلے م، ن، کو ادا کرنے کے لیے منہ کا راستہ بند کر کے ناک کا راستہ کھولنا ہوگا۔ اس کے بعد ھ ادا کرنے کے لیے ناک کا راستہ بند اور منھ کا راستہ کھولنا ہوگا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے نقوش شمارہ ۹۸ بابت جون ۱۹۶۳ء میں ایک مضمون اردو کی ہائیہ آوازیں شائع کیا۔ اس میں انھوں نے آخری ص ۵۴ پر ایک لفظ تمھ، درج کیا ہے۔ یہ لفظ ہمارے لئے اہم اور کلیدی ہے۔ آئینے میں دیکھ کر ایک بار 'تم' کہیے۔ م دولبی صوت ہے اسے ادا کرنے کے بعد ہونٹ بند رہیں گے کیونکہ سانس ناک سے خارج ہوتا ہے پھر 'تمھ' کہیے اور آئینے میں دیکھیے، م کو ادا کرتے وقت ہونٹ بند رہیں گے اور اس کے بعد ھ کو ادا کرنے کے لیے کھل جائیں گے جو اس کا واضح ثبوت ہے کہ مھ مرکب آواز ہے یہی کیفیت 'نھ' کی ہے۔

میں نے امکان بھر واضح کر دیا کہ ہندی کی دس ہکاری آوازیں فونیم نہ سہی، مفرد آوازیں ضرور ہیں، جب کہ غیر بندشی ہکاری مصمتے مفرد نہیں مرکب ہیں۔ اگر وہ دو آوازوں کے برابر نہیں تو ایک آواز سے زیادہ اور دو سے کم ہیں۔ اب ان کی صوتی حیثیت بھول کر غور کیا جائے کہ کیا ان میں کسی کو یا سب کو اردو کے حروف تہجی میں جگہ دی جائے۔ یہ معاملہ محض علمی نہیں رہ گیا مجھے اس میں کچھ نفسیاتی گرہیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک طرف اہل روایت ہیں دوسری طرف اہل صوتیات، اہل روایت میں بھی دو زمرے معلوم ہوتے ہیں ایک تو وہ جو صدق دل سے سمجھتے ہیں کہ قدیم زمانے سے حروف وصوت کا جو چلن چلا آ رہا ہے وہی صحیح ترین ہے اہل صوتیات کو اس کی تخریب کا کوئی حق نہیں۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ روایت پرستوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اہل صوتیات کی تجویزوں کی محض اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ خود صوتیات سے نابلد ہیں اور ان تجویزوں کو دوسرے پیش کر رہے ہیں۔ جو کچھ وہ (روایت پرست) نہیں جانتے کیوں نہ اسے محض تخریب وانہدام قرار دیا جائے۔

اہل صوتیات بھی ایک نفسیاتی خوف کے اسیر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دل سے تو طرح طرح کی اصلاحات کرنا چاہتے ہیں لیکن اہل روایت کی زبردست لابی (Lobby) سے ہراساں ہو کر اپنی اصلاحات کو لگام دیتے ہیں اور حروف کی حد تک ہائے مخلوط کے معاملے میں اہل روایت کی بولی بولنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے یہ نفسیاتی بیچاک میرا وہم ہو لیکن مختلف نظریوں کے وکلا کی جذباتیت دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ابتدائی قاعدے کا مقصد طفلِ مکتب کو اردو رسم خط سے آشنا کرنا ہے اسے صوتیات کا درس دینا نہیں۔ اردو کے ابتدائی قاعدے کو صوتیاتی صحت پر تدریسی سہولت کو ترجیح دینا چاہیے۔

املا اور حروف کے معاملے میں اہل صوتیات میں سے ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کافی غور کیا ہے اور لکھا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے تو ابتدائی درسی کتابیں بھی

تیار کی ہیں۔ اہلِ روایت میں رشید حسن خان اور ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اس موضوع میں ڈوب کر جس شرح وبسط اور عمق نظر سے جائزہ لیا ہے اس کے باعث یہ موضوع انھیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ مجھ جیسا سرسری نویس کسی دراندازی کی طرح گھڑی آدھ گھڑی کے لیے اس حلقۂ درس میں گھس آتا ہے۔ بہر حال دیکھتا ہوں کہ ہندی کے دس ہکاری بندشیوں کے علاوہ مزید سات ہکاری مصمتوں کے بارے میں اہل الرائے کی کیا رائے ہے۔

انشا نے ۱۷ ہائیوں کو تسلیم کیا ہے اور اسماعیل (۱۶) نے ۱۱ ہی کو لیا ہے دس قدمی ہائیے نیز ڑھ۔ مولوی عبدالحق نے ۱۵ ہائیوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بھ، وھ کو نہیں لیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے دونوں مضمونوں میں اسماعیل میرٹھی کی طرح دس بندشوں کے ساتھ ڑھ کو شامل کر کے ۱۱ ہائیوں کی شناخت کی ہے۔ ڈاکٹر سبزواری جملہ ۱۷ حروف کو شامل کرتے ہیں۔

رشید خان نے اپنی کتاب اردو املا میں لکھا ہے۔

"بہر طور اردو میں ہائے مخلوط والی آوازیں اور ان کی تحریری صورت یہ ہے، بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ، یھ۔" (ص ۲۲۳)

یہ ۱۶ آوازیں ہیں جن میں سے (وھ) کو خارج کر دیا ہے۔ ان کی عبارت میں (تحریری صورت) سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ وہ اردو میں ۱۶ ہکاری حروف تسلیم کرتے ہیں لیکن بمبئی کے سیمینار دسمبر ۱۹۸۶ء میں انھوں نے کہا کہ وہ حروف تہجی میں محض 'ھ' پر قانع ہیں اس کے علاوہ ہائیہ حروف کو شامل کرنے کے موید نہیں چوں کہ ان کا یہ موقف ان کی کتاب (اردو املا) کی تحریر سے مختلف تھا اس لیے میں نے بعد میں خط لکھ کر ان سے وضاحت چاہی۔ انھوں نے مجھے ۵ جنوری ۱۹۸۵ء کے خط میں لکھا۔

"ھ کو حروف تہجی میں شامل کرنے کا میں موید نہیں، میں اس کے خلاف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ (ہ) کی ایک شکل ہے، علاحدہ کوئی حرف نہیں۔۔۔ میں نے جلسے میں یہ نہیں کہا تھا کہ 'ھ' کو حروف تہجی میں جگہ دوں گا۔ شاید کچھ گڑبڑ کہیں ہو گئی ہے۔۔۔ بہر حال میرا خیال یہ

ہے کہ نھ کو شامل حروف تہجی کرنا ضروری نہیں۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ذہن میں ۱۶ ہائیہ آوازیں ہیں جنھیں وہ (ہ) کی ایک ذیلی شکل نھ کے شمول سے لکھنا پسند کرتے ہیں حروف تہجی میں نہ ھ کو جگہ دیں گے نہ ۱۶ ہائیہ حروف کو۔

املا نامہ: ترقی اردو بورڈ کے املا نامہ میں معاملہ کچھ گول مال ہے۔ اس کے پردے میں رشید حسن خان بولتے نظر آتے ہیں لکھا ہے۔

"اردو میں ہکار آوازوں کا پورا سیٹ موجود ہے۔ اردو میں ان کے لیے اگرچہ الگ سے حروف نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ اور ڑھ اردو کی بنیادی آوازیں ہیں نیز رھ، لھ، مھ، نھ اور یھ میں بھی ہکاریت کا شائبہ ہو سکتا ہے۔ اردو میں ان کے لیے اگر ہائے مخلوط کو مخصوص نہ کر دیا جائے تو ایک طرح کی بے راہ روی پھیلتی ہے۔" (ص ۶۰)

گویا رشید حسن خان کی طرح ۱۶ آوازوں کو ہائے مخلوط سے لکھا جائے اب یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ ۱۶ حروف یا ہائے مخلوط اردو حروف تہجی میں جگہ پائیں گے یا نہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

"ضروری ہے کہ ہائے دوچشمی کا استعمال ہائے مخلوط کامل اور ہائے مخلوط جزوی سے مخصوص کر دیا جائے۔" (ص ۱۷)

ہائے مخلوط کامل سے ان کی مراد دس قدیم ہائیے ہیں اور ہائے مخلوط جزوی سے مراد مزید پانچ آوازیں لھ، مھ، نھ، رھ، ڑھ ہیں۔ انھوں نے این سی آر ٹی کے لیے جو پہلی کتاب تیار کی ہے اس میں تدریسی روایات اور سہولت کے پیش نظر (ہ) کے علاوہ ھ کو بھی شامل کیا ہے۔ تمام حروف درج کرنے کے بعد سطر کھینچ کر نیچے ۱۵ ہائیہ حروف درج کر دیے ہیں۔ جس سے وہ ان کا وجود تو تسلیم کرتے ہیں لیکن انھیں حروف تہجی میں شامل کر کے حروف کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔ درسی کتاب کے علاوہ وہ اساتذہ کو ایک Teacher,s Guide بھی فراہم کریں گے جس میں صورت حال واضح کر دی جائے گی۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ان کی رائے کم و بیش رشید حسن خاں سے ملتی ہے وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں ''دو چشمی ہے (ھ) کی مخلوط یا ملواں شکلیں حروف تہجی میں شامل نہیں ہیں۔ دو دو حرفوں کے مجموعے ہیں۔ انھیں حروف تہجی میں یا قاعدے میں کہیں اور مفرد حرف کی طرح درج نہ کرنا چاہیے۔'' (۱۸)

میرے نام ۳ دسمبر ۸۶ء کے خط میں لکھا۔

''میری رائے میں ہائیت کے لیے سادہ حروف کو دو چشمی ہے کے اشتراک سے لکھنے کا طریقہ نہایت مناسب ہے۔ مفرد حروف تہجی قرار دینے سے خواہ مخواہ حروف تہجی میں اضافہ ہوگا اور سب آوازیں نہ لی جاسکیں تو وہی بات ہوگی جو لھ، مھ، نھ وغیرہ کے سلسلے میں دیوناگری میں ہے۔''

یعنی اگر ہائیہ حروف کو شامل کیا جائے تو محض دس کو نہیں بقیہ سات کو بھی، لیکن مزید ۱۷ حروف کے اضافے سے بچوں کے ذہن میں الجھن ہوگی۔ میرے نام ۲۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کے خط میں پھر لکھا۔

''میں صوتیاتی اعتبار سے ۱۷ ہائیے مانتا ہوں لیکن ان کی تحریری علامتوں کو دو حرفوں کا مجموعہ سمجھتا ہوں مفرد حروف نہیں۔''

اب صورت یہ ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رشید حسن خان اور ڈاکٹر ابو محمد سحر بالترتیب ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ ہکاری حروف مانتے ہیں لیکن تینوں میں کوئی بھی انھیں حروف تہجی میں جگہ دینے کے حق میں نہیں تاکہ حروف کی تعداد میں اضافہ نہ ہو۔ مثالی رسم الخط میں ایک آواز کے لیے ایک حرف اور ایک حرف کی ایک آواز ہونی چاہیے لیکن مروجہ رسوم الخط میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ اگر ایک آواز کو دو حروف سے ادا کیا جاتا ہے تو اسے Digraph کہتے ہیں جس کی بہترین مثال رومن خط میں چ (ch) ش (sh) کی ہے۔ یہ آوازیں انگریزی کے فونیم ہیں لیکن انھیں رسم خط میں دوہرے حروف سے ادا کیا جاتا ہے، اس لیے یہ ہجا کے حصے نہیں۔ صوتیاتی اعتبار سے یہ

طریق کار مستحسن نہیں لیکن روایت اور سہولت کے اعتبار سے جائز ہے۔ اردو میں بھی ۱۵، ۱۶ یا ۱۷ آوازوں کو دوہرے حروف سے لکھا جائے گا تا کہ ان کی ادائیگی بھی ہو جائے اور انھیں حروف تہجی میں شامل بھی نہ کیا جائے۔

حروف تہجی کے بارے میں سب کی رائے دینے کے بعد میری خود کی کیا رائے ہے، میرے لیے یہ سوال گھبرا دینے والا ہے کیوں کہ میں نے درسی کتابوں، بالخصوص ابتدائی قاعدے کے بارے میں غور نہیں کیا۔ یہ میرا موضوع نہیں۔ اسے تدریسی کالجوں والے ہی بہتر طریقے سے طے کر سکتے ہیں۔ این سی آر ٹی کی ورک شاپ نے لمبے غور وخوض اور بحث وتمحیص کے بعد جو کچھ طے کیا ہے اسی کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس کی آخری شکل ابھی سامنے نہیں آئی لیکن وہی طریقہ بہترین ہے کہ ہائیہ حروف کو حروف تہجی میں جگہ نہ دی جائے بلکہ جملہ حروف کے بعد سطر کھینچ کر دوسرے جز و یا دوسرے سبق کے طور پر عنوان دیا جائے۔

"'ھ' کی شکل ھ کے حروف"

اور اس کے نیچے ۱۵ یا ۱۶ یا ۱۷ ہکاری حروف کی تقطیع دی جائے۔ پندرہ حروف کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں صرف بھ وھ مشکل پیدا کرتے ہیں۔ بھ محض ایک متروک اور غیر معیاری لفظ (بھاں) میں ملتا ہے وھ اس قسم کے لفظ وھاں میں ہے اس کے علاوہ یہ انگریزی کے ایسے دخیل لفظ وھیل (مچھلی) میں موجود ہے جس کے لیے اردو میں کوئی دوسرا لفظ نہیں۔ پھر ہم کبھی انگریزی کے یہ الفاظ بھی اردو میں لکھنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

وھائٹ ہاؤس، بلیک اینڈ وھائٹ، اے، اچ وھیلر کی ریلوے بک اسٹال۔ ان کی خاطر 'وھ' کو شامل کرنا چاہیے۔ بھ کو حذف کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے کسی شعر میں بھاں، لکھنے کی ضرورت آئے تو وہ آگے کی جماعتوں کے لیے ہوگا۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مضمون اردو کے قاعدے، مشمولہ نیا دور بابت جون جولائی ۱۹۸۵ء

کے مطالعے سے نیز اکتوبر ۱۹۸۶ء میں ان سے ملاقات کے دوران میں اس مسئلے کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ وہ ہے ابجد خوانوں کو تدریس کے وقت حروف، بالخصوص ہکاری حروف کے ہجے کا، ہمیں جو حل پیش کرنا ہے اس میں ہجے کی سہولت اور صحت دونوں کا کچھ نہ کچھ خیال رکھنا ہوگا۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ حرکت کا اعلان اس حرف کے بعد کیا جائے جس پر وہ واقع ہے یا اس کے بعد کے ساکن حرف کے بعد۔ چلن دوسری صورت کے مطابق ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مضمون میں لکھا تھا۔

"اردو حروف تہجی میں یہ مرکب آوازیں تصور کی گئی ہیں اور اسی بنا پر اردو تدریس کا یہ انداز ہنوز جاری ہے کہ گ۔ ھ۔ رز بر گھر۔ ب۔ ھ رز بر بھر جو صوتیاتی نقطۂ نظر سے مہمل ہے کہ مبنی ہے حرف کے تصور پر۔"

ڈاکٹر ابو محمد سحر بھی ہجے کے اس طریقے پر اصرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مصلحین کی عنایت سے ہجے کا ایک اور طریقہ نکلا ہے۔ اس کے مطابق اب کے ہجے 'الف ب زبر اب' کے بجائے 'الف زبر ب اب' کیے جاتے ہیں۔ اس کی منطق یہ ہے کہ اب میں زبر الف پر ہے، اس لیے زبر الف کے بعد کہنا چاہیے نہ کہ بے کے بعد۔ یہ منطق بے جان نہیں لیکن پرانے طریقے کے مطابق جب الف بے زبر اب کہتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ زبر الف پر ہے اور بے ساکن ہے، کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ زبر الف اور بے دونوں پر ہے۔" (نیا دور ص ۱۲)

"گھر کے ہجے وہ یوں تجویز کرتے ہیں۔"

"گاف دو چشمی ہے رے زبر گھر"

میرے استفسار کے جواب میں رشید حسن خان نے بھی بالکل یہی باتیں کہیں یعنی (۱) یہ تسلیم کہ حرکت تو اسی حرف پر رہے گی جس پر وہ اصلاً واقع ہے لیکن ہجے میں بعد کے ساکن حرف

کے بعد بولنا چاہیے (۲) گھر کے ہجے میں 'گاف ہے رے زبر گھر' کہوں گا کیوں کہ دوسری صورت میں اجنبیت محسوس ہوگی۔"

مجھے اس کے برخلاف محض دو مثالیں ملیں ایک یہ کہ پاکستان ٹیلی ویژن پر عربی کی تدریس کی جاتی ہے اس میں پہلے مثلاً ب رز بر بز' کہا جاتا تھا جو بعد میں 'ب زبر رے بز' کہا جانے لگا۔ واضح ہو کہ بر فارسی لفظ ہے ٹی وی کا صحیح لفظ مجھے یاد نہیں۔ دوسرے یہ کہ بمبئی کے ایک صاحب پروفیسر محمد واصل نے ایک قاعدہ لکھا ہے جس میں انھوں نے 'ب زبر ر بز' کا طریقہ اپنایا ہے میں اس پر مصر ہوں کہ حرکت جس حرف پر ہے اسی کے بعد بولنی چاہیے۔

معلوم نہیں قدیم انداز سے جگر کے ہجے کیوں کر کیے جائیں گے۔

ج گ زیر جب رے زیر جگر

اب دیکھیے گ جس پر دراصل زبر ہے روایتی ہجے میں زبر کا حامل بن جاتا ہے یہ جھوٹ بولتا ہے۔ "مہ کامل" میں روایتی طریقے سے پہلے لفظ کے ہجے کیوں کر ہوں گے۔

م ہے زبر زیر مہ

کیا لغویت ہے، صحیح صورت حال کے مطابق ان الفاظ کے ہجے یوں کیجیے۔

ج زیر ، گ زبر ، جگر		م زبر ہے زیر ، مہ

اگر اب تک ہجے میں آوازوں کی غلط ترتیب پیش کی گئی ہے تو مستقبل میں بھی غلطی کو جاری رکھنے پر اصرار کیوں کیا جائے؟ اجنبیت کا احساس کسے ہوگا جو نیا بچہ نئے طریقے سے ہجے سیکھے گا وہ پرانے طریقے سے آشنا ہی نہیں، اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ مجھے اس موقع پر یہ شعر یاد آتا ہے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا		منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

جہاں تک گھر کے ہجے کا سوال ہے میرے نزدیک اصل حروف کی تقطیع کے بعد دوسرے جزو میں ہائے مخلوط کے جو حروف دیے جائیں گے انھیں ثانوی حروف کا درجہ دینا چاہیے۔ گ

ھ کے بجائے گھ کہنے میں سہولت بھی ہے اور صحت بھی۔ میں تو گھر کے پیچھے گھورے زبر گھر، کرنا پسند کروں گا لیکن چوں کہ اس شعبے کے ماہرین این سی ای آر ٹی والے ہیں، انھوں نے اپنی پہلی کتاب کے ساتھ کے گائیڈ میں جو طریقہ اپنایا ہوگا میں اسے قبول کرکے بات ختم کروں گا۔ مجھے معلوم نہیں گائیڈ نے اس ضمن میں کیا ہدایت دی ہے۔

(نوائے ادب۔ اکتوبر ۸۷ء۔ کھوج)

حواشی

۱۔ ڈاکٹر تنویر علوی (مرتب) کلیات ذوق (ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء) ص ۲۰۱

۲۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری "اردو کی ہائیہ آوازیں" نقوش شمارہ ۹۸، جون ۱۹۶۳ء ص ۵۳

3. Saraswati Saran, India,s National Writing (Delhi, 1968) P.4.

۴۔ بھاشا وگیان (طبع سوم، بنارس ۱۹۴۳ء) ص ۱۳۶

۵۔ سامانیہ بھاشا وگیان (طبع ششم الہ آباد ۱۹۶۱ء) ص ۱۔۵

۶۔ کیلاگ، ص ۱، بحوالہ ڈاکٹر مسعود حسین خان، اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ، مترجم ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۸۶ء) ص ۷۶۔

۷۔ بھولا ناتھ تواری، بھاشا وگیان (الہ آباد، طبع چہارم ۱۹۸۶ء) ص ۳۰۔۳۲۹

۸۔ بحوالہ ڈاکٹر عابد پیشاوری، انشاء اللہ خان (لکھنؤ، ۱۹۸۵ء) ص ۹۵۔۵۹۴

۹۔ ڈاکٹر سیفی پریمی، حیات اسماعیل (دلی اکتوبر ۱۹۷۶ء) ص ۲۱۳

۱۰۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر "دو چشمی ہے" رسالہ آہنگ گیا ستمبر ۱۹۸۴ء ص ۸

۱۱۔ مولوی عبدالحق قواعد اردو (انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۱۹۸۶ء) ص ۲۷۔۲

۱۲۔ اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ ص ۷۶۔۷۷

۱۳۔ اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں، اردو نامہ کراچی شمارہ ۱۳۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۰۔۱۱

۱۴۔ سرسید بک ڈپو علی گڑھ، طبع ششم ۱۹۷۸ء ص ۲۱۳

15. Gleason, An Introduction to Discriptive Linguistics 1968.

۱۶۔ اسماعیل میرٹھی کا قاعدہ، بحوالہ ڈاکٹر ابو محمد سحر "دو چشمی ہے" رسالہ آہنگ، گیا ستمبر ۱۹۸۴ء ص ۸

۱۷۔ اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں، اردو نامہ، شمارہ ۱۴، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۳

۱۸۔ اردو کے قاعدے، نیا دور، لکھنؤ، جون جولائی ۱۹۸۵ء ص ۱۶

☆

یائے اضافت اور ہمزہ

زبان کے مسائل کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر عام ہیں جن کی نشان دہی علامہ کیفی نے یوں کی ہے:

''جہاں دنیائے اردو میں ایسے اصحاب پیدا ہو گئے ہیں جو کسی قاعدے یا ضابطے کے پابند ہی نہیں، وہبیت کا جن ان کے سر پر ایسا سوار ہے کہ ان کی گردن کسی اصول اور ہدایت کے سامنے خم ہونے میں نہیں آتی، ایسے اصحاب بھی عنقا کا حکم نہیں رکھتے جو قدیم ضابطے اور دستور العمل میں سر مو تبدیلی اور ترمیم کو کفر و ارتداد کا مرادف سمجھتے ہیں۔ ان کا ادبی جبر و استبداد سیاسی جبر و استبداد سے کم نہیں۔ یہ ادبی سخت جان اور سخت گیر بھی زبان کے حق میں ایک طرح کا مزمن مرض ہیں۔''(۱)

ان دونوں گروہوں میں کیفی دوسرے گروہ سے زیادہ نالاں ہیں۔ دراصل یہ جھگڑا زندگی کے ہر شعبے کی طرح نوجوان اور بوڑھے کے نقطۂ نظر کا ہے لیکن ان دونوں گروہوں کے بیچ ایک نسل ادھیڑ عمر والوں کی بھی ہوتی ہے جو موجودہ حالات کے مطابق روایتوں اور قدیم اصولوں میں ترمیم سے نہیں بھڑکتی لیکن مزاج کے انداز میں نہیں بلکہ بعض بدلے ہوئے اصولوں کے تحت۔ میں اسی میانہ روی کے حق میں ہوں۔ واضح ہو کہ تحریر کی واحد غرض تقریر کو اس طرح کاغذ پر ثانک دینا ہے کہ قاری ہر لفظ کا وہی تلفظ پیدا کر سکے جو کاتب کا عندیہ تھا۔ طریق املا کی خوبی یہ ہے کہ ایک آواز کو ہر لفظ میں ایک ہی طرح پر لکھا جائے تا کہ لکھنے والے کو کسی لفظ کے ہجے یاد نہ کرنے پڑیں۔ تلفظ سن کر وہ خود بخود صحیح املا لکھ سکے اور پڑھنے والا اس لفظ کو لکھا دیکھ کر اس کا صحیح

تلفظ کر سکے۔ انگریزی میں رومن رسم الخط کی اس طرح تخریب کی گئی ہے کہ کوئی نشان کسی لفظ میں کچھ آواز دیتا ہے کسی میں کچھ۔ یہ خرابی مصوتوں سے بڑھ کر مصمتوں تک پہنچ گئی ہے۔ انگریزی خط میں کرنل اور لفٹیننٹ جیسے الفاظ کو دیکھیے "ر" اور "ف" کی آواز موہوم حروف سے پیدا کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں ہر لفظ کے ہجے فرداً فرداً یاد کرنے پڑتے۔ اردو رسم الخط میں جہاں تک ہندوستانی آوازوں کا تعلق ہے، یہ دشواری نہیں لیکن عربی کے مخصوص حروف کا وقوع یاد کرنا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض عربی فارسی الفاظ کو اس طرح لکھا جاتا ہے کہ وہ اردو املا کے ہندوستانی مزاج پر تشدد کرتا ہے۔ مثلاً:

لہٰذا زکوٰۃ۔ عیسیٰ۔ فی النار۔ کماحقہٗ۔ فی نفسہٖ۔ دفعتہً۔ خواب۔

اس قسم کے الفاظ کا مقررہ املا ہر اردو خواں کو مجبور کرتا ہے کہ ان کے ہجے اور ان کی ہیئت کو ازبر کر لے۔ املا اور ہجے کا بنیادی مقصد صوت کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ لیکن اردو میں ستم یہ ہے کہ املا کو صرف (Morphology) اور اشتقاقیات (Etymology) کا تابع کیا جاتا ہے۔ "فی النار" کو "فنّار" نہ لکھ کر "فی النار" اس لیے لکھیے کہ واضح رہے کہ یہ فی + ال + نار کا مجموعہ ہے۔ "عادۃً" کو الف کے ساتھ عادتاً نہ لکھیے تا کہ معلوم رہے کہ لفظ عادت میں تائے تانیث ہے۔ "دفعتاً" "صحیح" "عادتاً" غلط گویا ہر نوآموز کو ان الفاظ کے اشتقاق اور صرفی تجزیے سے بڑی دل چسپی ہے۔

ان استثنائی الفاظ کا املا کتنا ہی خلاف معمول سہی اچھے پڑھے لکھے انھیں مقررہ ڈھنگ ہی سے لکھتے ہیں، مبتدیوں کی بات دوسری ہے۔ میں املا کی ایک ایسی روش کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے عوام ہی نہیں بلکہ خواص کی بھی اکثریت فارسی کے مقررہ قواعد کے خلاف لکھتی ہے۔

غالب، تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے:

جزو کلمہ: مصرع ہمارے بر سر مرغاں ازاں شرف دارد

مصرع اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے تو شوم، رہنمائے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح: توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی مثلاً مصدری: "آشنائی" یہاں ہمزہ ضرور بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: "آشنائے" یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا نہ کہلاؤ گے۔"(۲)

مجھے یہ تسلیم ہے کہ فارسی قواعد کی رو سے یائے اضافت کے ساتھ ہمزہ نہ چاہیے لیکن اردو کا چلن کیا ہے؟ کوئی رسالہ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے ۹۵ بلکہ ۹۹ فی صدی مقامات پر یائے اضافت کے اوپر ہمزہ لکھا ملے گا۔ صرف ڈاکٹر نذیر احمد مولانا عرشی صاحب اور مالک رام صاحب جیسے ماہرین علومِ شرقیہ کی مطبوعہ تحریریں اس سے پاک ہوں گی۔ ذیل میں چند معیاری رسالوں کی فہرست مضامین سے کچھ ایسے عنوانات درج کیے جاتے ہیں جن میں یائے اضافت پر ہمزہ موجود ہے۔ یہ عنوانات رسالے کے اندر جلی سرخی میں بھی ہیں۔ ایسے نمایاں مقامات پر ہمزہ کا ہونا محض سہو کاتب نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ادارہ کی تائید بھی حاصل ہوگی۔

میر کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ:	ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان اردو، اپریل ۵۱ء ایڈیٹر مولوی عبدالحق
اردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطے:	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اردو، جولائی ۵۲ء ایڈیٹر مولوی عبدالحق
گنج ہائے گراں مایہ: افسر امروہوی	قومی زبان: مئی ۶۶ء
نوائے عاشقانہ: جگن ناتھ آزاد	آج کل، ۱۵ فروری ۴۹ء

۲

ایڈیٹر جوش، نائب مدیر عرش، جگن ناتھ آزاد

اجزائے لغت پر تنقید: وارث سرہندی اردو نامہ جنوری ۶۸ء

نوائے سروش (نظم): ماہر القادری اردو ادب شمارہ ۳، ۱۹۷۰ء

سرسید کے نام رفقائے سرسید کے غیر مطبوعہ خطوط: ڈاکٹر اصغر عباس اردو ادب شمارہ ۴، ۷۱ء

غازۂ روئے گلعذار (نظم) جمیل مظہری: شاعر، ستمبر ۷۱ء

صدائے غالب (نظم) اقبال ندیم: نیا دور، صفحہ ۴۵، دسمبر ۷۲ء ایڈیٹر صباح الدین عمر

شیدائے امن کا ماتم: شاستری کی وفات پر نیا دور، فروری ۶۶ء اداریہ

نیا دور جون ۶۲ء میں صفحہ پر ایک کتاب گلہائے شگفتہ پر تبصرہ ہے جہاں جلی حروف میں 'گلہائے شگفتہ لکھا ہے۔ رسالہ اردو کے بابائے اردو نمبر ۶۶ء (مرتبہ سید وقار عظیم) میں سرورق پر اور اندر ہر جگہ، بابائے اردو ہمزہ کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی کیفیت، قومی زبان، کے بابائے اردو نمبر ۶۶ء کی ہے۔ میرے پاس نگار کے چند شمارے ہیں۔ ان میں فہرست مضامین میں تو یائے اضافت نہیں دکھائی دی۔ لیکن نگار مئی ۴۹ء میں صفحہ ۴ پر سالنامے کا اشتہار ہے جس میں 'دنیائے ادب' کا فقرہ ہے۔ اسی طرح جولائی ۵۷ء کے نگار میں صفحہ ۲ پر نگار بک ایجنسی کی کتابوں کے اشتہار میں' جہانگشائے نادری' کا نام درج ہے۔ یہ دونوں شمارے نیاز فتح پوری کے مرتبہ ہیں۔ یہ تمام رسائل اور ان کے مدیر اردو میں اہم مرتبہ رکھتے ہیں۔

جہاں تک کتابوں کے ناموں کا تعلق ہے ان میں یائے اضافت پر ہمزہ لگانے کا عام رواج ہے۔ ذیل میں ایسی چند کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں جن کے موقر مصنف قدیم علوم سے بے بہرہ نہیں۔

گنج ہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی	ناشر مکتبۂ جامعہ
انشائے ماجد حصہ اول	عبدالماجد دریابادی	
انشائے ماجد حصہ دوم	عبدالماجد دریابادی	
تذکرہ شعرائے جے پور	احترام الدین شاغل	ناشر مکتبۂ جامعہ
بابائے اردو عبدالحق	عبداللطیف اعظمی	
جوئے شیر	آنند نرائن ملا	

بکٹ کہانی مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی و ڈاکٹر مسعود حسین خاں میں یائے اضافت پر شدت سے ہمزہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً متن میں:

ع کے رامی کندر سوائے بازار (ص ۲۱۲)

ع بہ طوق حلقہ ہائے گوش دلدار (ص ۲۱۴)

ع گدا ہو کر پھروں رسوائے بازار (ص ۲۱۵)

اس کتاب کا عالمانہ مقدمہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے نام سے ہے۔ اس میں فارسی جملوں میں ص ۳۸۰ پر 'برائے خاطر' 'رضائے شما' 'رضائے ماہ' کی تراکیب دکھائی دیں۔ ص ۳۸۱ پر افضل کے فارسی اشعار میں دلہائے شکستہ، مینائے شکستہ، توودہائے عنبر، مشکہائے اذفر، کی تراکیب ہیں اور سب میں یے پر ہمزہ ہے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اس لیے سہو کاتب کا دخل نہیں۔ چونکہ یہ خاص اہتمام سے ترتیب دے کر چھاپی گئی ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس کے پروف توجہ سے پڑھے گئے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کتاب کے فاضل مرتبین یائے اضافت پر ہمزہ لکھنے کے حق میں ہیں۔ میں نے یونیورسٹیوں کے ایسے اساتذہ کو جو فارسی یا عربی سے بخوبی واقف ہیں یائے اضافت پر ہمزہ لگاتے دیکھا ہے۔ ریڈر کی اسامی کے انتخاب یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے انٹرویو میں دریافت کیا ہے کہ اضافت کی شکل میں یائے مجہول پر ہمزہ لکھنا چاہیے کہ نہیں۔ ہمیشہ جواب ملا ہے "لکھنا چاہیے۔" یہ کہنے کی غرض یہ ہے کہ آج قدیم علوم کے چند ماہرین کے علاوہ اچھے پڑھے لکھوں کو بھی یہ علم نہیں کہ یائے اضافت پر ہمزہ نہیں

لکھا جاتا۔

سید انشا نے دریائے لطافت میں اصول پیش کیا ہے:

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا اردو ہو گیا، خواہ وہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اردو میں اس کے استعمال میں آنے پر منحصر ہے۔ کیونکہ جو اردو کے خلاف ہے غلط ہے خواہ وہ اصل زبان میں صحیح نہ بھی ہو۔" (۳)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (۴) نے اسے اردو زبان کا میگنا کارٹا کہا ہے، اس لیے کہ اس میں سب سے پہلے اردو کی آزادانہ حیثیت منوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انشا کے اس اصول کا اردو املا پر بھی کیوں نہ اطلاق کیا جائے۔ اردو خط میں فارسی خط سے کئی حروف زیادہ ہیں۔ اس کا اپنا مزاج ہے۔ اسے کیوں عربی فارسی کا ضمیمہ بنائے رکھا جائے۔ زبان کا ارتقا اسی طرح ہوتا ہے کہ کسی لفظ کو کوئی ناواقف شخص غلط تلفظ کے ساتھ بولتا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ اسی طرح کی غلطی کرنے لگتے ہیں۔ زبان کے خزینہ دار اس پر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں اور اسے تغیر زبان کے بجائے تخریب زبان قرار دیتے ہیں لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ وہی بگڑا ہوا تلفظ عام ہو جاتا ہے اور اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔ اب اسے اصلاح زبان کا نام دیا جاتا ہے۔ 'چندر' سے 'چاند' اور 'راتری' سے 'رات' اسی طرح بنے ہوں گے۔ آج ہمیں اردو کے متعدد الفاظ دکھائی دیتے ہیں جن کا تلفظ خواص و عوام دونوں میں بدل گیا ہے لیکن تحریر میں اب بھی وہی فرسودہ متروک تلفظ مسند استناد پر متمکن ہے اور مروجہ تلفظ ٹکسال باہر ہے۔

ایسے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

کتابی تلفظ	تقریری تلفظ
تجربہ (ج ساکن، ر متحرک)	تجربہ (ج متحرک، ر ساکن)

شمع (فارسی میں م ساکن) شمع (م متحرک)

آزمائش، فرمائش، قائم، دائم (ہمزہ مکسور) آزمایش، فرمایش، قایم، دایم (یائے مفتوح)

معاف، متعلق، متاخرین (ع یا الف متحرک) معاف، متعلق، متاخرین (ع یا الف ساکن)

غدر، صدر بازار (د ساکن) غدر، صدر بازار (متحرک)

عوام بھی نہیں خواص بھی دوسرے کالم کا تلفظ کرتے ہیں لیکن کسی کی مجال ہے کہ تحریر بالخصوص شعر میں دوسرے کالم کا تلفظ ظاہر کر سکے۔ یہ دورنگی اور خود فریبی کیوں اور کب تک؟

اس کے ساتھ ساتھ عربی کے باب تفعیل کے وہ الفاظ ملاحظہ ہوں جن میں "ع" کے مقابلے میں یائے معروف آتی ہے جس کی وجہ سے املا میں دو (ی) جمع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً تعیین، تعیین، تغییر، فارسی میں ان کی پہلی "ی" کو ہمزہ سے بدل دیا گیا کیوں کہ ہم یہاں یائے مکسور بولنے پر قادر نہیں اور ان الفاظ کو تع + این، تغ + ایئ، تغ + ایر بولتے ہیں۔ یہی کیفیت آئندہ، مائل، سائل کی ہے جہاں اصلاً یائے مکسور ہے لیکن ہم 'ی' کی جگہ ہمزہ مکسور بولتے ہیں اور اسی لیے اردو میں ان الفاظ کو آئندہ، مائل، سائل' لکھنے کا رواج ہو گیا ہے لیکن سرگشتگان عربی وفارسی اب بھی اردو میں تعیین اور آیندہ لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کی وفاداری اردو تلفظ سے نہیں عربی فارسی روایت سے ہے۔ ایک محترم بزرگ فارسی لفظ 'آئینہ' کو بھی دو 'ی' سے آیینہ لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ حالانکہ آہن سے آہینہ بنا اور آہینہ سے آئینہ۔ پہلی "ی" کا سوال ہی نہیں۔ جس طرح وقت کے ساتھ بعض الفاظ کا تلفظ بدل جاتا ہے، اسی طرح تلفظ کے استحکام کے باوجود بعض الفاظ کا املا بدل جاتا ہے۔ عہد بہ عہد کے مخطوطات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اب کوئی پانو۔ پہونچنا۔ دھنواں نہیں لکھتا۔ بلکہ پاؤں' پہنچنا' دھواں لکھا جاتا ہے۔ یائے اضافت کے ہمزہ کی بھی یہی کیفیت ہے کہ وہ اب عام استعمال میں داخل ہو گیا ہے۔ اس سے انکار کرنا بدیہیات سے انکار اور چلن سے لڑنا ہے۔ عام چلن سے قطع نظر صوتی حیثیت سے دیکھا جائے کہ اردو املا کا مزاج اس موقع پر ہمزہ مانگتا ہے کہ نہیں؟

غالب کے وضع کردہ اصولوں کو سامنے رکھ کر اول میرے کہے ہوئے دو مصرعے ملاحظہ ہوں۔ املا مروجہ فارسی اصولوں کے مطابق ہے:

ع ندارد ردائے گدائے درت

(تیرے در کا گدا کوئی چادر نہیں رکھتا)

اس مصرع میں "ردائے" اور "گدائے" میں آخری آواز یکساں ہے۔ پھر ایک جگہ ہمزہ لکھنا اور دوسری جگہ نہ لکھنا چہ معنی؟ اب دوسرا مصرع ملاحظہ ہو:

کسے ردائے گدائے نہ دزدد

(کسی فقیر کی چادر کوئی نہیں چراتا)

دونوں مصرعوں میں دو الفاظ "ردائے گدائے" مشترک ہیں۔ ان کی آخری آوازیں بالکل یکساں ہیں لیکن فارسی کے روایتی املا میں ان میں ہمزہ کا مقام بدل جاتا ہے۔ اس خلفشار کی صوتی وجہ؟ اگر عقل کو گالی دینے کا فقرہ کسی موقع پر چست کیا جا سکتا ہے تو یہاں پر۔ املا کی غرض آواز کی ترجمانی کرنا ہے۔ یہ لفظ کا صرفی تجزیہ کرنا؟ میں ان دونوں مصرعوں میں دونوں لفظوں پر ہمزہ لکھنا پسند کروں گا، لیکن ٹھہریے۔ مجھے فارسی املا میں ترمیم کا اختیار نہیں۔ فارسی میری زبان نہیں۔ میں اردو املا تک ہی محدود ہوں گا۔ اردو نثر و نظم میں اگر کوئی عربی فارسی ترکیب آتی ہے تو اسے بھی اردو املا کے اصول پر لکھا جائے گا۔

اردو میں ہمزہ کی نوعیت بالیقین محض الف متحرک کی ہے جب کہ عربی و فارسی میں اس کے علاوہ بھی ہے۔ عربی میں ہمزہ کی بابت ڈاکٹر محمد عقیل نے لکھا ہے:

> "عربی میں ہمزہ کی واضح صورتوں کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ بندشی Plosive Consonant کا ہے اور دوسرا حلق بندی (Glottal Stop) آوازوں (۵) کا لیکن اردو میں ہمزہ کا کام مصوتہ کا ہے جو کبھی اکیلے اور کبھی جڑواں مصوتہ (Diphthong) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ (۶)

عربی ہمزہ کے بارے میں ڈاکٹر عقیل کو کچھ التباس ہوا ہے کیونکہ بندشی اور حلق بندی آوازوں میں تضاد نہیں Glottal Stop بھی Plosive Consonant ہے۔ ان میں صرف جز اور کل کا رشتہ ہے۔ میں عربی سے نابلد ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ عربی میں ہمزہ بعض مقامات پر مصمتہ بھی ہوتا ہے جب کہ اردو میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ فارسی میں ہمزہ کے ایک رخ کے بارے میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''دراصل پہلوی زبان میں علامتِ اضافت (ی) ہے جو آج بھی ایسے تمام الفاظ پر آتی ہے جو الف یا واؤ (مصوتوں) پر ختم ہوتے ہیں۔ جیسے خدای سخن، روی خوب، ہمزہ علیہ نصف ی ہے اور پرانے نسخوں میں (ٔ) کی شکل میں برابر ملتی ہے۔ عربی علامتِ ہمزہ جو صرف (ع) کے شوشے کی طرح (ء) لکھی جاتی ہے وہ فارسی مخطوطات میں نہیں ہے۔ اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ علامتِ اضافت و توصیف دراصل مخفف ''ی'' ہے ہمزہ نہیں۔'' (۷)

معلوم ہوا کہ ہمزہ کی شکل (ء) عربی ہے اور (ٔ) فارسی۔ فارسی میں یائے اضافت پر ہمزہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ پہلوی روایات کے مطابق اضافت زیر سے نہیں بلکہ ی سے ادا کی جاتی ہے۔ ایک یے پر دوسری نصف ی کیوں لکھی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں بعض حضرات مثلاً نیاز فتح پوری الف یا واؤ مصوتہ پر ختم ہونے والے الفاظ کے بعد اضافت کے لیے محض ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً سوءِ ظن، علماءِ اسلام۔ میرے نزدیک اب یہ طریقہ مستحسن نہیں۔ کیونکہ اردو میں ہمزہ نہ نصف ی کی قائم مقامی کرتا ہے نہ سالم ی کی۔ اردو لفظ کے بیچ ہمزہ صرف وہی کام کرتا ہے جو الف متحرک کرتا۔ اردو یائے اضافت کے ہمزہ کو پہلوی روایت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد کے بیان سے واضح ہوا پہلوی میں اضافت کا اظہار (ی) سے کیا جاتا تھا جسے ہم نے اردو میں یائے معروف کا نشان قرار دیا ہے۔ ہمزہ اسی (ی) کا نصف ہے لیکن اضافت کی شکل میں اس کی آواز یائے معروف کی نہیں یائے مجہول کی ہوتی ہے۔ بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ یائے مجہول کی امداد کرتی ہے۔ اس طرح اردو میں یائے اضافت کا ہمزہ واقعی تلفظ کا صوتی ترجمان ہے اور بس۔

اردو رسم الخط کا یہ اعجوبہ ہے کہ ے اور واؤ دونوں حروف ایک مصمتے کی آواز کی بھی نشانی ہیں اور بعض مصوتوں کی بھی۔ واؤ فی الوقت زیر بحث نہیں۔ یائے تحتانی کی مختلف آوازیں یہ ہیں:

ا۔ مصمتہ: ان تمام صورتوں میں جہاں تحتانی متحرک ہوتی ہے۔ مثلاً یار، دیار، کیا، زاویہ، عندیہ۔ مصمتے کی صورت میں تحتانی کے معروف یا مجہول ہونے کا سوال نہیں۔

۲۔ مصوتہ: ان تمام صورتوں میں جہاں تحتانی ساکن ہوتی ہے۔ یہاں تین مصوتوں کا کام دیتی ہے۔

الف: یائے معروف پیلا لڑکی

ب: یائے مجہول اکیلا لڑکے

ج: یائے لین کیسا ئے

مندرجہ چار آوازوں کو ایک حرف تحتانی سے ادا کیا جاتا ہے۔ ان میں تحتانی کی بنیادی آواز کیا ہے؟ مصمتے کی یا مصوتے کی؟ اردو رسم الخط میں قاعدہ یہ ہے کہ ہر حرف کے نام کی پہلی آواز اس حرف کی بنیادی آواز ہوتی ہے۔ عبرانی میں تحتانی کا نام یود (ید) تھا جو عربی میں 'یا' کہلایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تحتانی کی بنیادی آواز یود اور یا کی ابتدائی مصمتہ آواز ہے جو انگریزی y سے ادا کی جاتی ہے۔

کیا تحتانی تنہا لکھی جا کر مصوتہ کی آواز دے سکتی ہے۔ اردو رسم الخط کی روایات کو دیکھ کر میرا جواب ہے "نہیں۔"

مصوتے مختصر ہوتے ہیں یا طویل۔ اردو خط میں مختصر مصوتے اعراب (زبر، زیر، پیش) سے ادا کیے جاتے ہیں۔ طویل مصوتے اعراب تحتانی یا واؤ سے فتحہ + تحتانی = اے۔ کسرہ + تحتانی = اے یا ای۔ اردو خط کا دوسرا اعجوبہ یہ ہوا کہ طویل مصوتے کی مفرد آواز کو اردو رسم الخط میں دو یا تین آوازوں کا مجموعہ فرض کر لیا گیا ہے۔

"ایک" کے ہجے ہیں الف زیر، ے ساکن، ک موقوف

"کے" کے بیچ میں ک زیر یے

گویا لفظ کا وسط ہو یا آخر۔ تحتانی سے مصوتے کا کام لینے کے لیے اس کا ماقبل مکسور (یا مفتوح) ہونا ضروری ہے۔ آئے، گائے میں آخری آواز مصوتے کی ہے جو محض ی سے ادا نہیں ہو سکتی بلکہ یے ماقبل مکسور سے یہ کسرہ ہمزہ پر ہے جو الف کی بدلی ہوئی شکل ہے یعنی (ئے) برابر ہے (اے) کے۔ ہمزہ نہ ہو تو تحتانی مصمتہ رہ جائے گی۔ "گائے" میں ہمزہ نہ لکھا جائے تو اس کا تلفظ ہوگا۔ یعنی آخری آواز وہی ہوگی جو راجیہ "مدھیہ" کی ہوتی ہے۔ ہندی میں جائے، گائے جیسے الفاظ کو نہ لکھ کر نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ان الفاظ کو بروزن فاع ظاہر کرنا مقصود ہے۔ بڑی ماترا ہے۔ لکھنے سے اس کا تلفظ گا + اے (بروزن فعلن) ہو جاتا۔ اس سے بچنے کے لیے لکھا گیا۔ ناگری خط کو کیا کیا جائے وہاں تو جے، وجے کو لکھا جاتا ہے حالانکہ اب ان الفاظ کا تلفظ صاف صاف ہے۔ اردو میں گائے بغیر ہمزہ کے لکھی جائے تو ہم بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوں گے جو ہندی میں جائے، گائے، ہے، وجے جیسے الفاظ کے سے املا میں ہوتی ہے۔ یعنی مصمتے سے مصوتے کا کام لینا۔ اردو میں آئے، جائے پر ہمزہ لکھنے کا رواج خواہ مخواہ نہیں ہو گیا۔

الف یا واؤ ساکن کے بعد یے کی آواز کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں: ایک طویل، دوسری خفیف۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ان مقامات پر ہمزہ کے استعمال کے کچھ قاعدے بنائے جو یہ ہیں:

> "اس بات کو یہ بھولنا چاہیے کہ ہمزہ الف کا قائم مقام ہے۔ پس جب دو حروف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو ان کے بیچ میں ہمزہ آ سکتا ہے نہیں تو نہیں، اس لیے:
>
> آؤ۔ جاؤ۔ گیت گاؤ۔ دولڑ کے آئے۔ آپ آئے۔
>
> میں آؤں تو کیا لاؤں
>
> میں چاہتا ہوں کہ آرام سے سوؤں

وغیرہ میں ہمزہ لکھا جائے۔ مگر

"بناؤ سنگھار، بھاؤ تاؤ۔ نبھاؤ، گھماؤ، کڑھاؤ"

میں ہمزہ کا کچھ کام نہیں۔ اسی طرح گائے، چائے، رائے اور ہائے میں بھی ہمزہ نہ چاہیے اور یہی حال "دیو اور سیو اور ریو ریا" وغیرہ کا ہے۔ ان لفظوں میں "الف ی" "الف و" یا "یے و" مل کر ایک آواز دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے بیچ میں ہمزہ کی گنجائش نہیں۔" (۸)

موصوف کا مطلب ہے کہ جب الف یے۔ الف و۔ یے ول کر ایک صوت رکن (Syllable) ہوں تو ہمزہ نہ لکھا چاہیے۔ دیو سیو کو فی الحال چھوڑیے کیونکہ ان میں ومصمتہ ہے۔ بقیہ لفظوں میں 'یے' یا 'و' خفیف مصوتے ہیں۔ اس اصول کا تجزیہ کرنے کے لیے طویل اور خفیف دونوں آوازوں پر فرداً فرداً غور کیا جائے اول طویل آواز کو لیجیے۔

آئے۔ جائے کا دوسرا جز و اگر طویل مصوتہ ہو یعنی یہ الفاظ بروزن فعلن (ع کہ یہ ٹوٹا ہوا تارامہ کامل نہ بن جائے) ہوں تو ان میں دوسرے جز و "ئے" میں ہمزہ دراصل الف کی نمائندگی کر رہا ہے۔ یعنی یہ "اے" ہے جو لفظ کے درمیان آنے کی وجہ سے ہمزہ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اب ذیل کے مصرعوں میں یائے اضافت ملاحظہ ہو جہاں "ئے" طویل ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

بیاباں فنا ہے بعد صحرائے طلب غالب

نوائے خفتۂ الفت اگر بیتاب ہو جاوے

(غالب)

گلشن میں کہیں بوئے دمِ ساز نہیں آتی اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

(ثاقب)

ہے اب بھی وقت، زاہد ترمیم زہد کر لے سوئے حرم چلا ہے انبوہ بادہ خواراں

(فیض)

ان تمام مصرعوں میں "ے" کی آواز "اے" کی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تلفظ

کو اردو املا میں ہمزہ کے بغیر محض ایک تحتانی یے سے کیوں کر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ "بوئے" لکھ کر اسے بو+اے بروزن فعلن پڑھنے سے قاصر ہوں۔ میری رائے میں ایسے موقعوں پر اردو تحریر میں ہمزہ نہ لکھنا ناروا ہی نہیں نادرست بھی ہے اور اگر میری بات تسلیم کر لی جائے تو وہ اصول تو ختم ہو گیا کہ یائے اضافت پر ہمزہ نہ چاہیے۔

اب دوسری صورت ملاحظہ ہو جہاں الف اور واؤ کے بعد "ی" کی آواز خفیف ہوتی ہے یعنی "آئے" بروزن، فاع ہوتا ہے۔ مثلاً

ع آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب

یائے اضافت کی شکل میں اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

ع تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

ع یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

ع بوئے گل ، نالۂ دل ، دودِ چراغ محفل

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے صاف یائے اضافت کا ذکر نہیں کیا لیکن ان کا اصول یہی ہے کہ ایسی صورت میں ہمزہ نہ لکھا جائے۔ ان کا سہو یہ ہے کہ انھوں نے فرض کر لیا کہ بعض الفاظ میں آخری یے یا واؤ ہمیشہ طویل بولے جاتے ہیں (مثلاً ان کی مثالوں میں آؤ، جاؤ، گاؤ، آئے، آؤں، لاؤں) اور بعض دوسرے الفاظ میں ہمیشہ خفیف (مثلاً ان کی مثالوں میں نبھاؤ، گھماؤ، ہائے وغیرہ) اب حقیقت یہ ہے کہ گو ہم ان تمام الفاظ کو عموماً خفیف یے یا واؤ سے بولتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات طویل بھی بولتے ہیں جیسا کہ اشعار میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ خفیف تلفظ والے الفاظ میں ہمزہ کے حذف کا جواز ہو سکتا تھا لیکن اردو میں الف یا واؤ ساکن کے بعد آنے والے یے یا واؤ کی کتابت میں ان کے طول یا اختصار کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ مثلاً:

طویل	خفیف
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے	کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی	ہونٹوں پہ ترے دیکھوں ہنسی آئی ہوئی سی

پھر چھپ کے مجھے پکارتا ہے کوئی کوئی مرتا ہے کیوں خدا جانے
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں؟ پر یہ بتلاؤ دور سے چھچھڑے دکھاؤ نہیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک مضمون (۹) میں دو مصوتوں کے بیچ ہمزہ کے لانے پر بہت زور دیا ہے۔ بہت سی مثالیں دے کر بار بار لکھتے ہیں۔

ا۔اردو میں ہمزہ محض دو ساتھ ساتھ آنے والے مصوتوں (Conjunct vowels) جوڑ کر ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۸)

۲۔" ہمزہ کی اپنی کوئی الگ سے آواز نہیں بلکہ یہ دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان کرتا ہے۔۔۔اردو میں اسے املائی سہولت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے کہ الف کے بعد واؤ یا یے کی آوازیں بغیر ہمزہ کے ادا ہو ہی نہیں سکتیں۔" (صفحہ ۱۹)

۳۔ان کی کئی تصریفی صورتوں کو اردو میں ہمزہ کے بغیر لکھنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر دیکھیے: آنا سے آؤں، آئیں، آؤ، آئے۔" (صفحہ ۲۰)

آیئے جایئے کی مثالیں دے کر لکھتے ہیں:

۴۔" یہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آرہے ہیں اس لیے ہمزہ کا استعمال ضروری ہے۔" (صفحہ ۲۲)

۵۔ان تمام الفاظ میں جہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آتے ہیں ان کے بیچ میں ہمزہ لگتا ہے۔ البتہ مسئلہ اور جرأت اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔"۔۔ (صفحہ ۲۲)

جرأت اور قرأت میں الف پر ہمزہ لکھنے کے کیا معنی ہیں؟ الف متحرک اور ہمزہ کی آوازیں یکساں ہیں اور اس لیے ان الفاظ کو یا جرأت، قرأت لکھا جانا چاہیے یا پھر جرت،

قرئت لکھنا ممکن ہوتا۔ چلن الف کے ساتھ لکھنے کا ہے۔ میری رائے میں اردو میں ان الفاظ میں الف پر ہمزہ لکھنا زائد ہے۔

آدم بر سر مطلب۔ صوتیات اور املا کی بنا پر ہمزہ کی ضرورت کی شد و مد سے تحسین کرنے کے بعد جب ڈاکٹر نارنگ یائے اضافت پر آتے ہیں تو ملتجیانِ عربی و فارسی کی ہیبت سے وہ اپنے وضع کردہ اصول کو بھلا دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"اگر مضاف اردو میں الف۔ یا واؤ پر ختم ہو تو اضافت یائے مجہول سے لکھی جائے گی۔" (صفحہ ۲۶)

اب دو مصوتوں کے بیچ ہمزہ کی ناگزیری کا اصول کیا ہوا؟ یہ صوتیاتی سطح سے ہٹ کر صرفی سطح پر چلے جانا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ نے یائے لین کی اضافت کا سوال بھی اٹھایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "وہ الفاظ جن میں یائے مجہول الف کے بعد نہ ہو بلکہ ماقبل مفتوح ہو۔ مثلاً پے، مے ان کا معاملہ مختلف ہے۔۔۔ ایسے الفاظ کو کسرہ سے مضاف کرنا چاہیے۔ پے معرفت، مے ہوش ربا، شے لطیف۔"
> (صفحہ ۲۶)

مجھے تسلیم ہے کہ فارسی دستور کی رو سے یہاں ہمزہ نہیں لکھا جاتا۔ لیکن میری درخواست ہے کہ تلفظ اور صوتیات پر دھیان دیجیے۔ ہم ان صورتوں میں ہرگز م + یے = میے (ہندی لفظ) نہیں بولتے بلکہ م + اے (ہندی لفظ) بولتے ہیں یعنی "مے ہوش ربا" میں "مے" کا تلفظ بالکل "گئے" کے وزن اور قافیے کا ہے۔ اس لیے میری سفارش ہے کہ اردو لکھتے وقت ان الفاظ میں ہمزہ لکھا جائے تاکہ املا اردو تلفظ کی بہتر ترجمانی کر سکے۔

مں جس کی طرح کی ہمزہ کی مخصوص آواز نہیں اس لیے اس میں اردو میں مماثل فارسی اور ہندی الاصل الفاظ کی کتابت میں فرق کرنا پسند کروں گا۔ بعض بزرگ آئے، جائے جیسے ہندی الاصل الفاظ میں بے تکلف ہمزہ لکھتے ہیں لیکن جب وہ فارسی الفاظ رائے، ہوائے پر آتے ہیں تو

ان کا قلم یے پر ہمزہ لگانے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی قسم کا امتیاز عروض میں ملتا ہے۔ ہندی الاصل الفاظ کے آخری الف، و۔ی۔ دبانے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن عربی فارسی الفاظ کے آخر میں نہیں۔ گویا اردو زبان میں دیسی الفاظ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ ان کے آخری الف۔ و۔ی نحیف ہیں کہ انھیں حسب ضرورت دبایا جاسکتا ہے۔ جو حضرات فارسی لفظ رائے کی یے پر ہمزہ لگانے کی ضرورت نہیں سمجھتے گویا ان کے نزدیک یہ تحتانی بہت قوی ہے۔ وہ ہندی الفاظ آئے، جائے کی یے پر ہمزہ لکھتے ہیں۔ گویا یہ تحتانی بہت نحیف ہے اور اسے ہمزہ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ ان سے میری گذارش ہے کہ ایک ہی اردو میں اب فارسی اور ہندی الفاظ کے بیچ اس امتیاز کو ترک کر دیجیے۔

جب تک آئے، جائے، گائے، چائے وغیرہ پر ہمزہ لکھنے کا چلن ہے میں جائے استاد اور نوائے غالب میں بھی ہمزہ لکھنا مرجح قرار دوں گا۔ میں اضافت کے ہمزہ کو حذف کرسکتا ہوں بشرطیکہ اردو میں آئے، جائے کے علاوہ آئی، آؤ، سوئی، کوئی وغیرہ کا ہمزہ بھی حذف کر دیا جائے۔ کہا جائے گا کہ پھر آس، گھاس کے س کی مماثلت پر ''خاص'' کو بھی س سے لکھنے کا مطالبہ کرو۔ میرا جواب ہے کہ بے شک صوتی تقاضا خاص کو بھی س سے لکھنے کا ہے لیکن اردو میں اس کا چلن خواص تو درکنار عوام میں بھی نہیں۔ جب کہ یائے اضافت ہمزہ لکھنے کی صوتی اور املائی غرض بھی ہے اور بھرپور چلن بھی ہے۔ جنھیں شک ہو وہ اردو کی کسی کتاب، رسالے اور دستی تحریر کو اٹھا کر دیکھ لیں۔ ۹۵ بلکہ ۹۹ فی صدی صورتوں میں یائے اضافت پر ہمزہ ملے گا۔ اگر یہ قواعد کی رو سے غلط ہے تو املا میں بھی غلط العام کو صحیح مان لیجیے۔ (۱) ہندوستانی زبان بمبئی جنوری اپریل ۷۷ء (۲) حقائق)

پس نوشت۔ اب یہ بحث غیر ضروری ہو گئی ہے کیونکہ ہندو پاک دونوں جگہ مان لیا گیا ہے کہ یائے اضافت پر ہمزہ لگانا چاہیے۔ ملاحظہ ہو۔

ا۔ سفارشات املا و رموز اوقات۔ مدون اعجاز راہی۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (جون ۱۹۸۶ء) ص ۳۰

۲۔املا نامہ مرتبہ' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔طبع دوم ۱۹۹۰ء ص ۸۶۔۸۷

حواشی

۱۔ منثورات، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، صفحہ ۳۶، انجمن ترقی اردو، دلی ۱۹۶۸ء

۲۔ خطوط غالب، مرتبہ مالک رام، صفحہ ۳۰، ۱۹۶۲ء

۳۔ دریائے لطافت، اردو ترجمہ، صفحہ ۲۶۱، بحوالہ منثورات صفحہ ۵۶

۴۔ مقدمہ منثورات، صفحہ ۱۶

5. The Phonetics of Arabic By W.H.T. Gaidel P. 30-31 1925.

۶۔ اردو میں ہمزہ کا استعمال از ڈاکٹر محمد عقیل۔ ہماری زبان، ۲۲ فروری ۱۹۶۶ء

۷۔ یائے مخفی اور اس سے متعلق دستوری واملائی مسائل از ڈاکٹر نذیر احمد مشمولہ فکرو نظر شمارہ ۱، ۲، ۱۹۷۲ء صفحہ ۷۳

۸۔ اردو املا از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مشمولہ "اردو میں لسانیاتی تحقیق" صفحہ ۹۳، طبع اول مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بمبئی ۱۹۷۱ء

۹۔ ہمزہ کیوں؟ مشمولہ' اردو میں لسانیاتی تحقیق، مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی

☆

اردو زبان اور فارسیت

میر امن نے پہلی یہ نظریہ پیش کیا کہ اردو ایک ملواں زبان ہے جو فارسی بولنے والے نو وارد مسلمانوں اور دیسی زبان بولنے والے مقامی باشندوں کے سماجی و معاشی ربط سے وجود میں آئی۔ اس نظریہ کو وہ سب علماء دہراتے رہے جو علم لسانیات سے ناواقف تھے۔ ڈاکٹر سبزواری نے داستانِ زبان اردو میں واضح کیا کہ دال اور چاول کو ملا کر کھچڑی تو بن سکتی ہے لیکن دو زبانوں کو ملا کر تیسری زبان نہیں بنائی جا سکتی اور یہ حقیقت ہے۔ زبان کے بنیادی مادے اور اصول کسی ایک زبان کے ہوں گے۔ ماخوذ زبان کو اسی ماخذ زبان کی بدلی ہوئی شکل کہا جائے گا۔ اردو بنیادی حیثیت سے کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی وہی زبان ہے جو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ شروع شروع میں اردو اور ہندی نام کی دو زبانیں نہ تھیں۔ ایک ہی زبان تھی جسے فارسی کے مورخ اور لغات نگار زبان دہلوی یا ہندوی کہتے تھے۔ بعد میں اس کے دو روپ ہو گئے، اردو اور ہندی۔ ابتدا میں ان کی تفریق محض رسم الخط کی بنا پر کی گئی، بعد میں لفظیات میں بھی اختلاف ہو گیا۔

یہ ایک اتفاق ہے کہ شروع میں کئی صدیوں تک کھڑی بولی کے اردو روپ کی جن اہلِ قلم نے سرپرستی کی وہ فارسی سے اس حد تک واقف تھے کہ وہ فارسی میں بھی ادبی تخلیق کی قدرت رکھتے تھے۔ اسلامی دورِ حکومت میں فارسی کی وہی حیثیت تھی جو آج انگریزی کی ہے۔ عالم اسی کو مانا جاتا تھا جو فارسی بلکہ عربی میں بھی خاصا کمال رکھتا ہو۔ شروع شروع میں ان لوگوں نے ہندوستان کی زبان میں لکھنا چاہا تو کھڑی بولی میں عربی فارسی کی پٹ دے کر کام چلایا۔ فارسی

کی یہ پٹ محض اتنی تھی جتنا آٹے میں نمک۔ ایسا کوئی لفظ نہ لاتے تھے جو کسی عامی کو سمجھنا دشوار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی ادب کو ہندی والے دکنی ہندی کہتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بعد کے ادب کے لیے تو ٹھیک نہیں لیکن ابتدائی صوفیانہ ادب ایسا ہے کہ اس پر ان کا قبضہ مخالفانہ ایک حد تک بیجا دکھائی نہیں دیتا۔

ابتدائی نمونے (۱) ملاحظہ ہوں۔ سولھویں صدی کے اوائل میں شاہ میراں جی شمس العشاق کہتے ہیں:

جو تیرا ہوئے کرم تو ٹوٹے سبھی بھرم

اس کارن تجھ کو دھاؤں اور تیرا نام لیوں

ہے تیرا انت نہ پار کس سکھوں کروں اُچار

(شہادت الحقیقت)

اور انھیں کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی بولی یہ ہے:

اللہ سنوروں پہلے آج کیتا جن یہ دھوں جگ کاج

جگتر کیرا توں کرتار سکھوں کیرا سرجن ہار

ترلوک نرجے سری بل نت بکھانے ہو تل تل

سپت سمندر سیاہی بھریں سب روکھ لیکھنی قلم کریں

دھرتی اکاس کیے پتر لیکھن بیٹھیں کریں چتر

قیامت لگ جے کریں بڑھت ناتج قدرت ہوئے گھٹت

(ارشادنامہ)

اگر اردو انھیں خطوط پر چلتی تو ہندی اور اردو کی تفریق ہی نہ ہوتی۔ وحدت دوئی میں نہ بدلتی۔ ابتدائی ادیب ایک دبدھا میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں کہ نومولود زبان کی پرورش بھاشائی ڈھنگ سے کریں یا فارسی رنگ سے۔ واضح ہو کہ فارسی رنگ سے مراد محض فارسی نہیں۔ اس میں عربی بھی شامل ہے کیونکہ اردو میں جو عربی عناصر آئے ہیں وہ فارسی کی معرفت، فارسی کا جزو بن کر ہی آئے ہیں۔ دکنی اردو میں لفظیات اور ادبی روایات دونوں کے معاملے میں فارسی اور ہندی میں ایک آویزش دکھائی دیتی ہے کہ کون اسے اپنی سرپرستی میں لے لے۔ آہستہ آہستہ فارسی غالب ہوتی گئی اور ہندی پیچھے ہٹتی گئی۔ مشہور ہے کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے ولی کو مشورہ دیا تھا "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار، افتادہ اندور ریختہ بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔"

زندگی میں ایسی نصیحتیں بہت کم ملتی ہیں جو زندگی کا رخ ہی موڑ دیں۔ ولی کو بھی یہ ایسا زریں مشورہ ملا کہ اس نے اس کی شاعری کی کایا ہی پلٹ دی۔ جس طرح الٰہ آباد کے سنگم میں گنگا اور جمنا کے پانی الگ الگ دکھائی دیتے ہیں اور دونوں کے بیچ ایک دھاری کھنچی ہوتی ہے، اسی طرح کلام ولی دو مختلف رنگوں اور آہنگوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ہند آریائی اور ایرانی اسالیب صاف صاف، الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ محض زبان کو پیش نظر رکھ کر ولی کے کلام سے یہ متضاد نمونے ملاحظہ ہوں۔ (الف)

پرت کی جو کنتھا پہنے اسے گھر بار کرنا کیا ہوئی جوگن جو کئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا
جو بھوے نیر نیناں کا اسے کیا کام پانی سوں جو بھوجن دکھ کا کرتے ہیں اسے آدھار کرنا کیا

(ب)

روبرو ہونے میں اس کے حالِ دل ظاہر ہوا جلوۂ آئینہ رویاں کاشفِ ہر راز ہے
دردمندوں کو سدا ہے قولِ مطربِ دل نواز گرمیِ افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

غضب سوں چہرۂ رنگیں ، بہار ناز و ادا　　　بہار حسن میں ہے لالہ زار ناز و ادا

قائم چاند پوری نے دعویٰ کیا تھا:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　　اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

حقیقت یہ ہے کہ صوفیائے کرام کا لچر دکنی کو قائم سے پہلے ولی ہی نے فارسی کی چستی و پختگی عطا کر دی تھی۔ اس دکنی شاعر نے کیسی کیسی بلیغ اور شگفتہ ترکیبیں وضع کیں:

طرۂ طراز تشنہ دیوانگی، بہار ناز و ادا، کوہسار خاموشی، منزل شبنم، گرمیِ بازار حسن، حسن موج جوئبار، چمنستان ادا، گلدستۂ اعمال، رگِ یاقوت، موج تبسم، شعلۂ آواز اور تو بہار ناز جیسی ترکیبیں جو غالب کی دین سمجھی جاتی ہیں سب سے پہلے ولی نے استعمال کیں۔ پریم چند کے ناول کی ترکیب بازار حسن بھی ولی کے یہاں ملتی ہے۔ ولی نے فارسی اور ہندی کے میل سے خوش آئند گنگا جمنی ترکیبیں بھی بنائیں:

خوش بچپن، شیریں بچپن، نقش چرن، چھب دل نواز، گلدستۂ خوش باس۔

سترہویں صدی سے شمالی ہند میں بھی اردو ادب کی تخلیق کی ایک مسلسل روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ وہاں پہلی تصنیف افضل کی بکٹ کہانی ملتی ہے۔ اس کی زبان میں استواری و پختگی نہیں۔ بیشتر وہ برج بھاشا نما ہندی ہے تو شاذ اس میں پنجابی الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن شاعر کو اس لڑکھڑاتی زبان سے پوری تشفی نہیں ہوتی۔ اس لیے جہاں وہ زور سخن میں بہہ جاتا ہے وہاں صفحے کے صفحے فارسی میں لکھ جاتا ہے اور اگر فارسی نہیں کہتا تو ریختے کے انداز میں نصف مصرع فارسی اور نصف اردو کہہ جاتا ہے۔

ع چو شد مدت پیا کے سنگ رہتے　　　ع اگر باشد خطایم بخش دیکھو

وہ فارسی کو غیر زبان نہیں سمجھتا اس لیے حسب ضرورت مصرع میں بے تکلف ایسی فارسی ترکیبیں بھی لے آتا ہے جن کی اجازت نہیں۔

ع وگرنہ جاں زتن باہر پڑے گا

سب سے زیادہ مورد اعتراض وہ الفاظ ہیں جن میں ہندی مادوں پر ایسے فارسی لاحقے

چسپاں کر دیے ہیں جن کی کسی دور میں اجازت نہیں رہی۔ مثلاً:

ع رہا جل وصل کا ، سوکھا نہالم

ع خرد کے گھر میں جا دھوش مچائی

غرض یہ ہے کہ بکٹ کہانی میں شاعر اردو زبان کے بارے میں تجربے کر رہا ہے۔ وہ فارسی اور ہندی کو طرح طرح سے ملا کر دیکھتا ہے۔ بکٹ کہانی میں خالص فارسی اور خالص ہندی کی دو انتہاؤں کے بیچ کے تمام مدارج ملتے ہیں۔

میر جعفر زٹلی ہزل گو ہیں۔ ان کا کلام قابل اعتنا نہ سہی لیکن زبان کے معاملے میں ان کے یہاں بھی فارسی اور ہندی کی وہی کھچڑی ملتی ہے جو بکٹ کہانی میں ہے۔ وہ تو

ع نہ ہلد نہ تلد نہ جنبد زجا

تک کہہ جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بکٹ کہانی کا برج بھاشائی لہجہ زٹلی کے یہاں کھڑی بولی میں بدل جاتا ہے۔

ان بزرگوں کے بعد جب اہل شمال دکنی ادب یعنی ولی کے کلام سے آشنا ہوئے تو ان میں زبان کے معاملے میں یک گونہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ فائز اور حاتم کی زبان ولی کے دوسرے دور کے کلام سے چنداں مختلف نہیں۔ اس میں ہندی الفاظ کافی پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض میر و مرزا کے یہاں متروک ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے میر و مرزا کی زبان وہی اوسط رنگ اختیار کر لیتی ہے جو بعد میں مستند ہو جاتا ہے۔

زبان کے معاملے میں جس طرح اردو شاعر سترہویں صدی کے آخر میں راستہ ٹٹول رہے تھے حیرت ہے کہ اردو کے نثر نگار ایک صدی بعد بھی اسی عدم اعتماد میں جتلا دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے کئی معصوم تو یہ سمجھا کیے جیسے وہی اردو میں نثر لکھنے کا اجتہاد کر رہے ہوں۔ وہ ایسے بوکھلائے ہوئے تھے جیسے آئینہ خانے میں طوطی۔ وہ کئی نثر سے تو یقیناً ناواقف تھے لیکن انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کی زبان سے کیوں نہ تحریک لی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اردو نثر میں مقامی و بیرونی الفاظ کا تناسب کیا ہو۔ وہ فارسی نثر نگاروں اور اردو شاعروں کے سامنے

ایک احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ شعر میں اردو کے استعمال پر اعتراض نہیں لیکن معلوم نہیں کیوں نثر میں اردو لکھنے سے جیسے گالی لگتی تھی۔ قارئین نے اردو کے متعدد شعری مخطوطات میں دیکھا ہوگا کہ نثری ترجمہ فارسی میں ہوتا ہے۔ بعض اردو مثنویوں میں فصل کے عنوان فارسی میں ہوتے ہیں۔ غدر کے بعد ۲ جنوری ۱۸۵۹ء کو غالب جیسا شاعر اردو نثر لکھنے کی فرمائش پر یوں بپھرتا ہے۔

''میاں اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو؟''

اٹھارویں صدی میں پے بہ پے کئی مصنفوں نے اردو نثر لکھی تو متاخرین فارسی کے سبک ہندی کو اپنا نمونہ بنایا اور اردو میں اس کا جواب لکھنے کو کمال انشا سمجھا۔ ۱۷۳۲ء میں فضلی نے کربل کتھا اس لیے لکھی تھی کہ خواتین فارسی روضۃ الشہداء کو نہیں سمجھ سکتی تھیں اور افسوس کرتی تھیں۔ ان کی خاطر انھوں نے عبارت ہندی میں ترجمہ فارسی کیا لیکن کیا ہندی لکھی! شاید فارسی سمجھنا اتنا مشکل نہ ہوگا جتنا ان کی دقیق اردو۔ جہاں زور باندھتے ہیں تو یہ اردو لکھتے ہیں:

> ''یعنی سید انبیا اور سید اصفیا، صدر صفدر امکان کا، محرم خلوت خانۂ لا مکاں کا عطر افروز محافلِ جانی، بخور اندوز روحانی، سلطان مسانیدِ رسالت کا، برہان مقاصدِ نبوت و جلالت کا، بادشاہِ عرش بارگاہ، خاتمِ انگشت ید اللہ، ترجمانِ اسرارِ غیبی، دیدہ کشائے لاریبی، نقطہ پرکار احدیت کا، مرکز دائرہ صمدیت کا، طغرائے مناشیر قدر و قضا، دیباچۂ دساتیر خوف و رجا۔۔۔۔'' (صفحہ ۲۳)

نساء و عورات اس زبان کو پڑھ کر ضرور فضلی کو دعائیں دیں گی۔ سودا کے دیباچۂ کلیات کی زبان بھی اسی انداز کی ہے۔

> ''ضمیر منیر پر آئینہ دارانِ معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطیِ ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختۂ در ریختہ، خامۂ دوزبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر فرمائے۔ لازم ہے کہ

تحویل سامعہ سخن سنجانِ روزگار کروں۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سودا شعر میں اچھی بھلی زبان لکھتے ہیں انھیں نثر کے میدان میں آتے ہی کس کا سایہ ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ نثر نگار شاعروں کے مقابلے میں اپنی نثر کو ان سے بھی زیادہ شاعرانہ بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے تا کہ انھیں بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ بھی کچھ ہیں۔ نو طرز مرصع میں تحسین اسی انداز سے لکھتے ہیں:

> "بیچ میدانِ تشریح و توصیفِ ذات اس مفرد کائنات کے، فرسِ ہلال آ ہوئے قلم، اوپر صفحۂ گلشن افلاک چراگاہ سفیدۂ کاغذ کے، جلوہ نمائش کا پا کرنا فریزہ بہارِ عرصہ تحریر کا نہیں ہو سکتا۔" (صفحہ ۵۲)

میرا مدعا یہ نہیں کہ فضلی یا تحسین اپنی کتاب میں ہر جگہ ایسی ہی زبان لکھتے ہیں۔ یا انھیں علم نہ تھا کہ بول چال میں اردو کس طرح بولی جاتی ہے۔ تحسین اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں:

> "پس دوا اپنے کو بلا کر بیچ خلوت کے کہا کہ اگر مجھ کو زندہ چاہتا ہے تو سر انجام تجارت کا تیار کر دوالا خون اپنا کروں گی اور سر تیرے دھروں گی۔" (صفحہ ۲۴۶)

ان اصحاب کی کتابوں کا بیشتر حصہ کس قدر سہل اسلوب میں ہے لیکن پوری طرح سادہ کہیں نہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی ان کا بس چلتا ہے عربیت و فارسیت سے درگذر نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک بہتر زبان فارسی زدہ ہی ہے۔ چونکہ پوری کتاب کو اس دقیق طرز میں لکھنے کی محنت شاقہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے مجبوراً ممتاز مقامات کے علاوہ بقیہ میں قلم کو سہل انگار چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی عہد میں عیسوی خاں نے قصہ مہر افروز و دلبر میں فارسی سے معرا اور ہندی سے شرابور زبان لکھی۔ مثلاً:

> "گویا بادشاہزادے کا دل تو ہے کسان اور تن ہوا اس کا کھیت۔ تس کوں حسن آباد کے جو سگھن سگھن درخت ہیں سوئی ہوئے سیام گھٹا، اور پھول جو جھڑیں ہیں درختوں کے سوئی ہوئے بوندیں۔ سو یے ماتوں

اس کاتن روپی جو ہے کھیت، تس پہ برسے ہے۔" (صفحہ ۱۱۲)

"یہ چاند کہ سدھا ندھ تھا سو فواروں کی بوندوں کر اپنی کرنوں کی سدھا کے مینہ برساوتا تھا سو اب بجھ ندھ ہوا اور بکھ برساوتا ہے۔ پے بکھ کا کام تو مارناں ہے سو یہ مجھے مارتا کیوں نہیں؟ اور یہ جو کنول کا جودہ ہے سو دکھ کا دینے والا تھا۔ اب اگن کا کنڈ ہو کے مجھ کو دہتا ہے۔ پے جلا مارتا نہیں سو کیوں؟" (صفحہ ۲۰۵)

اس داستان کا زمانہ تصنیف اٹھارویں صدی کا نصف اول قیاس کیا جاتا ہے۔ یہ کم و بیش یقینی ہے کہ اس کے مصنف کو اردو کی دوسری نثری تحریروں سے واقفیت نہ تھی۔ اس لیے اس نے اپنی کتاب ایک جدا رنگ میں لکھی۔ فضلی اور تحسین کی منشیانہ زبان کی بہ نسبت یہ زبان سندھر اور سنور کر بعد کی اوسط زبان کے زیادہ قریب ہو سکتی تھی۔ لیکن اس دور میں اس فارسی زدہ مرصع اسلوب کا ایسا طلسم بندھا ہوا تھا کہ اکا دکا باغیانہ یا اصلاحی کوششیں ہوئیں بھی تو کسی نے توجہ نہ کی۔ اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن کے اردو ترجمے کیے تو ان میں بے ضرورت عربی فارسی کا نام نہ تھا۔ گویا جملوں کی نحوی ساخت اردو قواعد کے مطابق نہ رہ کر عربی کا لفظی ترجمہ تھی۔ مثلاً:

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمھارے پاس پیغمبر تم میں سے بیان کرتے تھے اوپر تمھارے نشانیاں میری۔" (شاہ رفیع الدین)

"اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پونچھے تھے رسول تمھارے اندر کے سناتے تم کو میرے حکم۔" (شاہ عبدالقادر)

لفظیات کی حد تک یہ زبان آج کی ہے گو نحو عربی ہے۔ صحیح معنی میں اردو کا پہلا نثر نگار مہر چند کھتری مہر ہے، جس نے قصۂ ملک محمد و گیتی افروز (۱۲۰۳ھ) سلیس روزمرہ میں لکھا اور اتفاقی طور پر نہیں بلکہ شعوری فیصلے کے طور پر دیباچے میں کہتا ہے:

"مگر انھیں دنوں عطا حسین خاں نے چار درویش کا قصہ فارسی سے ہندی زبان میں تضمین کر کے نوطرز مرصع نام رکھا۔ سوالحق نوطرز مرصع ہے لیکن جو ریختہ زبان میں بالفاظ دقیق اور عبارت رنگین موزوں کیا ہے اس سبب مطبوع انگریزوں کے نہیں ہوا۔"

انھوں نے کسی انگریز کے درس کے لیے یہ ترجمہ کیا۔ زبان دیکھیے اور عش عش کیجیے:

"ایک دن خورشید چہر برسات کے موسم میں موافق معمول کے اپنے محل میں آرام کرتا تھا کہ یکا یک آندھی چلنے لگی اور ہوا کی شدت سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دو ایک کے بعد آندھی تھم گئی اور ہوا موقوف ہوئی تو بادشاہ کے کان میں ایک عورت کی آواز آئی کہ آہ آہ کر کے کہتی تھی کہ میں جاتی ہوں۔ کوئی ایسا ہے جو مجھے رکھ سکے۔"

اس زبان میں ہندی اور عربی فارسی الفاظ کا وہ تناسب ہے جو بعد کی معیاری اردو کا اوسط معیار ٹھہرا۔ اردو نثر کے ارتقا کے لیے انگریز بالواسطہ فرشتۂ رحمت بن گئے ۔ ان کی درسی ضروریات کے تحت اردو نثر کو فارسی نثر کے چنگل سے نجات ملی۔ فورٹ ولیم کے صاحب لوگوں نے میرامن سے دلی کا شستہ روزمرہ صفحۂ قرطاس پر نقش کرا دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کالج میں سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی جیسی کتابیں لکھائیں جن میں عربی فارسی الفاظ اتنے کم تھے کہ ان کتب کو ہندی والے ہندی کی اور اردو والے اردو کی قرار دیتے ہیں۔ سب سے نرالی سید انشاء کو سوجھی ۔ جنھوں نے قسم کھا کر ایسی داستان لکھی جس میں کوئی لفظ عربی فارسی اور ٹھیٹھ ہندی کا نہ تھا۔ اب ایسا لگتا تھا کہ فارسی زدہ مرصع زبان اور سلیس وسادہ روزمرہ کی جدوجہد میں فارسیت آخری طور پر مات کھا گئی ہے اور اردو نثر کی راہ منزل متعین ہو گئی ہے لیکن اہل اردو اتنے دور بیں نہ تھے کہ سو پچاس سال آگے کی زبان کو دیکھ سکیں۔

اہل لکھنؤ نے جہاں بادشاہت کے معاملے میں دلی سے بغاوت کی وہاں زبان کے معاملے میں بھی اہل دہلی کے منہ آئے ۔ اردو نثر کا جو کچھ ارتقا ہوا تھا انھوں نے پھر الٹی گنگا بہا کر

ادب میں وہی فضل و تحسین کے رنگ کو معتبر سکہ بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ اردو ابھی تک متاخرین فارسی کے سبک ہندی کی اسیر ہے۔ فسانہ عجائب کا پہلا جملہ ہی مبہوت کر دینے والا ہے:

"گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن یعنی محررانِ رنگیں تحریر و مورخانِ جادو تقریر نے اشہب جہندۂ قلم کو میدانِ وسیع بیان میں باکرشمۂ سحر ساز و لطیفہ ہائے حیرت پرواز، گرم عنان و جولاں یوں کیا ہے۔"

دہلی کے بڑے شعرا میں صرف مرزا غالب نے اس قدر بوجھل زبان لکھی شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا۔ تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا۔

وہ جلدی ہی رو مستقیم پر آ گئے۔ لیکن نثر میں معلوم نہیں کیوں اہل اردو فسانۂ عجائب کے صور نجم پر اس حد تک غش رہے کہ اسی رنگ میں لکھنا علم و فضل کی نشانی ٹھہرا۔

سرسید نے ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن شائع کیا تو اس طرح سہ نثر ظہوری کا جواب لکھا:

"ان حضرات کی طبع رسا، شکل رابع سے، پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے۔ کہ بدیہی الانتاج ہے ارباب فہم و ذکا، اور ناخن فکر عقدۂ لاینحل کو، پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشتِ موج دریا۔"

اس اسلوب کا استبداد اس قدر تھا کہ ۱۸۶۵ء میں ہندوؤں کا ایک مذہبی پرچہ گیاودی پتریکا نکلا تو اس کے موضوع کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی:

"اس میں اشلوک ہائے اصلِ صحائف قدیم سنسکرت مع ترجمان، بزبانِ شاستر ہائے معرفت و حقائق و علمی و عملی چند و وعظ مفیدِ خلائق و انواع حکمات پر گونہ کار آمد، و احوالِ دورۂ زماں، خصوصاً داسنِ حقیقت و اصل مراد و نیز تنقیدِ کلام درج ہوئے ہیں۔"

یہ کوئی استثنائی مثال نہیں۔ انسٹیٹیوٹ گزٹ والے سال یعنی ۱۸۶۶ء میں دلی سے ایک اور اردو اخبار نکلنا شروع ہوا تو اس کی زبان بھی ایسی ہی تھی۔ اس فارسیت کا نثر سے پہلے نظم میں

قلع قمع کیا گیا۔ خود غالب نے ابتدائی بے اعتدالی کے بعد اپنے کلام کی زبان نرمادی تھی۔ لکھنؤ میں ایک طرف انیس کے مراثی نے تو دوسری طرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے بے جا فارسیت پر ضرب لگائی۔ لیکن زبان کے معاملے میں شعر سے زیادہ نثر راہ متعین کرتی ہے۔ فارسی پرستی کا پہاڑ مجدد اردو سرسید کے تیشے سے ٹوٹا اور اس کے بعد سے اردو نثر کو اپنا بنیادی اسلوب مل گیا۔ گو اس کے بعد بھی بعض اہلِ قلم اپنی تحریروں کے بعض نمایاں حصے فارسی سے گراں بار کرتے رہے۔ مثلاً فسانۂ آزاد میں طلسم ہوش ربا کے لکھنوی ترجمے میں اور ابوالکلام کی الہلالی اردو میں بلکہ بعض اوقات نیاز فتح پوری تک کے یہاں۔ سرخ رو سلاست کے مقابل پسپا ہوتی فارسیت کی یہ آخری جدوجہد تھی۔

غدر کے بعد ہندوستان میں تہذیبی اعتبار سے جو نشاۃ الثانیہ ہوئی اس میں مصنوعی عربیت و فارسیت کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ افسوس کہ بیسویں صدی میں ایک بڑے ادیب نے زبان کے اس فطری ارتقا کو پھر چھیڑا۔ شاعر مشرق کی نظر ہندوستان سے زیادہ مشرقِ وسطیٰ پر تھی۔ وہ تسہیل سے اشکال کی طرف بڑھے۔ وہ اردو سے زیادہ فارسی میں لکھنے لگے اور اردو میں جو کچھ لکھا اس میں بھی فارسیت کے مبالغے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ آخری دور کے مجموعے بالِ جبریل کا پہلا شعر یہ ہے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

لیکن اس ڈکشن کی کسی نے تقلید نہیں کی۔ اردو ادب میں قوم پرستی کی لے تیز ہوتی گئی جس کی وجہ سے اردو میں عربی فارسی کو ان کا صحیح مقام دکھایا گیا۔ اب اندیشہ نہیں کہ کوئی اردو ادیب انشا پردازی کی چاٹ میں اپنی زبان کو عربی فارسی سے گراں بار کرے گا۔ یہ یاد رہے کہ یہ ہندوستان ہی نہیں پاکستان کی اردو کے لیے بھی سچ ہے۔

اس جائزے کے آخر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ولی کے وقت سے اردو میں فارسیت کا جو ریلا آیا اور جس کی وجہ سے ہندوستان کی ایک زبان دوسری ملکی زبانوں کی شاہراہ سے الگ تھلگ ایک بیرونی شارع پر چل پڑی۔ کیا یہ قوم کے حق میں سودمند رہا یا مضر؟ میرا خیال یہ ہے

کہ اس سے قومی کلچر کے تموّل میں اضافہ ہوا۔ اگر اردو میں محض ہندی الفاظ و اسالیب و روایات رہتے تو یہ ہندو کا شُغ ہو جاتی اور ملک ایک دولت بیدار سے محروم رہ جاتا۔ کلچر کی تازگی و بالیدگی بلکہ زندگی اسی میں ہے کہ دوسروں سے استفادے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ کی جائے۔

ع ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

(۱۔ ہمارا ادب۔ کلچرل اکیڈمی سری نگر ۱۹۷۳ء

۲۔ ہندوستانی زبان، بمبئی اکتوبر ۱۹۷۲ء

۳۔ حقائق)

حواشی

۱۔ دونوں اقتباسات بحوالہ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر، غیر مطبوعہ مقالہ از ڈاکٹر پرکاش مونس۔

۲۔ مکتوب بنام شیو نراین آرام۔ خطوط غالب مرتبہ مالک رام، ص ۲۳۶

☆

بھوپالی اردو

زبان اور بولی کی تعین میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ بالخصوص اردو جیسی زبان کے معاملے میں جسے اہل لسانیات کھڑی بولی کا ایک روپ اور ہندی کو دوسرا روپ مانتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ہی نے کھڑی بولی کو سنوارا اور نکھارا۔ اس نے استواری کے ساتھ اپنا دامن کھڑی بولی سے وابستہ رکھا لیکن ہندی نے ہرجائی پن کے ساتھ ہر طرف دام ڈالا۔ چنانچہ آج وہ بہاری سے لے کر راجستھانی تک کو اپنے کنبے میں شمول کی داعی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اردو میں بولیاں ہیں کہ نہیں۔ بولیاں نہ بھی ہوں تو ذیلی بولیاں ضرور ہیں اور یہ ذیلی بولیاں مختلف مقامات کی اردو کے علاقائی روپ ہیں۔

معیاری زبان کسی زبان کی بولیوں میں سب سے اہم بولی ہوتی ہے۔ اس کا نام معیاری زبان کی بجائے معیاری بولی ہوتا تو صحت کا حق زیادہ ادا ہوتا۔ معیاری زبان کی ایک شرارت یہ ہے کہ یہ بولیوں کے علاقے میں بھی شہروں یا کم از کم پڑھے لکھوں کی مجلس سے بولی کو باہر دھکیل کر خود اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ لیکن اسے اس قبضۂ مخالفانہ کی کچھ قیمت دینی پڑتی ہے جو یہ ہے کہ اسے متعلقہ بولی سے اثر قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسی متاثر روپ کو ہم پنجابی اردو، بہیا اردو کہتے ہیں۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی یا اردو نے اسی طرح مختلف شہروں میں اپنا ڈیرا جما لیا ہے۔ ان میں سے کچھ زیادہ اہم ہیں اور ان میں سے ایک بھوپال ہے۔ یہاں کی علاقائی زبان کو ہم اردو کی بھوپالی ذیلی بولی یا اختصار کے ساتھ بھوپالی اردو کہہ سکتے ہیں۔ یہ پاس پڑوس کے قصبوں

مثلاً سیہور، آشٹہ، رائے سین، بیگم گنج وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ بھوپال مالوے کا جزو ہے گو بندیل کھنڈ کے ڈانڈے کو بھی چھوتا ہے۔ مالوے کا مرکزی حصہ بکرما جیت کے اجین، راجہ بھوج کے دھار، باز بہادر کے مانڈو اور اہلیہ بائی کے اندور پر مشتمل ہے لیکن روایت کے مطابق بھوپال بھی دھار والے راجہ بھوج کا بسایا ہوا بھوج پال ہے۔

اس علاقے کی بولی مالوی ہے جو راجستھانی کی ایک ذیلی بولی ہے۔ یہاں کے ہندو سیٹھوں کی پگڑی اور ان کی عورتوں کا لباس بھوپال اور راجستھان کی مماثلت کے شاہد ہیں۔ یہ وسیع علاقہ اردو کا نہیں جس طرح ریگستان کے بیچ نخلستان ہوتا ہے اسی طرح مالوی کے سمندر میں بھوپال اور چند دوسرے قصبے اردو کے جزیرے ہیں۔ شہر سے قصبات اور قصبات سے دیہات کی طرف کو جائیے، بتدریج اردو کا اثر کم اور مالوی کا اثر زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ بھوپال میں بھی نچلے طبقے کے ہندو مثلاً دودھ والے، کہار (بھوئی) وغیرہ اردو پر مالوی کی تہہ چڑھا کر بولتے ہیں۔

بھوپال بمبئی کی نسبت دلی سے قریب تر ہے لیکن تہذیبی اور تجارتی تعلقات بمبئی سے زیادہ ہیں اس لیے بھوپال کی زبان کسی قدر بمبیا اردو سے بھی متاثر ہے۔ یعنی بھوپال کی زبان وہ اردو ہے جس پر تھوڑا تھوڑا مالوی، بندیلی اور بمبئی کی ہندوستانی کا اثر ہے۔ اہل بھوپال کو اس کا شعور نہ ہوگا لیکن یوپی سے آنے والوں کو معیاری اردو سے اختلافات بادی النظر ہی میں دکھائی دے جاتے ہیں۔ انھیں اختلافات کا نام بھوپالی اردو ہے۔ ان میں خاص خاص یہ ہیں:

صوتی:

۱۔ یائے لین کو یائے مجہول بولنا مثلاً ضمیر متکلم، 'میں' اور 'پیسہ' کو فتح اول کی بجائے کسرۂ اول سے ادا کرنا جس سے ضمیر 'میں' کی آواز حرف جار 'میں' (اندر) جیسی ہو جاتی ہے۔ یہ نزلہ انگریزی الفاظ پر بھی پڑتا ہے مثلاً ویسٹ (West) بمعنی مغرب کو Waste بمعنی برباد کرنا کے ہم آواز کر دیتے ہیں۔

۲۔ واؤ لین کو واؤ مجہول بنا دینا مثلاً سَو (بمبئی صد) کو فتحہ اول کی بجائے پیش سے سُو بولتے

ہیں۔ حرف عطف اور کو پیش کے ساتھ اُور بولتے ہیں جس سے یہ ہندی لفظ بمعنی طرف کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔

۳۔ کہا، رہا کی وسطی ہ کوی سے بدل کر فتحۂ اول کی جگہ کسرۂ اول سے بولتے ہیں یعنی کیا، ریا (یائے معروف کے ساتھ) دلی کی کرخنداری اردو اور مغربی یوپی کی بولی میں بھی ان الفاظ کو مسخ کرتے وقت ہ کی جگہ رکھ دی جاتی ہے لیکن وہاں یہ ماقبل مفتوح ہوتی ہے جب کہ بھوپال میں ماقبل مکسور۔

۴۔ مصمتوں پر ختم ہونے والے بعض الفاظ کے آخر میں الف زائد کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً بیجا (بیج) پیڑا (پیڑ) روپا (روپ) آخری 'آ' کا رجحان یہاں تک ہے کہ باسی کو باسا کہتے ہیں۔

۵۔ چند دوسرے الفاظ کا مخصوص بھوپالی تلفظ ملاحظہ ہو۔

شعر میں ہمارے تلفظ میں ع یائے مجہول کی آواز دیتی ہے یعنی ہم اسے شیر (بمعنی ضیغم) کا ہم آواز کر دیتے ہیں لیکن بھوپال میں اسے یائے لین سے بہ قافیہ، خیر بولتے ہیں۔ بھوپال کے شاعر (اظہر سعید خاں کا مصرع ہے۔ ع بھلا یہ شعر تمھیں کیوں پسند آئیں گے۔ وہ اس مصرع کو پڑھتے وقت شعر کو شیر (بہ قافیۂ خیر) ادا کرتے ہیں۔

اسی طرح محلّہ میں م پر پیش ہے لیکن بھوپال میں م اور ح دونوں کو فتحتین سے اس طرح بولتے ہیں کہ محلّہ کے ابتدائی تین حرفوں کی آواز لفظ 'محل' جیسی ہو جاتی ہے۔ پٹھا بمعنی دفتی یا گتا کو یہاں زبر کی بجائے ضمۂ اول سے پُٹھا بولتے ہیں۔ پتھر کو دکنی انداز سے پتھر کہتے ہیں۔

نحوی:

یہاں تعظیمی ضمیر حاضر 'آپ' کے ساتھ فعل کے وہ صیغے استعمال کرتے ہیں جو 'تم' کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ مثلاً

آپ ایسا کرو	بجائے آپ ایسا کیجیے
آپ تو کھانا کھاؤ	بجائے آپ تو کھانا کھائیے

معنوی:

اسے ہم تین شقوں میں دیکھیں گے۔

(الف) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو مقامی اردو میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن بھوپال میں ان کے معنی قدرے مختلف ہیں مثلاً:

بائی: معیاری اردو میں 'بائی جی' محض طوائفوں کے لیے مخصوص ہے لیکن یہاں محض عورت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی بھی عورت کو بائی یا بائی جی کہہ کر خطاب کر سکتے ہیں۔ بھوپال میں اس لفظ کی کثرتِ استعمال مہاراشٹر کا اثر ہے۔

بوا: بھوپال میں خادمہ کے معنی میں آتا ہے۔ مسلمان ملازماؤں کو بوا کہا جاتا ہے۔ یوپی میں ہندوؤں میں یہ لفظ باپ کی بہن کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مسلمان خواتین برابر والیوں کو بوا کہہ کر خطاب کرتی ہیں مثلاً:

کارخانے میں ہے قدرت کے کسے دخل بوا　　بچہ تم پہلے جنیں ، بیاہ ہوا میرے بعد

(جان صاحب)

داوا: معیاری اردو میں باپ کے باپ کے لیے مختص ہے۔ بنگال میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ بمبئی میں اس لفظ کے معنی اس طرح زوال پذیر ہوئے کہ غنڈے بدمعاش کو کہتے ہیں۔ بھوپال میں کسی بھی بڑے کو کہہ سکتے ہیں۔ خواہ وہ عمر کے لحاظ سے بڑا ہو یا مرتبے کے لحاظ سے۔

کھیرا اور ککڑی: شمالی ہند میں جسے کھیرا کہتے ہیں اسے بھوپال میں ککڑی اور جسے شمال میں ککڑی کہتے ہیں اسے یہاں کھیرا بولتے ہیں۔ بھوپال کے کھیرے (مقامی زبان میں ککڑی) لو کی کی طرح بڑی جسامت کے ہوتے ہیں اور اس کے باوجود کچے اور نرم رہتے ہیں۔ لکھنؤ کی پھل والیاں ککڑی کی توصیف میں بانک لگاتی تھیں۔

'لیلیٰ کی انگلیاں ہیں' مجنوں کی پسلیاں ہیں' کیا خوب ککڑیاں ہیں'

وہ بھوپال کی فربہ ککڑیوں (یعنی ہماری زبان میں کھیروں) کا ڈیل ڈول دیکھیں تو سر

پیٹ لیں یا غش کر جائیں۔

پپیتے کو یہاں، ارنڈ ککڑی' کہتے ہیں۔ اگلے زمانے میں یوپی میں اسے 'ارنڈ خربوزہ' کہا جاتا تھا۔

خاں: نون غنہ کے ساتھ اردو میں تنہا استعمال نہیں ہوتا۔ خاں صاحب کہتے ہیں یا نونِ اعلان کے ساتھ سرحد کے پٹھانوں کو 'خان' کہہ کر پکار لیتے ہیں۔ بھوپال چوں کہ پٹھانوں کی بستی ہے اس لیے یہاں نون غنہ کے ساتھ 'خاں' 'ارے خاں' اور 'کیوں خاں' (عجلت میں 'کوں خاں') کہہ کر خطاب کرنے کا عام دستور ہے۔ اس میں پٹھان کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہندو کو بھی 'ارے خاں' کہہ کر خطاب کیا جا سکتا ہے۔

کاری گر: یہاں معمار کے معنی میں مخصوص ہے۔ اس کے 'مہال' کو بھوپال میں گولہ کہتے ہیں۔

مال: سیمنٹ ریت کے ملا کر بنائے ہوئے گیلے مسالے کو کہتے ہیں۔

کچرا: بمعنی کوڑا۔ اس معنی میں یہ لفظ مہاراشٹر میں بھی بولا جاتا ہے۔

قند: بمعنی چینی۔ مانا کہ فارسی میں اس لفظ کے معنی شکر ہیں لیکن بھوپال میں کارخانے کی دانے دار چینی کو قند کہا جاتا ہے۔

جھاڑ: معیاری اردو میں جھاڑی کا مکبر ہے یعنی کانٹے دار یا بدنما یا سوکھی جھاڑی۔ بھوپال میں کسی بھی پودے کو کہتے ہیں مثلاً چمیلی کا جھاڑ۔

منکا: معیاری اردو میں منکا اتنے بڑے گھڑے کو کہتے ہیں جس میں آدمی گھس کر بیٹھ سکتا ہے لیکن بھوپال میں ہر گھڑے کو منکا کہتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔

عمدہ: یہ لفظ یہاں مخصوص انداز سے 'بہت اچھے' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

الف۔ "یہاں کیسے بیٹھے ہو؟"

ب۔ "عمدہ بیٹھے ہیں"

الف۔ "ٹیکسی تو ملی نہیں تانگہ لے آیا ہوں"

ب۔ ''عمدہ''

کنے: (پاس) مثلاً اس کنے یا اس کے کنے۔ قدیم اردو میں یہ لفظ عام تھا۔ اب بھوپال کے علاوہ رام پور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اتفاق سے دونوں پٹھانوں کی بستیاں ہیں۔

بتانا: معیاری اردو میں اس کے جو معنی ہیں بھوپال میں اس معنی میں تو استعمال ہوتا ہی ہے اس کے علاوہ یہاں ''دکھانا'' کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے مثلاً

'فوٹو ذرا مجھے تو بتاؤ'

اس معنی میں یہ لفظ بھوپال سے بمبئی تک مستعمل ہے۔

چلے گا: بمعنی ''کام میں آئے گا'' ''راس آجائے گا'' مثلاً

الف۔ ''امرود ضرور کچا ہے''

ب۔ ''چلے گا'' (یعنی کوئی مضائقہ نہیں اسی کو کھالیں گے)

الف۔ دیکھیے یہ مکان کرایہ پر مل سکتا ہے لیکن بہت چھوٹا ہے۔

ب۔ ''سب چلے گا'' (یعنی اسی پر اکتفا کرلیں گے)

یہ بھی بمبئی کا محاورہ ہے جو بھوپال نے مستعار لیا ہے اور اب تو شمالی ہند کی طرف بھی بڑھتا جارہا ہے۔

پٹکنا: معیاری اردو میں کسی چیز کو اوپر سے اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارنے کو کہتے ہیں۔ بھوپال میں محض رکھنے کو کہتے ہیں۔ شدت یا تشدد کا کوئی شائبہ نہیں مثلاً ''دیگچی چولھے پر پٹک دو'' کے معنی ہیں دیگچی چولھے پر رکھ دو۔

مچانا: سیمنٹ کے مسالے یا گارے کو بھگو کر معمار کے استعمال کے لیے تیار کرنا مثلاً ''مال مچالو'' یعنی سیمنٹ اور ریت کو پانی میں ملا کر مسالہ بنالو۔ معیاری اردو میں شور اور اس کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مثلاً شور مچانا، غل مچانا، اودھم مچانا۔

دودھ کھانا: یہاں دودھ کے لیے پینے کے علاوہ کھانا بھی بولا جاتا ہے مثلاً ''بابو جی میرا دودھ بہت گاڑھا ہے۔ ایک دن کھا کر دیکھیے۔''

(ب) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو ہیئت اور معنی دونوں کے لحاظ سے معیاری اردو کے الفاظ سے کافی ملتے ہیں لیکن قدر مختلف بھی ہیں مثلاً

ممیا: عوام میں ایک تعظیمی خطابیہ لفظ ہے جو ظاہر ہے ماما یعنی ماموں سے بنا ہے۔

پٹیا: (فرش لگانے کے پتھر کے تختے) نفری: (ایک آدمی کا ایک دن کا کام یعنی (man day) چھیٹی (چونہ دانی) سوجا (سوا یعنی بڑی سوئی جس سے بوری سیتے ہیں) طواتی: (چھوٹی سوئی) بھٹا (بینگن) چھنٹا یا چھنے (ریزگاری) کھلے (ریزگاری)

(ج) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو معیاری اردو میں بالکل نہیں ملتے مثلاً

بیا: یہ بائی کا مصغر ہے اور لڑکی کے معنی دیتا ہے۔ لڑکی کو بیا کہہ کر خطاب بھی کر سکتے ہیں۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم کی دو صاحبزادیاں چھوٹی بیا اور بڑی بیا کے لقب سے مشہور تھیں۔

بندھائی: (مرد مزدور)۔ ریزہ (عورت یا لڑکا مزدور جن کی مزدوری کم ہوتی ہے)۔ دہاڑی (ایک دن کی مزدوری)۔ یہ لفظ پنجابی سے لیا معلوم ہوتا ہے۔ پگار (تنخواہ) یہ لفظ مراٹھی سے آیا ہوگا۔ پٹیل (گاؤں والوں کے لیے تعظیمی خطابیہ لفظ جیسے شمالی ہند میں چودھری کہتے ہیں) بھوپال سے لے کر گجرات تک گاؤں کے مکھیا یا پردھان کو پٹیل کہتے ہیں۔ بھوپال میں لفظ گجراتی سے مستعار ہونا چاہیے۔ ڈوکرا (بوڑھا) ابتدائی دور میں جو صوفیائے کرام کے کچھ فقرے ملتے ہیں ان میں کسی بزرگ کی زبانی پڑھ ڈوکرے، کہا گیا ہے۔ انھوں نے کسی لڑکے کو مزاحاً یا دعا کے طور پر بوڑھا کہا تھا۔

ڈوکری یا ڈکریا (بڑھیا)۔ کھکھا (خالہ)۔ بیروٹی (ملازمہ) خاص طور پر برتن مانجھنے والی۔ بھوئی (کہار)

بٹلا (مٹر)۔ کنٹزیری (لوکی)۔ گلکی (توری۔ روسے کی پھلی (لوبیے کی پھلی) بہی (امرود) اس کی جمع بہیں یا بہیں آتی ہے۔ تور یا توبیر (ارہر) راج گیرا (چولائی جس کے لڈو بنتے ہیں) لپی (گیہوں) وہاں اس کی دو قسمیں مشہور ہیں۔ دیسی لپی یعنی سفید رنگ کا گیہوں

جو گھٹیا ہوتا ہے اور شرتی لپی جو ہلکے سرخ رنگ کا اور بڑھیا ہوتا ہے۔ مہی (چھاچھ)۔

بھجریے (نورتے یعنی جَو کے چھوٹے پودے) شمالی ہند میں دسہرے کی رسم میں بہنیں بھائیوں کے کانوں پر رکھتی ہیں۔ بھوپال میں برسات میں کسی تقریب میں کام آتے ہیں۔

گنکا (سونف الائچی کی طرح تواضع کا ایک خوش رنگ بنایا ہوا دانہ)۔ ہندی میں گنکا جادو کی شے کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو رانی کیتکی کی کہانی میں یا پھر چھوٹی کتاب کو بھی کہتے ہیں۔

چلر (ریزگاری) خنا (پتھر کا ٹکڑا جو پھینک کر مارا جائے)

کویلو۔ ک۔ مفتوح۔ یائے مجہول اور آخری واؤ معروف کے ساتھ (کھپریل)

پھدی (بیڈمنٹن کھیلنے کی پروں کی چڑیا)۔ پنجابی میں اس کے معنی شرمگاہ کے ہیں۔

سدیں: یائے مجہول کے ساتھ (تڑکے)

ہسیلنا: یائے معروف سے (کھینچنا)

(د) محاوروں میں صرف تین یاد آتے ہیں۔

پٹیوں پر آجانا: یعنی کنگال ہو کر اپنی اوقات پر آجانا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ بھوپال میں مکانوں کے باہر دو پتھر رکھ کر ان کے اوپر پتھر کا بڑا ٹکڑا رکھ دیتے ہیں جو ایک قسم کی عوامی بینچ کا کام کرتا ہے۔ اس پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہیں۔ صوفے اور کرسی سے گر کر پٹیوں پر بیٹھنا فلاکت کی نشانی ہے۔

جنت کی چڑیاں: (ممجوے)

بروکاٹ بھوپالی: برو میں واؤ معروف ہے۔ بھوپال میں اس لفظ کے معنی سرکنڈہ ہیں جس کے قلم بنائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں بھوپال علاقے میں بیہڑ کا عالم تھا۔ جگہ جگہ سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ شروع شروع میں جو پٹھان یہاں آکر آباد ہوئے انھوں نے سرکنڈوں کو کاٹ کر زمین صاف کی۔ ان تو آبادتی مقتداؤں کو بروکاٹ بھوپالی کہتے ہیں۔ یعنی وہ قدیم بھوپالی جس کے اجداد نے یہ بستی بسائی تھی۔

بھوپال نے اردو کو مشہور مزاح نگار ادیب ملا رموزی دیا۔ انھوں نے گلابی اردو تو بہت

لکھی لیکن بھوپالی روزمرہ کو مزاح کا موضوع نہ بنایا۔ اس کے لیے کسی انشا کی ضرورت نہ تھی جو بھوپالی میر غضنفر غضنفی کی زبانی یہاں کے عوامی روزمرہ کا لطف پیش کرتا۔ حیدر آبادی اردو کی ظریفانہ تخلیقات پڑھنے میں آتی ہیں۔ بھوپالی اردو میں بھی اسی ڈھنگ کی چیزیں ممکن ہیں اور میں نے ایک آدھ سنی بھی ہیں۔ کاش کوئی فرزند بھوپال اپنی بولی پر آپ ہی ہنسنے کا سامان فراہم کر سکے۔

(ہندوستانی زبان' بمبئی اکتوبر ۱۹۷۲ء

لسانی مطالعے)

☆

کلام اکبر میں انگریزی الفاظ

علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو جدید مغربی تہذیب کے بعض عناصر اپنانے کا مشورہ دیا۔ اس تحریک نے نہ صرف سیاست، سماج، تعلیم اور ادب کو متاثر کیا بلکہ اس کا پرتو اردو زبان پر بھی پڑا۔ تحریک کے حامیوں نے نہ صرف انگریزی خیالات مستعار لینے پر زور دیا بلکہ ساتھ ہی انگریزی زبان اور الفاظ سے بھی مسحور ہو گئے۔ سرسید کے رفقا نے اردو تحریروں میں خواہ مخواہ ایسے انگریزی الفاظ استعمال کیے جن کے مترادفات اردو میں موجود تھے مثلاً سولزیشن، نیشن، پوئٹری، واس، سیلف ریسپکٹ وغیرہ۔ یہ مرعوبیت مغرب کا تحفہ تھا۔ اکبر الہ آبادی برطانوی حکومت کے ملازم ہونے کے باوجود مغرب پرستی کے خلاف تھے چنانچہ انھوں نے علی گڑھ کالج، سرسید، مغربی تہذیب، مغربی تعلیم اور ان کے متعلقات کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا اور انھیں کے حربے سے مات دینے کے لیے ان کی لفظیات کو مبالغے کے ساتھ استعمال کیا۔

اکبر کے کلام میں بلا مبالغہ سیکڑوں انگریزی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ان کے استعمال کی خاص وجوہ ہیں۔

۱۔ علی گڑھ کالج کی جماعت اور نئی تہذیب کے پرستاروں پر طنز کرنے کے لیے ان الفاظ کا استعمال جو وہ اپنی بات چیت میں شامل کرتے ہوں گے۔

۲۔ انگریزوں کی اس اردو کی نقل اتارنا جس میں انگریزی الفاظ چھڑکے ہوئے ہوتے ہیں۔

۳۔ غیر ضروری انگریزی الفاظ کی ملاوٹ سے مزاح اور مضحکے کی فضا پیدا کرنا۔

۴۔ بعض اوقات قافیہ پیمائی کی ضرورت۔

ان انگریزی الفاظ کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک وہ جو اردو بول چال میں اس طرح شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں، انھیں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو اردو بول چال کا جز و نہیں۔ ان میں سے جو نسبتاً مانوس ہیں ان کے بجائے ان کا اردو مترادف زیادہ کثیر الاستعمال ہے۔ اسی دوسری قسم میں انگریزی کے چند جملے یا فقرے بھی شامل ہیں۔

میں نے کلیات اکبر کو (سنٹرل بک ڈپو، اردو بازار دہلی ۲ جلد) تیزی سے دیکھ کر تمام انگریزی الفاظ جمع کیے۔ انگریزی الفاظ والے اشعار اکبر کے تہذیبی، مذہبی اور سیاسی نظریات کی مکمل آئینہ داری کرتے ہیں۔ واضح ہو جاتا ہے کہ اکبر شدید دین دار شخص تھے، جدید تہذیب و تعلیم کو مضر جانتے تھے۔ علی گڑھ کالج اور اس کے گریجویٹوں کو اپنی تہذیب سے بیگانہ اور اپنے دین سے بھٹکا ہوا تصور کرتے تھے۔ انگریزوں اور ان کے جی حضوریوں کے احساس فضیلت کے قائل نہ تھے۔

لیکن اس سب کے باوجود مجھے ان کے یہاں ایک گہرا تضاد دکھائی دیتا ہے۔ وہ مغربی تعلیم کو گمراہ کن مانتے ہیں لیکن اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجتے ہیں۔ وہ حکومت کے آنر، بالخصوص سر کے خطاب پر، طنز کرتے ہیں لیکن خود خان بہادری کا خطاب قبول کر لیتے ہیں۔ 'سر' اور 'سی ایس آئی' کے خطاب کا کئی اشعار میں خاکہ اڑایا ہے لیکن ان کی لفظیات میں خان بہادر کا لفظ غائب ہے، اس کے متعلق ایک شعر بھی نہیں لکھا۔

انھوں نے جس کثرت سے مسوں اور لیڈیوں پر اشعار لکھے ہیں انھیں دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے۔ مس سے مراد انگریز لڑکی اور لیڈی سے مراد انگریز خاتون یعنی میم ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ ایک ہندوستانی حسینہ کے لیے لفظ لیڈی کا استعمال دیکھا۔ وہ بھی مغربی وضع قطع کی ہوگی۔

مرا جس پارسی لیڈی پہ دل آیا ہے اے اکبر جو سچ پوچھو تو حسن بمبئی ہے اس کی صورت سے

وہ اپنے بیٹے اور شیخ کو ان سے مسحور ہونے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں پہلا اور غالباً دوسرا بھی، اپنے بیٹے عشرت کو مخاطب کر کے کہا ہے، بعد کے اشعار شیخ وغیرہ کے

متعلق ہیں۔

چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی

یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زرکھو کے مِس لائے
سراسر نور تقویٰ سایہ پر قربان کر آئے

بچ بھی گئے تو ہوش انھیں آئے دیر میں
ہیں شیخ غش میں دیکھ کے حسنِ مِس فرنگ

تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا
کر گئی کام نگاہ مِس پُر فن کیسا

ہے اس پہ نازو خندہ کہ دل اس میں کیا حرج ہے
کہیں میم کا ہے پھندا، کوئی دخترِ رز کا بندہ

مسوں کا بے تکلف چڑھ گیا پھر قلب پر پارہ
بتوں کے عشق میں پڑی چکے تھے عقل پر پتھر

کہا جاتا ہے کہ اکبر کے دور میں جو ہندوستانی یورپ جاتے تھے ان کے لیے سب سے بڑی پریشانی، سب سے بڑا ہوشربا لچا وا شوخ و شنگ، آراستہ وہ پیراستہ میموں کا حسن ہوتا تھا۔ وہ مبہوت ہو جاتے تھے اور بسا اوقات واپسی میں انھیں اپنے ساتھ نتھی کر کے لے آتے تھے۔ اب جو ہندوستانی یورپ و امریکہ جاتے ہیں انھیں اتنی الجھن سے دو چار نہیں ہونا پڑتا کیونکہ جدید وضع کی ہندوستانی خواتین اور مغربی خواتین کے زرق و برق ظاہر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اردو کے اہل ادب میں جمال مغرب کا سب سے بڑا دلدادہ و شیدا کون ہے، یہ ہیں مولانا اکبر الہ آبادی۔

لیکن میرا موضوع اکبر کے کلام میں انگریزی الفاظ کا مطالعہ ہے، ان کے سماجی نظریات نہیں۔ معذرت کے ساتھ آمدم برسر مطلب۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ان کے کلام میں انگریزی الفاظ کا پہلا زمرہ وہ ہے جس کے الفاظ اردو میں عام طور پر مستعمل ہیں۔ میں نے ان

کی یہ فہرست تیار کی ہے۔ بعض الفاظ کے تلفظ کی صراحت کے لیے قوسین میں ان کا عروضی وزن لکھ دیا ہے۔

آپریشن	آرٹ	آفس	انجن
انجینیر (مستفعلن)	انجینری (مستفعلن)	انگلش (زبان)	انگلش (بہ معنی مغربی)

ع انگلش ڈریس انور کا جو کل بزم میں دیکھا

انگلینڈ	انگلستان	اسکول۔ بت اسکولی	اسکالر
اسٹیشن	انٹر	ای۔ آئی۔ آر	افسر
انسپکٹر	اڈیٹر	اسپیکر	اسٹیمر
ارل	اوورکوٹ	انٹرنس	اسٹیج
اسپتال	البم		
	بیٹری (بیٹ۔ری)	بنگلہ	بجٹ
بل	بشپ	بیرسٹری	بلڈاگ
بٹن	بارک (با+رک)	بیبل (بائبل)	بینکس
بگل	بم	بسکٹ	برانڈی
بائیسکل (مستفعلن)			
پوپ	پولیس	پروفیسر	پیانو
پاٹ (کموڈ)	پمپ	پائپ	پلیٹ
پالیسی	پروگرام	پارک	پلٹن
پبلک	پنس (pence)	پریڈ (میدان)	پولو
پرس (پریس)	پیپرمنٹ	پاس	پرائیوٹ سکرٹری
پالش	پارٹی (بہ معنی گروہ)	پنشن	پتلون

تھیٹر	تھرڈ		
ٹائپ	ٹائی	ٹفن	ٹکس (ٹیکس)
ٹریننگ کالج	ٹیلیفون (فاعلات)	ٹرین	ٹکٹ
جج	جنرل	جان بل	جنٹ (جوائنٹ مجسٹریٹ)
جرمن (زبان)	جوبلی	جیل	جمناسٹک
ڈگری (عدالت کی)	ڈگریاں (اسناد)	ڈپٹی	ڈیوک
ڈاکٹر	ڈیلی گیٹوں		
ریل۔ ریلوے	رجسٹرڈ	رپٹ	رمارک
ریڈر (کتاب)	ریڈر (عدالت کا) ع حافظ کے شعر کیسے اب پڑھ رہے ہیں ریڈر		
رفل (رائفل)			
سائنس	سپن	سوسائٹی (صحبت)	سی۔ایس۔آئی
سگرٹ	سروس	سول سروس	سوڈا
سرجن	سول سرجن	سول لائن	سٹیفکیٹ
سگنل	شٹل کاک		
فرنچ (زبان)	فیشن	فیس	فیل (fail)
فٹن	فوٹو	فرنیچر	فرنچ پالش
فرسٹ	فیر		
کلکٹر	کلکٹری (عدالت)	کلرک۔کلرکی	کالج
کورٹ (کورٹ)	کمشنر	کارڈ	کیمپ
کرنیل	کونسل	کمیٹی	کمپنی
کوچ (صوفہ)	کالم (اخبار کا)	کمیشن (عدالت کا)	کاما

کرسس	کرکٹ	کانگریس	
گورنر	گریجویٹ	گورنمنٹ	گنّی (مہر)
گدام (گودام)	گزٹ	گراموفون	
لاٹ صاحب	لیڈر	لکچر	لکچرر
لیٹن	لائٹ	لمپ	لیگ
لٹریچر	لیسنس (لائسنس)		
بس	میونسپل	ممبر۔ممبری	مشن اسکول
مشین	ماسٹر	مارشل لا	موٹر
مسمریزم			
نیچر	نوٹ (کرنسی)	نوٹس (عدالتی)	نوٹ بک
ناول			
وارنش	ووٹ	وھسکی۔وسکی	وی۔پی
ہال	ہوٹل	ہوم رول۔ہوم رولی	
یورپ	یونیورسٹی		

دوسرا زمرہ ان الفاظ کا ہے جو اردو میں عام طور سے مستعمل نہیں۔ان میں سے کچھ اگر بول چال میں داخل بھی ہو گئے ہیں تو بھی ان کا آسان اردو مترادف موجود ہے۔ان الفاظ کی فہرست حسب ذیل ہے۔

ایڈریس	ایم (aim)	اسپیچ	اینتھم
الکٹرک لائٹ	اسکپ (skip)	اس ٹیشن	ایجی ٹیشن
اوریجنلٹی	انگلش (انگریز)		

ع ہر اک نے دل سے انگلش کی ہے لائلٹی کا دم مارا

انگلش مین	آرٹکل	امپرس (بہ معنی ملکہ)	اسمال

اگزیشن اسکوائر (تعظیمی لاحقہ) اسٹیلین (stallion) غیر آختہ
گھوڑا۔ دیکھیے گلڈنگ

انرجی اے۔ بی انڈر اوولوشن (صحیح
ایوولوشن)

آنر۔ آنرایبل ایروپلین ایرشپ (یائے ساکن) اولڈ بوائے

اولڈ گرل انٹریگ (inrigue) اسکول مسٹرس انٹرسٹ

اسکیوز (excuse) آئس برگ آرٹسٹ اسکاچ (بہ معنی
زبان)

اسکاچ (اسکاٹ لینڈ کا باشندہ) اسکیمی (بے کورس بھی ان کا اسکیمی، بے
پاس شدہ استانی بھی)

ارکٹ (erect)

انفلوائنزا آفشل اِف (if)

بٹ (نہ اف کیجیے اور بوٹ (boot) بیلون برگیڈ
نہ بٹ کیجیے (brigade)

بیوٹی بال (رقص) بیف (گائے کا برٹش
گوشت)

بڈروم (خواب گاہ) بکس (دیا سلائی کا) بادر (brother)

ع امر تعلیم کو اطفال نے سمجھا بادر

بزی (busy) بسٹ (bust) برڈ (چڑیا) پینٹر

پولٹکل پالیٹکس۔ پالٹک پاکٹ پائٹی (piety)

پولو پونی پوائنٹ

پیرس سوپ (pears soap)

پرل	پرشیا	پٹی (pity)	پلیز
پٹرولیم	پنجر	پیٹیل (فعلن۔ شاگرد)	
		پینی (penny)	
پالیگمی (polygamy)	پلیڈر	پراونشل	
ٹھینکس۔ٹھینک یو	تلغراف	ع تلغرافے چوفرستادی زراہِ لطف ومہر	
ٹیچر	ٹانک	ٹچ	ٹومارو
ٹوٹل (total)	ٹرن (turn)	ٹی	ٹیبل
ٹرس (terse)	ع لطفِ سخن تو ہے یہی ٹرس بھی ہو وٹی بھی ہو		
ٹریفک			
جمپ	جنٹلمین	چرچ	
ڈرس (پوشاک)	ڈپازٹ	ڈفنس	ڈپوٹیشن
ڈیوٹی	ڈفیمیشن سوٹ	ڈنر	ڈیر
ڈریسر	ڈیم فول		
رفارم	ریلیشن	ریسپانسبل روبی (فعلن۔ ruby)	
ریزیبل	رول (آنرکارول)	رجکٹ	ریڈی
زیل (zeal)			
سالویشن	سیزیبل (ع رندوں کی یہ مستی بھی مگر سیزیبل ہے)		سنٹرل
سلف ریسپکٹ	سیٹ (seat)	سوشل	سکنڈ
سکنڈ لینگوایج	سوپ (شوربہ)	سلف گورنمنٹ	
سوپ (صابون)			

سر (خطاب)   سیفٹنگ   سلکٹ (select)   سبجکٹ

سینر (sinner)   سٹی (city)

شی (she)   شومیکری   فیک   شاپ

فلاسفی   فیم (fame)   فورٹ   فوٹوگراف

فوٹو (ع بہتر یہی ہے خواہش فوٹو نہ کیجیے)   فارمولا   فادر

فٹسٹ (fittest)   ع سن علیہا فان ہی پر ختم ہے قول فٹسٹ   فول

فائنل جج   فالور (follower)   فاسفورس   فاکس (لومڑی)

فل اسٹاپ   فیکٹ (fact)

کلاک   کرسچین   کرسمس   کوئن

کالونی   کٹلٹ (cutlet)   بکس   کلیگ (colleague)

کارونیشن   کانشنس (ضمیر)   کیروسین   کلاس

کسریٹ (commissariate)   کمیٹیر یٹ   کورس

کاری (curry)

گڈبائی   گڈنائٹ   گڈڈے   گریٹ (بڑا)

گرل   گرل اسکول   گلڈنگ (gelding) (۱)

گون (گاؤن) گولڈ   گو (give)

پپیہے سے کہتے ہیں اب پی کو چھوڑ   ضرورت ترقی کی ہے گیو پکار

گرنڈ جنون

ہے ممبری جو اپنے سمجھو اس کو خون اچھا   یہ بجا ہے قول شاعر گرنڈ جنون اچھا

لیڈی لونڈر (lavender)   لاج (غالباً وائسریگل لاج) لیمنڈ

لیپ (leap)   لوکل   لٹریری   لائٹی

لائل سبجکٹ لا (law) لیزی (سست) لائف

(۱) چار شعر کے بے عنوان قطعے میں کہتے ہیں کہ حافظ محمد حسین علی گڑھ گئے تو حاجی مدن نے محسن الملک مہدی علی سے کہا کہ ان کی دعوت کر دیجیے۔ اس پر محسن الملک نے کہا:

وہ بولے مرا اُن کا کیا جوڑ ہے میں گلڈنگ ہوں ، وہ ہیں اسٹیلین

(کلیات حصہ اول ص ۳۶ـ۳۳۵) گلڈنگ: آختہ شدہ گھوڑا۔ اسٹیلین غیر آختہ شدہ گھوڑا۔

میڈیکل کالج میٹر (matter) مشن مسٹر

مسٹری

نہ ہر کہ ہیٹ پوشیدہ کوٹ در بر کرد ادائے مغرب و آئین مسٹری داند

مسٹری (mystery) مائی ڈیر مجارٹی میوزیکل کالج

میوز (muse) مِل منی (money)

مٹن۔ مٹن چاپ میٹ (mate)

موِن مسٹیک (mistake)

نیٹو۔ نیٹویت نیشن نیشنل

نیچر۔ نیچری۔ نیشنل اینتھم نیشنل فیلنگ نو

نیچریت۔ نیچرل

نوٹس (ع ممکن نہیں اسے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے) نون (noon) نکٹائی

وھسپر (whisper) وول (wool) وری (very) وٹی (witty)

واچ ول (well۔ ع ول مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا)

ولفیر (welfare) ورڈ (لفظ) ورک

(ع شبوں میں کورس، دن میں فارمولا ورک کرتے ہیں)

واٹرٹیکس۔ وی (we) ہی (he) ہسٹری ہیٹ

ہولی جیل　　ورچوئس(virtuous)　　ہے پی(happy)

ہنٹ(hint)

ہج(hedge)

اس مس کی زباں رات جولی میں نے دہن میں　　بولی کہ تری راہ ترقی میں یہ ہج ہے

ہز ہائنس　　ہزلولینس(his lowliness)　　ہینڈ شیک　　ہائی مارک

ہنی مون　　ہرا (ع ہر یک لکچر آواز ہرا بلند)

ہیگ　　یورپین (ع ہوتا ہے شیخ یورپین نان پادے)

تیسرے زمرے میں چند جملے یا فقرے ہیں۔

oh lord　　ع دور ہو وہ لارڈ سے اور پرتو یا رب گیا

ع اک پیر ڈنر خوردہ ، گورنمنٹ رسیدہ

sit down　　ع میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں، سٹ ڈون کہتا ہے

come all　　ع کہتا ہے کم آل جس کو حاصل ہے کمال

come on　　ع اک ادا سے کہا مسوں نے کم آن

جب میں کہتا ہوں کہ گو می بکس ڈیر　　سر جھکا کر کہتے یو ے ٹیک ، ہیں

چوتھے زمرے میں میں ان کے ایسے الفاظ کو لیتا ہوں جن کے تلفظ یا شعر میں ان کے وزن کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ وقت یہ ہے کہ انگریزی میں کئی ایسے مصوتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں۔ ہمارے یہاں خفیف اور طویل مصرے یعنی چھوٹی اور بڑی ماترا ہوتی ہیں۔ انگریزی میں ان کے بین بین تلفظ بھی ہوتا ہے۔ واقف کار اردو پڑھتے بولتے وقت ان کے صحیح تلفظ کو ادا کرنے میں قادر ہیں لیکن انھیں لکھا کیسے جائے، خفیف مصوتے کے ساتھ محض اعراب پر منحصر ہو کر یا طویل مصوتے واؤ یا یے کے ساتھ مثلاً انگریزی کے بعض لفظوں کے دو دو اردو املا دیکھیے۔

اجی ٹیشن، ایجی ٹیشن۔ بڈ روم، بیڈ روم۔ ڈرس، ڈریس، لمنڈ، لیمنڈ، لیمیڈ، لمیڈ۔ کنوکیشن، کانووکیشن "پروفیسر" پروفسر۔ ریزنبل، ریزیبل وغیرہ۔

اکبر نے ایسے الفاظ کو عموماً خفیف مصوتے یعنی زبر، زیر، پیش سے لکھا ہے جسے ہم غلط تو نہیں کہہ سکتے لیکن بسا اوقات وہ اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ انھیں طویل مصوتے کے ساتھ باندھا جاتا تو انگریزی کے واقعی تلفظ سے نزدیک تر ہوتا۔ ذیل میں بعض الفاظ کے تلفظ اور املا کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کر رہا ہوں جن سے اتفاق کرنا ضروری نہیں۔

۱۔　ع　کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس

یہاں ایم اے کو "اے" باندھا گیا ہے۔ ہم لوگ اے ایم اے یا ایے بولتے ہیں۔ مصرع کچھ اس طرح ہوتا تو واقعی تلفظ سے نزدیک تر ہوتا۔

ع　کہ بیٹا جو کرلے ایم۔اے پاس

۲۔　ع　یا ایجی ٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈے

اس مصرع میں ایجی ٹیشن بروزنِ مفاعیلن باندھا گیا ہے۔ اے جے ٹشن، بروزنِ فلاعلاتن بہتر ہوتا۔ کہ لکھتے تھے۔

ع　ایجیٹیشن کرہ سراپا، اور چلا جا مانڈے

۳۔　ع　انفلوئنزا ہوا، کرنیل بھی مرنے لگے

یہاں انفلوئنزا کو بروزن، فاعلاتن فا، باندھا ہے۔ اگر اس کے دو مصوتوں کو ملا کر اور ان میں سے ایک کو ساقط کر کے انفلوئنزا بولا جائے تو انگریزی تلفظ کی بہتر آئینہ داری ہوتی مثلاً

ع　انفلوئنزا ہو گیا، کرنیل بھی مرنے لگے

۴۔　ع　اگزبشن کی شان انوکھی

یہاں بھی وہی مسئلہ ہے کہ انگریزی لفظ کے پہلے دو اجزا اگ، بش کے مصوتوں کو خفیف بولیں کہ طویل۔ اپنی اپنی پسند پر منحصر ہے۔

۵۔　ع　قلزم کی تہہ میں تلو یا ایر شپ میں جھولو

ع جو ایرشپ سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتا نہیں ہے

حیرت ہے کہ انھوں نے ایر کو تسکین اوسط سے بروزنِ فاع باندھا ہے جو بالکل غیر فطری ہے۔اس میں یائے متحرک ہونی چاہیے یعنی ایرشپ بروزنِ فعولن نہ کہ :وزن فاعلن

٦۔انظر الی الابل کا تصور جو دل میں ہے یہ وجہ ہے کہ آج تک آنر ابل میں ہے

لغت کے مطابق ابل کے معنی اونٹوں کے ہیں۔واضح نہیں کہ دوسرے مصرع کے آنر ابل کو انر آیبل کے تضاد کے طور پر تو پیش نہیں کیا۔

٧۔ ع اڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹو کو

اڈیٹر (بروزنِ فعولن) کے بجائے ایڈیٹر (مفعولن) یا ایڈٹر (فاعلن) بہتر تلفظ ہوتا

٨۔ ع نہ انجن بماند نہ انجیری

انجیری بروزنِ مفتعلن نظم کیا ہے۔غالباً اس کا صحیح تلفظ ان+جین+یری ہے۔

٩۔ اکبر برٹش کو ہر جگہ بری ٹش بروزنِ فعولن باندھتے ہیں حالانکہ برٹش بروزنِ فعلن چاہیے۔

ع اوج برٹش راج کا دیکھا ع کہہ دو اکبر کہ بس برٹش اقبال

ع لائل سبجکٹ تم برٹش کے رہو ع بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج

ان چاروں مصرعوں کو موزوں پڑھنے کے لیے بری ٹش کہنا ہوگا۔آخری مصرع کو، ہم نشین برٹش راج، کہہ کر برٹش (بہ رائے ساکن) سے کام چل سکتا ہے۔

١٠۔ع پارک کوئی کر دے گی عطا ان کو گورنمنٹ ع شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا پارک ہے

مسلم یونیورسٹی میں بچی بارک مشہور ہے۔اکبر نے بھی اس لفظ کو عوامی تلفظ کے ساتھ باندھا ہے۔صحیح بیرک ہے۔

١١۔ ع ہوگئی اب تو حقیقت میں یہ ہولی بئبل

عوامی تلفظ میں دوہرے مصوتے (dipthomy) کو اکہرا مصوتہ بنا کر بولنے کا رجحان ہوتا ہے مثلاً لائٹ، ڈاؤن کو لیٹ، ریٹ، ڈون کہنا لیکن میں نے کبھی بائبل کو بئبل کہتے نہیں سنا۔

۱۲۔ ع مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں بڈ روم میں

یہاں بھی وہی مسئلہ ہے کہ 'بڈ' باندھا جائے کہ بیڈ۔ صحیح تلفظ دونوں کے بیچ میں ہے اردو میں بیڈ روم کہنا بہتر ہوتا کچھ اس طرح

ع مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں در بیڈ روم یا

ع دیکھ سکتا میں نہیں ہرگز بھی ان کا بیڈ روم لیکن اس طرح ردیف قافیہ بدل جاتا ہے

۱۳۔ ع کرتے ہیں بائیسکل پر خوب وہ دفع ریاح

بائیسکل (مستفعلن) کے بجائے بائسکل (مفعولن) بہتر تلفظ ہوتا بائسکل (فاعلن) بہترین ہے مثلاً

ع بائسکل پر خوب کرتے ہیں وہ اخراج ریاح

شعر میں ذم کا پہلو ہے۔

۱۴۔ ع شیخ برگنڈ کم نہیں ہیں جمپ میں

فوج کی اکائیوں میں سپاہیوں کے مذہب کے اعتبار سے پنڈت، مولوی اور سکھ گرنتھی مقرر کیے جاتے ہیں۔ مسلمان دستوں کے مولوی کو اکبر شیخ برگنڈ کہتے ہیں۔ انھوں نے برگنڈ کو ہر جگہ برگد کے وزن پر باندھا ہے۔ رائے مکسور کے ساتھ بروزن فعلن انگریزی تلفظ سے نزدیک تر ہوتا جو اس وزن میں ممکن نہیں۔ یہاں برگنڈ کی جگہ پلٹن آسکتا ہے۔

ع علوم حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں، مجھ خدا دے

۱۵۔ ع توپ کھسکی، پروفیسر پہنچے

ع پروفیسروں سے ہمیں کچھ نہیں حاصل اکبر

فعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلن

مسئلہ یہ ہے کہ پروفیسر کی ی کو طویل باندھا جائے کہ خفیف۔ اکبر ہمیشہ خفیف مان کر پروفسر (بروزن مفاعلن) باندھتے ہیں۔ اوپر کے آخری مصرع میں پرفس + روں باندھا ہے کیونکہ اس وزن میں پہلا رکن فاعلاتن کے بجائے فعلاتن لانا بھی جائز ہے۔ پروفیسر، ڈراما،

کلاس، کرشن اور شلوک جیسے انگریزی اور ہندی الفاظ کے پہلے دو مصمتوں کے بیچ کوئی مصوتہ نہیں ہے۔ انھیں مصمتی خوشہ کہتے ہیں۔ دیوناگری تحریر میں ایسے الفاظ کا پہلا حرف آدھا لکھا جاتا ہے۔ اردو شعر میں ایسے مصمتی خوشوں میں دوسرے حرف کو ساقط کر کے باندھنا بہتر ہے یعنی پروفیسر کو گویا پونے سر یا پوفسر کے برابر، ڈراما کو ڈرما، ع توپ کھسکی پروفیسر پہنچے، میں پروفیسر کو پروفسر پڑھ کر وزن فاعلاتن مفاعلن فعلن حاصل ہوتا ہے۔ اگر اس مصرع کو ع توپ کھسکی تو آئے پروفیسر، کہتے تو پروفیسر کا تلفظ زیادہ فطری معلوم ہوتا۔

مندرجہ بالا مثالوں میں تیسرا مصرع تو غیر موزوں جیسا معلوم ہوتا ہے۔ اگر یوں کہتے ع کچھ نہیں پروفیسروں سے ہمیں حاصل اکبر، کہتے تو یہ لفظ پوفسرو (بروزنِ مفتعلن پڑھا جا سکتا تھا۔) ع کچھ نہیں پروفسروں سے ہمیں حاصل اکبر۔ یہ مصرع اکبر کے مصرع کے

فاعلاتن　فعلاتن　فعلاتن　فعلن

مقابلے میں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے گو یہ بھی رواں نہیں۔

۱۶۔　ع　ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو سود

　ع　پالٹک میں وہی تیرا ہے

پہلے مصرع میں تلفظ صحیح ہے، دوسرے مصرع میں ضرورت شعری کی وجہ سے پالٹک کہہ کر گویا پاؤں کاٹ دیے ہیں۔

۱۷۔　ع　پولیس خفیہ پئے انسدادِ جرم ہے ٹھیک

　ع　خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

　ع　ایک ہیں خفیہ پولیس میں، ایک پھانسی پا گئے

'پولیس' لکھنے کے باوجود اس لفظ کا تلفظ پلیس (بروزنِ فعل) کیا جاتا ہے جیسا کہ دوسرے اور تیسرے مصرعوں میں ہے۔ پہلے مصرع میں اسے پلس (بروزنِ فعول) باندھا ہے جو مستحسن نہیں۔

۱۸۔　ع　پریس کو بھی ہے عہدِ امیرس میں کامل آزادی

ع　پریس میں شیخ ہیں، مسجد اجاڑ، ایوان خالی ہے

حکمِ گردوں ہے کہ حلقے چھوڑ دو　　یا پرس میں جاؤ یا اسکول میں

اکبر نے پریس کو ہمیشہ 'پرس' باندھا ہے۔ کلیات میں پہلی مثال میں فٹ نوٹ میں صراحت کر دی ہے "بہ تخفیفِ یا" (حصہ اول ص ۲۸۳) بقیہ کہیں یہ صراحت نہیں۔ تیسری مثال میں 'پرس' ہی چھپا ہے جس سے میں بہت الجھا کہ یہ کیا لفظ ہے۔ بڑی مشکل سے قیاس کیا کہ یہ پریس ہے۔ اس لفظ کو پرس بروزنِ فعل باندھنے کے بجائے پریس لکھ کر پریس (بروزنِ فعل) باندھنا بہتر ہوتا۔ امپرس کو بھی امپیرس کہنا بہتر ہوتا۔ تینوں مصرعے یوں کہے جا سکتے تھے۔

ع　یہ عہد امپیرس ہے پریس کو بھی کامل آزادی

ع　ہیں واعظ پریس میں "مسجد اجاڑ" ایوان خالی ہے

ع　پریس میں داخل ہو یا اسکول میں

۱۹۔ پہلے تو چمک دکھاتی تھی اپنی گنی　　اب پیشِ نگاہ ہیں پنس و پنی

گنی کا یہ تلفظ انگریزی کے موافق صحیح ہے لیکن میں نے ہندوستانی بول چال میں تشدید کے ساتھ گنّی سنا ہے۔ دوسرے مصرع میں ہیں کے بعد مرے ہو تبھی مصرع موزوں ہوگا۔ پنس کو طویل مصوتے سے پینس بولا جاتا ہے اور penny کو پینی۔ اس طرح قافیہ گڑبڑا جاتا ہے۔ اگرچہ انگریزی میں دونوں الفاظ میں مصوتہ خفیف اور طویل کے درمیاں ہے لیکن اردو میں اسے طویل بولنا اور لکھنا نسبتاً درست ہوگا۔

۲۰۔　ع　تھیٹر کو بڑھایا ہے انھیں حورانِ جنت نے

ع　جب تھیٹر کا سماں واعظ کو تڑپانے لگا

دونوں مصرعوں میں تھیٹر چھپا ہوا ہے جو ہمارے تلفظ کے مطابق ہے لیکن اکبر نے دونوں جگہ اسے تھیے ٹر (بروزنِ فعولن) باندھا ہے جو اردو میں صحیح نہیں مانا جائے گا۔ دوسرے مصرع میں 'جب' کے بعد 'سے' بڑھا دیا جائے تو صحیح تلفظ ادا ہوگا۔

۲۱۔　ع　ٹریفک کا ہے بند سب کاروبار

'ٹری فک' بروزن فعولن زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اگر اس کی 'رے' کو دبا کر 'نے فک' کے برابر باندھا جائے تو بہتر ہوتا مثلاً

ع ہے موقوف ٹریفک کا سب کاروبار

۲۲۔ گفت مارا خوف فیس وٹکس دراین کارداشت

کتاب میں ٹکس بغیر یے چھپا ہے۔ دراصل اس لفظ کا مصوتہ خفیف وطویل کے بیچ ہے۔ اردو میں اسے ٹیکس لکھنا بہتر ہوتا۔ وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۳۔ ع ہوا جو ٹائٹنک غرق، کہہ دیا میں نے

ع نے ٹیٹنک ٹکڑے ہوا ٹکرا کے آئس برگ سے

دو مصرعوں میں دو مختلف تلفظ باندھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلا صحیح ہے، دوسرا غلط۔

۲۴۔ ع کوئن وکٹوریہ کی جوبلی کی دھوم ہے ہر سو

کوئن اور جوبلی کو واؤ کے شمول سے لکھنا اور اعراب بالحروف کا قاعدہ ہے تو دونوں کو بغیر واؤ کے بولا جاتا ہے۔ اکبر نے پہلے لفظ کو کئن (بروزن فعل) صحیح تلفظ کے ساتھ نظم کیا لیکن دوسرے تلفظ جوبلی کو بروزن فاعلن باندھ کر سہو کیا۔ اس کا تلفظ جبلی بروزن فعلن ہے۔

۲۵۔ ع تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

جنٹ تخریب ہے جوائنٹ کی۔ اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ صرف یہ صراحت کرنی ہے کہ نئے آئی سی ایس کو شروع میں جوائنٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر پوسٹ کیا جاتا تھا۔ یہی اب نئے آئی اے ایس کے ساتھ ہوتا ہے۔ انھیں عوامی بول چال میں صرف جنٹ صاحب کہتے ہیں۔

۲۶۔ ع دیکھی جو نمائش چکا گو

اس مصرع کو پڑھ کر مجھے بہت خوش وقتی ہوئی۔ انگریزی کے بہت سے لفظوں میں ch کا تلفظ ش ہوتا ہے مثلاً chivalry میں۔ امریکہ کے اس بڑے شہر کا نام ch سے لکھا جاتا ہے لیکن تلفظ شکاگو ہے۔ اکبر نے اسے لکھا دیکھا ہوگا، کسی اچھے انگریزی داں سے سنا نہیں ہوگا۔

۲۷۔ ع انگلش ڈرس انورکا جوکل بزم میں دیکھا

اس لفظ میں ڑ اور س کے بیچ کا مصوتہ خفیف و طویل کے درمیان ہے۔ اکبر نے خفیف باندھا ہے، طویل باندھنا بہتر ہوتا۔ میں تو اس لفظ کی ڑ ساقط کر کے اسے ڈیس (بروزنِ فعل) باندھنا زیادہ پسند کرتا۔

۲۸۔ ع ڈپوٹیشن کی سر سبزی جو دیکھی اس نے شملے میں

ع یا ڈپوٹیشن است یا غم میم

اکبر نے پ سے پہلے کے مصوتے کو خفیف اور بعد کے مصوتے کو طویل باندھا ہے بروزنِ مفاعیلن۔ میں پ سے پہلے کے مصوتے کو طویل اور بعد کے مصوتے کو خفیف باندھنے کو ترجیح دوں گا۔ ڈے + پے + شن (فاعلاتن) مثلاً پہلا مصرع یوں کہتا

ع جو اس نے ڈے پٹیشن کا تماشا دیکھا شملے میں

۲۹۔ ع میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں سٹ ڈون کہتا ہے

ڈاون کا عوامی تلفظ ڈون ہے جیسے 'سنگل ڈون' کہنا لیکن اس مصرع میں قائل انگریز ہے، اس کے منہ سے ڈون کہلانا مناسب نہیں۔ یہاں ڈاون بولا جائے تو بھی وزن درست رہے گا۔

۳۰۔ ع ہے میری گرہ میں بھی یہ روپی یہ پرل

روپی کو طویل مصوتے کے ساتھ بروزنِ فعلن باندھا ہے۔ صحیح خفیف مصوتے کے ساتھ رُپی (بروزنِ فعل) ہے۔

۳۱۔ ع سلف ریسپکٹ کا وقت آئے کہاں سے اکبر

شروع کے دونوں لفظوں کے پہلے مصوتے کے ساتھ وہی مسئلہ ہے کہ اسے خفیف بولا جائے کہ طویل۔ صحیح دونوں کے بیچ میں ہے۔ اردو تحریر میں ان لفظوں میں ی لکھی جائے کہ نہ لکھی جائے وزن میں کوئی فرق نہ پڑے گا، اس لیے بہتر ہے کہ یوں لکھا جائے۔

ع سیلف ریسپکٹ کا وقت آئے کہاں سے اکبر

اور اس کے بعد انگریزی کا صحیح میانہ تلفظ ادا کیا جا سکتا ہے۔

۳۲۔　ع　سدا سرحد پہ ہے حاجت رفل کی اور لاٹھی کی

ع　گر رفل اپنا کام کرتا ہے

میں نے رائفل کو کبھی رفل لکھتے بولتے نہیں سنا۔

۳۳۔　ع　واعظ کا جو ارشاد ہے وہ ریزہبل ہے

اس میں ی کو ساقط کر کے ریزنبل بروزنِ مفتعلن باندھا ہے۔ اردو میں طویل ی کے ساتھ ری زنے بل (فاعلاتن) بہتر تلفظ ہوتا۔

۳۴۔　ع　زیرِ پا ہے ریلوے اور سر پہ ہے انجن کی بھاپ

اس مصرع میں ریلوے بمعنی ریل کی پٹری استعمال کیا گیا ہے۔ دراصل ریلوے ریل کے محکمے یا نظام کو کہتے ہیں۔ یوں کہہ سکتے تھے۔

ع　پاؤں کے نیچے ہے پٹری، سر پہ ہے انجن کی بھاپ

۳۵۔　ع　طریق سیٹفک کو ہے لا الہ پسند

سیٹفک عامیانہ تلفظ ہو سکتا ہے۔ صحیح سائنٹفک ہے اور وہ اس مصرع میں بخوبی لکھا جا سکتا ہے۔

ع　طریق سائنٹفک کو ہے لا الہ پسند

وزن میں کوئی فرق نہیں پڑا

۳۶۔　سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک

سکنڈ کے بجائے سیکنڈ (بروزنِ مفعول) بہتر تلفظ ہوتا۔ انھوں نے یہ اچھا کیا کہ فرسٹ کی ر ساقط کر کے اس لفظ کو فسٹ کے برابر باندھا۔

۳۷۔　اکبر سے نہ کہیے رائے سرجن

رائے سرجن کے معنی ہیں سرجن کی رائے جو بادی النظر میں سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ ہم رائے عامہ میں اضافت کا بخوبی ادراک کر لیتے ہیں۔ صراحت کے حق میں بہتر ہوتا کہ وہ

سرجن کی رائے، نظم کرتے۔

۳۸۔ ع وہ سودی سخن گوئے شیریں مقال　　　　ع وہ سودے کا سیلانِ آبِ لوڈور

انگریزی شاعر southey کے نام کا صحیح تلفظ واؤ کے بغیر 'سدے' ہے۔ دونوں مصرعوں میں وہ سودی، وہ سودے کے بجائے 'سدے وہ' کہنا مرجح رہتا۔

۳۹۔　ع　بے ضرورت نظر آتا ہے تعلّی کا یہ فیر

　　　ع　لیکن اڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں اک فیر میں

انگریزی کا لفظ فائر کا عوامی تلفظ فیر باندھا ہے۔

۴۰۔　شکل کولے کی، ہیٹ سولے کی

انگریزی لفظ coal کو اردو میں کوئلہ لکھتے ہیں، اس لیے 'کولے' تلفظ کی تخریب ہے۔ سولے بھی اتنا برجستہ نہیں۔ سولا ہیٹ میں، سولا، صفت ہے اس لیے اسے اسم کے طور پر استعمال کرنا بہتر نہیں لیکن مزاح نگار کو سب چھوٹ ہے۔

۴۱۔ اس مس کی زباں رات جولی میں نے دہن میں　　　　بولی کہ تری راہِ ترقی میں یہ ہج ہے

میں نے کہا اسکالر مشرق ہوں میں اے مس　　　　چپ رہ کہ یہی میری سیکنڈ لینگو ایج ہے

کلیات میں حاشیے میں ہج کے انگریزی ہجے hedge چھپے ہیں۔ ہج کے معنی جھاڑی ہیں، اسے رکاوٹ کے معنی میں لینا غلط ہے۔ شاید اکبر اس کا التباس hitch سے کر گئے ہیں۔ ہج یا ہیج کا قافیہ لینگو یج نہیں ہو سکتا۔ آخری مصرع میں انگریزی کے دونوں لفظوں کے ساتھ تشدد کیا ہے۔ سکنڈ کی ن گرا کر اسے سکڈ (بروزنِ فعل) باندھا ہے جو نامناسب ہے۔ لینگو ایج کو لین گ، اج (بروزن مفتعلن) باندھا ہے۔ اس کا بھی کوئی جواز نہیں۔

۴۲۔　ع　رندوں کی یہ مستی بھی مگر سینز یبل ہے

اس کا پہلا مصرع ہے، ع واعظ کا جو ارشاد ہے وہ ریزنیبل ہے۔ سینز یبل کوئی لفظ نہیں۔ ہو بھی تو اس میں ی کو ساقط کیے بغیر سی زنے بل (بروزنِ فاعلاتن) اردو کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا لیکن اس وزن میں یہ تلفظ آ ہی نہیں سکتا۔ یہی کیفیت ریزنیبل کی ہے۔ دونوں مصرعوں کو کسی اور وزن میں نظم کیا جا سکتا تھا مثلاً

حضرت واعظ کا فرماں ریز جیل ہے ضرور مستی رنداں بھی لیکن سینز جیل ہے ضرور

۴۳۔ ع فرنیچر دیکھتے ہیں اور ڈنر دیکھتے ہیں

پہلے لفظ کا تلفظ انگریزی کے مطابق باندھا ہے لیکن اردو میں اسے فرنی چر (بروزنِ مفعولن) کہنے کا رواج ہے۔

۴۴۔ ع سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

اہل یورپ کے ساتھ ہوٹل میں چکھی سید نے ایک دن کاری

میں پریشان رہا کہ یہ کاری کیا چیز ہے۔ پھر سمجھ میں آیا کہ یہ curry کی تخریب ہے میں نے کسی کی زبان سے کاری نہیں سنا۔

۴۵۔ ع کونسل میں شریک ہو گا کل ملک ع کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

اکبر اس لفظ کو کوں + سل (بروزنِ فعلن) باندھتے ہیں۔ کون + سل (بروزنِ فاعلن) بہتر ہوتا یعنی اس لفظ میں نون غنہ نہیں، نون اعلان کے ساتھ ہے۔

۴۶۔ اس کو کالج اور اسے کانووکیشن سمجھو

کانووکیشن کے پہلے مصوتے کو طویل بولا جائے کہ خفیف؟ میری رائے میں اردو میں خفیف کر کے کنووکیشن لکھنا بہتر ہے۔

۴۷۔ ع گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود ع انفلوئنزا ہوا کرنیل بھی مرنے لگے

جنرل کو تو اردو میں جرنیل سننے میں آیا ہے لیکن کرنل کو کرنیل لکھتے بولتے نہیں سنا۔

۴۸۔ ع چشمِ بد دور اب بنے ہیں آپ کمسریٹ کے اونٹ

انگریزی commissariat کا تلفظ کمساریٹ ہے۔ اردو میں اسی کو کم سریٹ کہہ دیتے تھے۔ اس کے معنی ہیں فوج میں سپلائی کا محکمہ۔ اکبر نے اس لفظ کو بار بار استعمال کیا ہے۔ معلوم نہیں اس میں کیا طنز پوشیدہ ہے۔

۴۹۔ ع سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لپ سے جاری تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

جلوۂ دربار دہلی میں چوتھا مصرع حشو ہے۔ مجھے کہنا ہے کہ انگریزی الفاظ کیمپ اور لیمپ کا تلفظ پمپ اور جمپ سے مختلف ہے۔ پہلے دو لفظوں میں مصوتہ 'a' ہے بعد کے دو لفظوں میں 'u' انھیں ہم قافیہ بنانا درست نہیں۔ کمپ اور لمپ کے بجائے کیمپ اور لیمپ لکھا جاتا تو تلفظ کے قریں ہوتا۔

۵۰۔ ع سچ کہا مرزا نے، اب اردو بھی کورٹ ہوگئی

انگریزی اور اردو دونوں میں کورٹ کو رائے ساکن بولا جاتا ہے لیکن ایک اصطلاح کے طور پر عوامی تلفظ رائے مفتوح کے ساتھ ہی مروج ہے۔ انگریزی عہد میں ایک محکمہ تھا کورٹ آف وارڈس۔ بڑے زمینداروں اور تعلقداروں میں اگر کوئی برے اطوار اختیار کر لیتا اور اندیشہ رہتا کہ وہ سب زمین جائیداد پھونک دے گا تو اس کی نابالغ اولاد کے مفاد کی خاطر حکومت والد کو بے دخل کر کے اس کی املاک کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے سپرد کر دیتی تاوقتیکہ اس کا نابالغ وارڈ بالغ نہ ہو جائے۔ املاک کے لیے ایک منیجر مقرر کر دیا جاتا تھا جو بالعموم بڑے پیمانے پر خورد برد کر کے جائیداد کو چوپٹ کر دیتا تھا۔ سرکار کا یہ عمل کورٹ ہونا بولا جاتا تھا۔ اکبر نے اردو کو بھی کورٹ کر دیا ہے۔

۵۱۔ ع ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں

بصیغۂ جمع گرلس چاہیے، محض گرل اسکول نہیں۔ اگر اسی مصرع میں گرل کو گرلس لکھ دیا جائے تو وزن میں کوئی فرق نہ پڑے گا اور معنی راست ہو جائیں گے۔

۵۲۔ فطرت کے کارخانے میں غم کا گدام ہے

انگریزی لفظ go-down ملائے زبان کے گدانگ سے ماخوذ ہے۔ اردو میں اسے عموماً گودام کہتے ہیں گدام نہیں۔ عجلت سے بولنے میں گدام بھی کہا جا سکتا ہے۔

۵۳۔ بھینس کو گون پہنا دیجیے عاشق ہو جائیں

عوام دوہرے مصوتے کو اکہرا کر کے بولنے کے عادی ہوتے ہیں۔ گاؤن کو عامیانہ تلفظ میں گون کہہ دیتے ہوں گے۔ اس مصرع میں گون کی جگہ گاؤن لکھ دیا جائے تو بھی وزن میں

کوئی خلل نہ ہوگا۔

۵۴۔ ع ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی پی نہیں سکتے

ع کبھی سوڈا، کبھی لمنڈ، کبھی وھسکی، کبھی ٹی ہے

لمنڈ میں وہی دقت درپیش آتی ہے کہ اس لفظ کے دونوں مصوتے خفیف وطویل کے درمیان بولے جاتے ہیں۔ اردو میں دونوں جگہ ی ے سے لیمنڈ لکھنا تو زیادتی معلوم ہوگی، کسی ایک مصوتے کو طویل کر کے لیمنڈ یا لمنیڈ لکھ دیا جائے تو غنیمت ہے۔

۵۵۔ نہ ماتم کرنے والا ہے نہ لائف لکھنے والا ہے

لائف نہیں، لائف اسٹوری لکھی جاتی ہے۔ محض لائف لکھنا اسی طرح ناکافی ہے جیسے عمر لکھنا یا زندگی لکھنا کہیں۔ عمر نہیں، سوانح عمری لکھی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لائف، پائپ، ٹائپ وغیرہ کے تلفظ میں پھسلنے والا دوہرا مصوتہ ہے۔ اسے دو حصوں میں توڑ کر فعلن کے وزن پر لا + ئف، پا + ئپ، ٹا + ئپ کہنا تلفظ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ ان الفاظ کو فاع کے وزن پر باندھنا بہتر ہوتا۔ جس طرح را + ئے کو رائے کو بولنا فصیح نہیں، اسی طرح لائف بولنا لکھنا بھی فصیح نہیں۔

۵۶۔ ع تو دیکھو کہ عابد ہیں حضرت لٹوش

ان صاحب کا پورا نام لاٹوش تھا جس کے نام پر لکھنؤ کی مشہور سڑک لاٹوش روڈ ہے انھیں لٹوش کر دینا درست نہیں۔

۵۷۔ ع بسا یا حلقۂ میونسپل دیکھ

ع کرو نہ تعمیر گھر کی اکبر حدود میونسپل کے اندر

میونسپل کے بجائے پورا لفظ میونسپلٹی بہتر ہوتا۔

۵۸۔ ع عدل انگلش مین سے تو نیند آرہی ہے شیخ کو

یہاں 'مین' کو 'مَن' باندھا ہے۔ طویل مصوتے سے بہتر رہتا مثلاً

ع عدل انگلش میں سے نیند آرہی ہے شیخ کو

۵۹۔ ع مسمریزم کی ہر تقریر نثر اردو ہی پہ مشق

mesmerism کا انگریزی تلفظ میس مرزم ہے۔ اردو میں اسے مس مرے زم کہنا بڑی تخریب ہے لیکن اعتراف کروں کہ اردو رسم الخط کی بدولت لڑکپن میں میں بھی اکبر والا تلفظ مسمرے زم بولتا تھا۔ اب اسے ہپناٹزم کہا جاتا ہے۔

۶۰۔ ع بلبل داخل ہے میوزیکل کالج میں

کتاب میں میوزیکل چھپا ہے۔ صحیح میوزکل ہوتا اور وہی مصرع میں باندھا گیا ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ میوزیکل کالج غلط ہے، صحیح میوزک کالج ہے اور اس کے ساتھ بھی مصرع موزوں رہتا۔

۶۱۔ ع مرے ولفیر میں بھی انٹرسٹ اب وہ نہیں لیتے

ولفیر میں یائے متحرک ہے، یہاں یائے ساکت باندھنا بالکل غلط ہے۔ صحیح تلفظ ویل فیئر (بروزن مفتعلن) ہوتا۔ کم از کم یوں ہی کہہ دیتے۔

ع وہ میرے ویلفیر میں انٹرسٹ اب کچھ نہیں لیتے

یا

ع ہمارے ویلفیر میں بھی وہ دلچسپی نہیں لیتے

۶۲۔ وصل کا اس بت خود بیں سے کوئی سنٹ کہاں صرف بوسے میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

قافیہ غلط ہے۔ پہلے مصرع میں ن سے پہلے زیر ہے، دوسرے میں زبر۔ ظاہراً گورنمنٹ کا تلفظ میم مکسور سے باندھا ہے۔

۶۳۔ ع ہوتا ہے فتح یورپین نان پاؤ سے

یورپین کے بجائے یوروپین بہتر تلفظ تھا لیکن اس وزن میں بآسانی نہیں آسکتا۔

آخری زمرہ ان الفاظ کا ہے جن کی جنس کے بارے میں مجھے شبہ ہے۔ اردو میں دخیل انگریزی الفاظ کی جنس کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ انھیں ان کے اردو مترادف کی جنس کے مطابق بولا جائے۔ ذیل میں اکبر کے اشعار سے کچھ

ایسے الفاظ پیش کر رہا ہوں جن کی جنس میری بول چال میں اکبر کے استعمال سے مختلف ہے۔ ضروری نہیں کہ سامعین یا قارئین میرے ہم خیال ہوں۔

۱۔ اسٹیمر اپنی ہم کو نہیں دیتے انگریز

میری رائے میں اسٹیمر یعنی پانی کا جہاز مذکر ہے۔

۲۔ یہ بے حکم کی آفس کیسی

چونکہ دفتر مذکر ہے اس لیے اردو میں آفس کو بھی مذکر استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ تہمد میں بٹن جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اُگا

میں نے پتلون کو ہمیشہ مونث سنا اور بولا ہے۔

۴۔ طریق مغربی سے ٹیبل آیا، کرسیاں آئیں

میں میز اور اس کی انگریزی اصل ٹیبل دونوں کو مونث بولتا ہوں۔

۵۔ انگلش ڈرس انور کا جو کل بزم میں دیکھا

اردو میں پوشاک مونث اور لباس مذکر ہے۔ میری رائے میں ڈریس کو مونث بولنا چاہیے۔

۶۔ ع جب حکومت کرے خود اس کا ڈفنس

ڈفنس کے لیے دونوں جنس ممکن ہے۔ میں تذبذب میں ہوں کہ کون سی بہتر ہے۔ اس کے مترادفات میں صفائی مونث ہے، دفاع اور بچاؤ مذکر۔

۷۔ ع گورفل اپنا کام کرتا ہے

بندوق کی طرح رفل یا رائفل بالاتفاق مونث ہے۔

۸۔ ع ورنہ سائنس پیں ڈالے گا تمھیں ع پورا سائنس تم کو آنے کا نہیں

ع روح کا پہچاننا سب سے بڑا سائنس ہے

میری رائے میں سائنس کی تانیث مرجح ہے۔

۹۔ ع نہیں اٹھانے کا نیچر حکومت جبری

فطرت اور قدرت کی طرح نیچر بھی مونث ہے۔

۱۰۔ ع مرے ولفیر میں بھی انٹرسٹ اب وہ نہیں لیتے

بہبود، فلاح اور بھلائی کی طرح ویلفیر کو بھی مونث بولا جانا چاہیے۔

۱۱۔ شکل کوے کی ہیٹ سوے کی

ہیٹ کا اردو ترجمہ ٹوپ ہے، ٹوپی نہیں۔ ٹوپ مذکر ہے اس لیے ہیٹ بھی مذکر ہونا چاہیے۔

ان معروضات کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ یہ اعتراضات نہیں، اختلاف ہیں۔ اکبر یا کوئی اور صاحب ان الفاظ کی جنس میرے مفروضے کے خلاف استعمال کریں تو ایں پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

مندرجہ بالا جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے بیشتر صورتوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال اپنے حریفوں کے موقف پر طنز و مضحکہ کے لیے کیا۔ ان کے بیشتر الفاظ ہماری موجودہ بول چال کے لحاظ سے فطری ہیں لیکن بعض الفاظ صریحاً غیر فطری، آورد اور تصنع آمیز ہیں۔ ایسا اکثر قافیے کی مجبوری سے کیا گیا ہے۔ اس قسم کے بعض الفاظ یہ ہیں:

اسٹیلین، ایوولوشن، انٹریگ، اسکیوز، اسکیمی، ارکٹ، بیف، بیوٹی، پارٹی، ٹرس، سالویشن، سینز یبل، سلکٹ، سزمٹی، ہی، شی، شومیکری، فیم، فٹسٹ (fittest)، فائنل ہچ، فالور، فیٹ، کلیگ، کانشنس، کاری، گلڈنگ، گزیٹڈ جنوں، لا، لائلٹی، بزی، مینر، مسٹری، نیوز، منی، مس ٹیک، نیلنگ، وسپر، وٹی، وری (very)، واک، ورچوئس، ہے پی، ہچ، ہائی مارک۔

قافیے یا وزن کی مجبوری کی وجہ سے بہت سے الفاظ کا تلفظ مسخ کرنا پڑا ہے۔ ان مشاہدات کے باوجود یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اکبر نے مجموعی طور پر انگریزی الفاظ کو اپنے مقصد کے لیے خوب استعمال کیا۔ ان کے ۹۰ فی صد انگریزی الفاظ سامعین کو خوش آتے ہیں۔ صرف دس فی صد ایسے ہوں گے جو زبردستی کی ٹھونس ٹھانس معلوم ہوتے ہیں۔

☆

اردو میں دخیل انگریزی الفاظ کی جنس

جو زبان جتنے زیادہ وسیع علاقے پر پھیلی ہوتی ہے اس میں بولیوں اور ذیلی بولیوں کے ابھرنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ شمالی اور وسطی ہند میں یوں تو کئی بولیاں اور زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن یہاں رابطے کی نیز تہذیبی زبان ہندوستانی ہے جس کا ایک روپ اردو ہے۔ اس علاقے میں نہ صرف آج مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں بلکہ عہد عتیق میں بھی مختلف اپ بھرنشیں اور پراکرتیں بولی جاتی تھیں۔ مختلف علاقوں کی اردو میں صوتی و قواعدی اختلافات کسی حد تک اسی ورثے کی دین ہیں۔ دلی اور لکھنؤ میں جو کئی الفاظ کی جنس میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کی تاریخی وجہ یہی ہے کہ دلی کھڑی بولی کے علاقے میں ہے اور لکھنؤ اودھی کے علاقے میں۔ ان دونوں زبانوں کے اجداد مختلف تھے۔ ان کے اخلاف آج بھی اپنے اجداد کا محاورہ نہیں بھولے۔

اب جنس ہی کو لیجیے۔ ہماری زبان میں جانداروں کی فطری جنس کے علاوہ قواعدی جنس بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ ایک جنس جسمانی ہوتی ہے دوسری نظریاتی جو ہم نے بعض جانوروں، تمام بے جان اشیا اور مجرد جذبات و کیفیات کو مفت کرم داشتن کے طور پر بخش دی ہے۔ گینڈا، بھیڑیا، لکڑ بھگا، چیتا، سانبھر، سارس، الو، بگلا، چمگادڑ، کنکھجورا اور کوڑا وغیرہ میں نر ہی نہیں، مادہ بھی مذکر جنس کی حق دار ہیں جب کہ لومڑی، چیل، بطخ، فاختہ، چھپکلی، دھامن (اژدھا) چیونٹی وغیرہ کے بیچارے نر کو بھی مونث کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ یہ قواعدی جنس کا کرشمہ ہے۔ انگریزی میں بے جان چیزوں کے لیے Neuter Gender ہوتا ہے۔ سنسکرت

میں دو جنسوں کے علاوہ نیوٹر (مخنث) جنس بھی ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں چوں کہ فعل، صفت اور حرف (کا، کی، سا، سی) میں بھی جنس ہے اس لیے لامحالہ ہر فاعل کو کوئی نہ کوئی جنس دینی ہوگی۔

لوک سبھا میں لنا ڈی ایم کے ایک ممتاز رکن نے کہا تھا کہ ہندی بغیر قواعد کی زبان ہے کہ اس میں Chair مونث ہے Table مذکر۔ مجھے ٹیبل اور میز کے مذکر ہونے میں شبہ ہے۔ میں "آپ کی ٹیبل" "آپ کی میز" بولتا ہوں۔ فرہنگ آصفیہ میں بھی میز مونث ہے، لیکن ان معزز رکن کو یہ معلوم نہیں کہ ہماری زبان میں غیر ذی روح اشیا ہی نہیں کیفیات وجذبات بھی جنس زدہ ہیں مثلاً خوشی، ہمت، راحت مونث ہیں جب کہ ان سے مماثل مفہوم کے حظ، حوصلہ، آرام مرد ہیں۔ ہم نے تو جنسی شعور کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ حروف تہجی میں بھی جنس کا تعین کر دیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق الف، سین، شین مذکر ہیں۔ ب، پ، ج، چ، واؤ، ہ وغیرہ مونث ہیں۔ ہم بولتے ہیں س لکھا، ع لکھی، پھر انگریزی کے بارے میں بھی طے کرنا ہوگا (۱) لکھی، (۲) لکھا۔

یہ سب قواعدی جنس کے تماشے ہیں۔ یہ قیاسی نہیں سماعی ہے یعنی اس کے کوئی اصول نہیں، اہل زبان نے جس لفظ کو جس طرح بولنا شروع کر دیا وہی درست ہے۔ غیر زبان والا ہمارے الفاظ کی قواعدی جنس کی گرفت نہیں کر سکتا۔

واضح ہو کہ اردو میں جنس اور تلفظ کا کوئی مسلمہ، مشترک، سکہ بند معیار نہیں۔ کوئی شاعر یا نثار، کوئی لغت ایسی نہیں جسے سب تسلیم کریں۔ اردو دنیا میں آمریت نہیں جمہوریت ہے۔ دلی اور ملک کے بیشتر علاقوں میں گیند مونث ہے، حیدرآباد میں گیند اور انگریزی لفظ بال دونوں مذکر ہیں۔ لکھنؤ میں گیند غالباً مذکر ہے۔ ہماری اردو میں اختلاف آرا کو خندہ پیشانی سے قبول کیا جاتا ہے۔

صوتیات وقواعد کے لحاظ سے شمالی ہند کی اردو کے تین بڑے علاقے ہیں۔ پنجاب ہریانہ، دلی ومغربی یوپی، لکھنؤ ومشرقی یوپی وبہار۔ ان علاقوں میں بھی اندرونی وحدت و

یکسانیت نہیں۔ دلی اور مغربی یو پی کے مختلف اضلاع بلکہ تحصیلوں میں بعض الفاظ کی جنس مختلف طرح سے بولی جاتی ہے۔ واضح ہو کہ زبان اور بولی کا اختلاف مذہب سے بے نیاز ہے۔ یہ علاقے کا تابع ہے مثلاً میرے وطن سیوہارہ، ضلع بجنور میں دہی کو ہندو مسلمان سب مونث بولتے ہیں جب کہ نزدیک کے مرادآباد میں مذکر۔ فرہنگ آصفیہ میں دہی، کو مذکر لکھ کر نوٹ دیا ہے کہ ہندو مونث بولتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ اس میں مذہب کی کوئی تخصیص نہیں۔ (۱) الہ آباد میں عوام غصہ اور پیشاب کو مونث بولتے ہیں۔ غصہ آئی، پیشاب آئی۔ بریلی کھڑی بولی کے علاقے میں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسے دلی کی تقلید کرنی چاہیے۔ لیکن بریلی کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری یافتہ، غصہ آتی بولتے ہیں۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایک علاقے میں بھی ہر لفظ کی جنس میں یکسانیت نہیں۔ یہ بولی کی طرح بارہ بارہ کوس پر بدلتی رہتی ہے۔

کسی علاقے کے دیسی الفاظ کی جنس تو خواتین اور عوام کی گفتگو کا مشاہدہ کر کے طے کی جا سکتی ہے لیکن عالمانہ الفاظ نیز دوسری زبان سے مستعار الفاظ کی جنس کا کیا کیا جائے؟ بعض اوقات عربی فارسی کے الفاظ بھی چکرا دیتے ہیں کہ انھیں مذکر بولا جائے یا مونث مثلاً ایجاد، احتیاط، گزک، برف، فکر۔ اس قسم کے کئی ایسے الفاظ ہیں جن کے بارے میں مختلف علاقوں اور اشخاص ہی میں نہیں بلکہ، ایک شخص کی بولی میں بھی مختلف اوقات میں فرق ملتا ہے۔ وہ ایک لفظ کو ایک موقع پر مذکر بولتا ہے دوسرے موقع پر مونث، گویا جنس کی حد تک یہ الفاظ آزاد تغیر Free Variation کی منزل میں ہوتے ہیں۔ میں خود اس تلون کا گنہ گار ہوں۔ بعض الفاظ میں ایک جنس کے استعمال کو ترجیح دیتا ہوں لیکن کبھی کبھار دوسری جنس بھی بول جاتا ہوں۔

جب اپنے الفاظ کا یہ حال ہے تو انگریزی سے مستعار الفاظ کی جنس کا کون سا پیمانہ مقرر کیا جائے؟ لیکن ہم ان کے لیے کوئی نہ کوئی جنس استعمال تو کرتے ہیں۔ افسوس کہ اس کا تعین دیسی الفاظ کی طرح باقاعدہ نہیں۔ یہ انفرادی ہے، سماجی ہے۔ کسی نے کوئی جنس استعمال کر لی۔ دوسرے نے اس سے سن کر اسی طرح بول دیا لیکن کوئی تیسرا شخص دوسرے ڈھنگ سے بولتا

ہے۔ میں نے انگریزی کے (دوسری یورپی زبانوں سمیت) الفاظ کی جنس کا جائزہ لیا تو اس میں اتنا بڑا خلفشار نہیں پایا جس کا اندیشہ تھا۔ ان کی جنس کے وقوع کے اصول اخذ کرنے کی کوشش کی۔

انگریزی الفاظ کی جنس کی دریافت کے لیے بہترین قاعدہ تو یہ ہوتا کہ میں بیسویں صدی کے ادیبوں کی تحریروں کا جائزہ لے کر فہرست بناتا کہ کس لفظ کو کیا جنس دی گئی ہے لیکن ایک مضمون کے لیے میں اتنی مفصل تحقیق نہیں کر سکتا۔ میں نے دوسرا بہترین طریقہ اپنایا کہ اپنے کتب خانے سے دو لغات، فرہنگ آصفیہ اور فیروز اللغات کا جائزہ لیا۔ دونوں میں انگریزی الفاظ شامل ہیں، ان کو اردو کے ساتھ رومن میں لکھا ہے۔ نیز تقریباً ۹۵ فی صد صورتوں میں ان کی جنس کی صراحت کی ہے۔

فیروز اللغات میں انگریزی الفاظ کی تعداد آصفیہ سے کافی زیادہ ہے۔ میں نے ان دونوں لغات کے جملہ الفاظ لکھ لیے۔ مجھے نور اللغات نہ مل سکی۔ ان کے علاوہ اپنی یادداشت سے کافی الفاظ کا اضافہ کیا۔ واضح ہو کہ ہماری زبان میں انگریزی الفاظ کا دخل نہایت وسیع ہے۔ اگر تحریر سے بڑھ کر تقریر کو بھی شامل کر لیں تو انگریزی الفاظ کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ ترسیل کی سہولت کی خاطر ہم مشکل عربی فارسی، سنسکرت الفاظ سے بچ کر ان کے ہم معنی انگریزی الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ ان سے اردو والے، ہندی والے نیز ملک کی دوسری زبانوں والے بھی مانوس ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم تن آسانی کی وجہ سے ایسے موقعوں پر بھی انگریزی الفاظ لے آتے ہیں جہاں ان سے بہ آسانی بچا جا سکتا تھا مثلاً کچھ جملے ملاحظہ ہوں۔ دلچسپی کی خاطر دو سابقہ جملے بھی بول چال کے لہجے میں لکھتا ہوں:

(۱) ہم Ease of Communication کے لیے۔ Difficult Arabicd An Sanskrit Words Avoid کر کے ان کے English Synonyms کو Prefer کرتے ہیں۔ ان سے نہ صرف اردو ہندی والے بلکہ Other Languages Speakers بھی More Familiar ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم Sheer Laziness کی وجہ سے ایسے

موقعوں پر بھی English Words کر لیتے ہیں جہاں انھیں Conveniently کیا جا سکتا تھا۔

(۲) میں اس میٹنگ کی پریزیڈنٹ شپ کے لیے مسٹر ایم۔ ایف حسین کا نام Propose کرتا ہوں اور ان سے Request کرتا ہوں کہ Chair پر آ کر Presidential Chair کو Grace کریں۔

(۳) یہ Cushion بیچ کرنے میں کتنا Soft اور Smooth ہے۔

اگر کوئی اردو میں دخیل انگریزی الفاظ کا جامع جائزہ لے تو اسے تقریر میں دخیل الفاظ کے لیے کئی باب وقف کرنے ہوں گے۔ میرا جائزہ زیادہ تر کتابی الفاظ تک محدود ہے لیکن میں نے بول چال میں زیادہ مستعمل انگریزی الفاظ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ تلاش کی جائے تو ممکن ہے وہ اردو تحریر میں بھی مل جائیں۔ میں جو الفاظ لے رہا ہوں نمونہ از خروارے سمجھیے کیوں کہ اس دور میں انگریزی الفاظ کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ انگریزی کے کسی بھی لفظ کو اردو جملے میں بے دھڑک داخل کر دیا جاتا ہے۔

یہ جائزہ صرف قواعدی جنسی والے لفظوں تک محدود ہے۔ طبعی جنس رکھنے والے جانداروں کو شامل نہیں کیا گیا۔ نیز وہ تمام الفاظ جو کسی انسان ہی کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں خارج رہیں گے مثلاً اسٹوڈینٹ، اسسٹنٹ، ٹیلر، وارڈن، کک (Cook) گورنر وغیرہ جن کی جنس حسب سیاق طے کی جاتی ہے مثلاً جب ہم اندرا گاندھی کا ذکر کریں گے تو لکھیں گے۔

''پرائم منسٹر چاہتی تھیں''

جب راجیو گاندھی کا ذکر ہو گا تو کہیں گے:

''پرائم منسٹر چاہتے تھے''

اگر ایک کلاس میں صرف لڑکے پڑھتے ہیں تو ہم کہیں گے ''تمام اسٹوڈینٹ آ گئے۔'' اگر صرف لڑکیاں ہوں تو کہیں گے ''تمام اسٹوڈینٹ آ گئیں'' لیکن اگر لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو کہیں گے ''تمام اسٹوڈینٹ آ گئے۔'' اگر کالج میں تمام اسٹوڈینٹ ہڑتال کر دیں تو ہم یہ کہتے ہیں۔

"آج لڑکوں نے اسٹرائک کر دی اس لیے کلاس نہ ہو سکا"

اتنی تفصیل سے نہیں کہتے

"آج لڑکوں اور لڑکیوں نے اسٹرائک کر دی۔۔۔"

اس سے یہ اصول سامنے آیا کہ ہماری زبان میں جب ذکور وا ناث دونوں مراد ہوتے ہیں تو ان کے لیے مذکر فعل استعمال کیا جاتا مثلاً

"اگر ہندوستانی تعداد سے بڑھتے رہے تو پچیس سال میں دوگنے ہو جائیں گے"

"کمبھ کے میلے میں لاکھوں آدمی آیا ہوا تھا۔"

"پنجابی دہی کا بہت استعمال کرتے ہیں۔"

"آدمی سانپ اور شیر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

اس جائزے کے سلسلے میں مجھے یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ اردو میں غیر ذی روح اسما اور غیر مرئی جذبات و کیفیات میں مذکر بہت زیادہ ہیں، مونث بہت کم۔ شاید ہمارے تحت الشعور میں پوشیدہ اسی اصول کا نتیجہ ہو کہ جہاں مذکر و مونث دونوں مراد ہوں ہوں مذکر جنس کا استعمال کرو۔ آپ بھی کبھی تذبذب میں ہوں کہ کسی انگریزی دخیل لفظ کو مذکر بولا جائے کہ مونث، تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے مذکر بولیے۔

میرا جائزہ انگریزی کے اسما اور حاصل مصدر تک محدود ہے کیوں کہ انگریزی میں صفت اور تمیز (Adverb) کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ وہ موصوف کا رنگ قبول کر لیتی ہے مثلاً Slow فارورڈ، بیک ورڈ، لوکل، آؤٹ سائڈ، Soft، Busy وغیرہ کو ہم نہ مذکر کہہ سکتے ہیں نہ مونث۔ انگریزی فعل کو ہم کوئی جنس دینا چاہیں تو وہ ہمیشہ مذکر ہوگی مثلاً Apply کیا، Touch کیا، Despatch کیا۔

اس طرح ہمیں صرف اسما کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے اور وہ بھی قواعدی جنس والے اسماء کے لیے۔ کبھی کبھی فرہنگ آصفیہ اور فیروز اللغات میں بعض الفاظ کی جنس میں فرق ملتا ہے مثلاً:

(۱) ایم او یل، Boat (کشتی)، پارٹی آصفیہ میں مذکر اور فیروز میں مونث ہیں۔

(۲) اسکالرشپ، Cheque، ڈپو، آصفیہ میں مونث اور فیروز میں مذکر ہیں۔

بعض اوقات ایک لفظ کی جنس کسی لغت میں حذف ہے، دوسری میں دی ہے۔ کئی الفاظ کو فیروز میں مذکر و مونث دونوں لکھا ہے ہم اسے مشترک جنس کہہ سکتے ہیں۔ آصفیہ میں ایسا کہیں نہیں۔ میں اس جائزے میں ہر جگہ ان لغات کی پابندی نہیں کروں گا۔ ہر لفظ کی جنس اپنے استعمال اور ترجیح کے مطابق دوں گا جو کم از کم ۹۵ فی صد صورتوں میں لغات کے مطابق ہے۔ میرے لیے کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہی نہیں۔ سامعین و قارئین کو ان میں سے کئی الفاظ کی جنس سے اختلاف ہوسکتا ہے اور انھیں اس کا پورا حق ہے۔ یہ مضمون اسی آزادی رائے و حق اختلاف کو تسلیم کر کے بنے پڑھیے۔ کئی الفاظ ایسے ہیں جن کی جنس کے بارے میں میں شافی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ انھیں مشترک جنس سمجھیے۔

(۱) دخیل انگریزی الفاظ کی جنس کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ ہم انھیں ان کے مترادف اردو لفظ کی جنس دیتے ہیں۔ اگر اس میں فرق دکھائی دے تو اردو سے ہٹ کر ایک نظر ہندی پر بھی ڈال لیجیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے مترادف ادو اور ہندی لفظ کی جنس مختلف ہو اور انگریزی لفظ نے ہندی لفظ کی جنس اختیار کی ہو مثلاً

آنر مذکر۔ عزت مونث۔ سمان مذکر

سالویشن مذکر۔ نجات مونث۔ نروان مذکر

سلیف ریسپیکٹ مذکر۔ خودداری مونث۔ آتم سمان مذکر

اس طرح ان الفاظ نے ہندی کی جنس کو ترجیح دی ہے۔

مندرجہ بالا اصول سے کچھ استثنائی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ا۔ ذیل کے انگریزی الفاظ مذکر بولے جاتے ہیں گو ان کا اردو مترادف مونث ہے۔ قوسین میں اردو مترادف دیا جا رہا ہے۔

بیلنس (ترازو لیکن توازن مذکر)۔ چاک (کھریا)۔ فرنٹیر (سرحد لیکن ڈانڈا مذکر)۔

کلاک (گھڑی لیکن اس کا عکس گھڑیال مذکر)۔ کلچر (تہذیب، سبھیتا)۔ کورٹ (عدالت، کچہری) لیٹر (چٹھی، لیکن خط مذکر) لینڈ (زمین، بھومی)

الٰہ آباد یونی ورسٹی سے مجھے ایک صاحب نے لکھا۔ اب بال آپ کی کورٹ میں ہے، لیکن فرہنگ آصفیہ اور میرے استعمال کے بہ موجب کورٹ مذکر ہے۔

ب: ذیل کے انگریزی الفاظ مونث ہیں گو ان کے اردو مترادف مذکر ہیں۔

اسکالرشپ (وظیفہ)۔ بٹالین (دستہ، رسالہ)۔ بلیٹن (رسالہ)۔ پرائمر (قاعدہ)۔ پلٹن (رسالہ، دستہ)۔ ڈریس (لباس، لیکن پوشاک مونث)۔ رجمنٹ (رسالہ، دستہ)۔ کمان (حکم اور کمانڈ مذکر)۔ کوآپریشن (میل جول، اتحاد)۔ میگزین (رسالہ)۔ ورکشاپ (کارخانہ)۔ یونی ورسٹی (مدرسہ، جامعہ، کلیہ" وغیرہ بعد کے ترجمے ہیں)

(۲) انگریزی الفاظ کی جنس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ یائے معروف پر ختم ہونے والے ۹۹ فی صد الفاظ مونث ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی 'ای' عموماً تانیث کی نشانی ہے گو پیشوں سے متعلق چند الفاظ نیز یائے نسبتی والے الفاظ مذکر ہیں:

بھنگی، درزی، دھوبی، موچی

پوستی، افیونی، ہندوستانی، پنجابی، روسی، امریکی

انگریزی کے ای پر ختم ہونے والے الفاظ بالعموم مونث ہوتے ہیں مثلاً

آبرویٹری، اسٹیشنری، جبلی، جیوری، ڈاکٹری، ڈائرکٹری، ڈگری، رجسٹری، سنچری، کراکری، کٹلری، کمشنری، لاٹری، لانڈری وغیرہ۔

ای کے لاحقے والے علوم بھی مونث ہیں مثلاً آرکیالوجی، کیمسٹری وغیرہ۔ اس لاحقے کے متعدد ایسے انگریزی الفاظ بھی مونث ٹھہرے جن کا اردو مترادف مذکر ہے مثلاً

آرٹلری (توپخانہ)۔ انفنٹری (پیدل دستہ)۔ تھیوری (نظریہ)۔ ٹرالی (ٹھیلا)۔ ٹریژری (خزانہ)۔ جیوگرافی (جغرافیہ)۔ ڈائری (روزنامچہ)۔ ڈسپنسری (شفاخانہ)۔ ڈلیوری (حوالے کرنا)۔ سپلائی (فراہم کرنا)۔ سوسائٹی (سماج)۔ فلاسفی (فلسفہ)۔ فیکٹری

(کارخانہ)۔ فیملی (خاندان۔ گھرانا) کیویلری (گھڑ سوار دستہ)۔ لائبریری (کتب خانہ، پستکالے)۔ یونٹی (میل ملاپ، اتحاد)۔

لاحقہ ای کے چند الفاظ مذکر دکھائی دیے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب انسانوں، بالخصوص مردوں سے متعلق ہیں:

اردلی، پادری، مستری (فرہنگ آصفیہ کے مطابق Master سے ماخوذ) مشتری علاقوں کے نام میں یائے نسبتی لگا کر جب زبان مراد ہو تو مونث اور جب انسان مراد ہوتے ہیں تو مذکر۔ روسی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی۔

انسان مراد ہوں تو یہ اس لیے مذکر ہیں کہ جب مرد، عورت دونوں کا ذکر ہو تو ہم مذکر جنس استعمال کرتے ہیں مثلاً:

- روسی بہت بسیار خور ہوتے ہیں۔
- فرانسیسی بہت مہذب ہوتے ہیں۔

Journey اپنے اردو مترادف، سفر کی وجہ سے مذکر ہے۔

۳۔ ذیل کے لاحقوں والے الفاظ بالعموم مذکر ہوتے ہیں۔

ا۔ انگریزی ER یا OR کا لاحقہ فاعلیت ظاہر کرتا ہے۔ چوں کہ یہ اکثر انسانوں سے متعلق ہوتا ہے اس لیے مذکر ہوتا ہے مثلاً باربر، انجینیر، کسٹمر۔ جو بے جان چیزیں اس لاحقے سے بنی ہیں وہ بھی مذکر ہیں مثلاً

آرمیچر، اسٹارٹر، اسٹریچر، اسٹیمر، اسکوٹر، اسکریو ڈرائیور، ایکسنر، ایرکنڈیشنر، بوائلر، بلوور، پوسٹر، ٹائپ رائٹر، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلی پرنٹر، ریسور، ریمائنڈر، روٹر، رولر (پیمانہ)، ریفریجریٹرز، ریوالور، سرکلر Slipper (جوتی) Sleeper، (لکڑی کا تختہ)، سویٹر، سیکٹر، فرنیچر، کوارٹر، کمپیوٹر، کوکر، کولر، لاؤڈ اسپیکر، لٹریچر، لائن کلیر، موٹر (مشین کے معنی میں)، ہیٹر، ہولڈر۔

ایسے الفاظ جن کے آخر میں ER لاحقہ نہیں، اصلی معلوم ہوتا ہے وہ بھی مذکر ہیں مثلاً آفر، پاؤڈر، پیپر، تھرمامیٹر، ٹماٹر، ٹریٹر، ٹمپریچر، Dagger، سلنڈر، سنٹر، شولڈر، فیچر، کالر، کلنڈر،

کنستر، لیونڈر، نمبر، واٹر، ٹائر۔

ار کے لاحقے والے الفاظ میں صرف تین مستثنیات ذہن میں آئے جو مونث ہیں۔

پرائمر (یہ پرائمری بک کا مخفف ہے اس لیے مونث ہے)، Drawer، ریڈر (ابتدائی کتاب)

ذیل کے الفاظ کے آخر میں "ر" ما قبل مفتوح ہے، لیکن یہ اصلی ہے۔ لاحقہ نہیں۔ اس کے الفاظ اس لیے مونث ہیں کہ اردو میں ان کا مترادف مونث ہے۔

پکچر، Chair، Cheer (شاباشی)، سلور، فائر، نیچر (فطرت)۔

ب: ازم کے لاحقے کے تمام الفاظ بغیر استثنا کے مذکر ہیں۔

اکسپریشزم، امپریشزم، سرریلزم، سوشلزم، سیکولرزم، کمیونزم، سمریزم، پینڈلوم۔

ج: یم یا ایم کے لاحقے والے الفاظ مذکر ہیں۔

اسٹیڈیم، الٹی میٹم، پینڈلم، سمپوزیم، کریکلم، ہارمونیم۔

لیکن دھاتوں کے نام مونث ہوتے ہیں۔

پلاٹینیم، ریڈیم۔

د: "اس" کے لاحقے کے الفاظ بہت کم ہیں لیکن جو بھی ہیں مذکر ہیں۔

اٹلس، پراسپکٹس، ریڈیس، سلیبس۔

ھ: "انس" Ence کے لاحقے والے بیشتر الفاظ مذکر ہیں۔

انٹرینس، الاوینس، انشورینس، انفلوینس، پیئنس، Suspence، کانشنس۔

ذیل کے الفاظ اپنے اردو مترادف کی تانیث کی وجہ سے مونث ہیں۔

انڈی پنڈینس (آزادی)، فائنس (مالیات)، کانفرنس (مجلس، انجمن)، کارسپانڈینس (مراسلت)۔

و: "شن" کے لاحقے کے بیشتر الفاظ مذکر ہیں۔

انجکشن، آبزرویشن، آپریشن، آکشن، ایڈیشن، ایڈمنسٹریشن، امپریشن، ایکسپریشن،

ایر کنڈیشن، انسٹی ٹیوشن، الیکشن، امی ٹیشن، اسٹیشن، پروبیشن، پروفیشن، پروکلیمیشن، جنکشن، ڈکٹیشن، ڈیپوٹیشن، ڈیڈیکیشن، رجسٹریشن، ریزرویشن، رسپشن، ریگولیشن، راشن، ریولوشن، سالویشن، سیشن سیشن، فیڈریشن، فیشن، کانسٹی ٹیوشن، کمیشن، کنونیکیشن، کنویشن، لوشن، موشن، کمپیٹیشن، میٹریکولیشن، نوٹیفکیشن وغیرہ۔

مندرجہ بالا الفاظ کے اردو مترادف میں امی ٹیشن (نقل) اور سالویشن (نجات، ہندی نروان) کے علاوہ بقیہ سب مذکر ہیں۔ 'شن' پر ختم ہونے والے ذیل کے الفاظ مونث ہیں کیوں کہ ان سب کے اردو مترادفات بھی مونث ہیں۔

سڈیشن Sedition، کارپوریشن 'Vacation' نیشن، کوآپریشن ہی ایسا مونث لفظ ہے جس کے اردو مترادف تعاون، اتحاد، میل ملاپ مذکر ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ لاحقہ 'شن' والے بیشتر الفاظ مذکر ہیں اس لیے 'شن' والے انگریزی الفاظ میں بھی بیشتر مذکر ہیں۔

ز: لاحقہ 'نگ' کے الفاظ بھی بیشتر مذکر ہوتے ہیں:

اسپرنگ، اسکیٹنگ، انجینیر نگ، ایرکنڈیشننگ، بانسنگ، بورڈنگ، بک کیپنگ، Boing، پرنٹنگ، پلاننگ، پوسٹنگ، پیکنگ، ڈائننگ، شوٹنگ، ماؤسٹینرنگ، واشنگ، ہائکنگ، ہیرڈریسنگ وغیرہ۔

ذیل کے الفاظ شاید اپنے اردو مترادف کی وجہ سے مونث ہیں۔

بلڈنگ (عمارت)، ٹریننگ (تربیت)، ڈرائنگ (تصویر، نقش گری)، سیونگ، میٹنگ (بیٹھک)

ح: لاحقہ 'منٹ' کے ذریعے اسم بنائے جانے والے تمام الفاظ مذکر ہیں مثلاً:

اسٹینمنٹ، اکناؤلیج منٹ، اگیری منٹ، الاٹ منٹ، پیپر منٹ، ٹورنا منٹ، ڈپارٹ منٹ، رفریش منٹ، سپلی منٹ۔

مستثنا صرف ایک ہے گورنمنٹ جو شاید اپنے اردو مترادف حکومت کی وجہ سے مونث ہے، گو ہندی مترادف شاسن مذکر ہے۔

ط: لاحقہ گرام کے الفاظ مذکر ہوتے ہیں مثلاً پروگرام، ٹیلی گرام، کارڈیگرام، کلوگرام، فوٹو گرام، ایروگرام۔

۴) ذیل کے دو لاحقے مونث الفاظ بناتے ہیں:

ل۔ Ness کے الفاظ جو تحریر میں نہیں تقریر میں استعمال ہوتے ہیں:

Fitness, Greatness, Happiness, Hardness, Sadness, Shyness, Softness, Suddennesss, Swiftness.

ب۔ 'شپ' کے لاحقے کے الفاظ بہت کم ہیں، جو ہیں مونث ہیں:

اسکالرشپ، فری شپ، کورٹ شپ، ورشپ۔

۵) جیسا کہ پچھلے لکھا جا چکا ہے انگریزی کے افعال اردو میں مذکر استعمال ہوتے ہیں۔ ذیل کے افعال کی جنس جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں 'کرنا' کا امدادی فعل لگانا چاہیں تو 'کیا' لگانا ہوگا' کی نہیں۔

Apply، اکسپورٹ، امپورٹ، انٹروڈیوس، ڈانس، ڈیچ، ٹھیک ہینڈ کیال۔ لائن کلیر بجایا۔

(۶) اردو میں اسم تصغیر اور تکبیر کو مونث اور مذکر سے بھی ظاہر کرتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کی ایک ہی قسم کی بڑی چیز مذکر اور اس کی تصغیر مونث ہوتی ہے۔

پاٹ، پانی

ٹینک، ٹنکی

سگار، سگریٹ

کوٹ، کوٹی

کیفے، کیفے ٹیریا

لیکن ناول اور اس کی تصغیر ناولٹ دونوں مذکر ہیں۔ بعض حضرات ناول کو مونث بولتے ہیں۔ انھیں مبارک ہو۔ میں مذکر بولتا ہوں۔ یہ لفظ فرہنگ آصفیہ میں نہیں ہے، فیروز اللغات

میں مذکر دیا ہے۔

تین ادیبوں کے یہاں سے مثالیں:

ا۔ بڑے ناول تو کتابی صورت کے لیے مخصوص رہے۔(۲) عبدالماجد دریابادی

ب۔ اس دور میں جتنے ناول لکھے گئے۔(۳) وقار عظیم

یہ تینوں ناول ۱۹۱۸ء کے بعد لکھے گئے۔(۴) ممتاز حسین

اب انگریزی الفاظ کے چند زمروں کو لیتا ہوں۔

ا۔ انگریزی کے مہینے اور ہفتے کے دن سب کے سب مذکر ہیں۔ اردو میں ہفتے کے دنوں میں صرف جمعرات مونث ہے کیوں کہ اس میں مونث 'رات' موجود ہے۔

۲۔ لباس میں زیادہ تر مونث ہیں۔ حیرت ہے کہ مردانہ لباس بھی بیشتر مونث ہیں حالاں کہ اب کون سا انگریزی لباس مردوں کا اجارہ رہ گیا ہے؟

بش شرٹ، بیل باٹم، پینٹ، ٹائی، ٹیری کاٹ

ٹیرے لین، ٹی شرٹ، جیکٹ، جینز، شرٹ، فراک، کوٹی، نائکن۔

چند کپڑے مذکر ہیں اور حیرت ہے کہ اس میں خواتین کے ملبوسات بھی شامل ہیں۔

اسکرٹ، اوور کوٹ، برجس یا Breaches، بلاؤز، پیٹی کوٹ، جمپر، Slacks، کوٹ، گاؤن، نیکر، کٹ پیس، سوٹ۔

گویا ہم لباس کے بارے میں کوئی اصول نہیں بنا سکتے۔ یہ محض سماعی ہیں۔

۳۔ انگریزی زیوروں میں یہ مذکر ہیں۔

بریسلیٹ، Pendant' لاکیٹ، Set خواہ موتیوں کا ہو خواہ Diamond کا۔ نیک لیس، ایر رنگ مونث ہیں۔

۴۔ سواریاں بیشتر مونث ہیں:

آٹو رکشا، منی بس، بائسکل، ٹرام، ٹرین، ٹرک، ریل، سائیکل، موٹر کار، موٹر سائیکل، Moped، لاری، موٹر، فٹن، ٹیکسی۔

یہ سواریاں مذکر ہیں۔

اسٹیمر، اسکوٹر، شپ، ایروپلین، کوپٹر

۵۔ کھانوں اور ان کے متعلقات میں یہ مذکر ہیں:

اسکواش، Snack، بریک فاسٹ، Buffet، بسکٹ، پڈنگ، چاکلیٹ، ٹفن، ڈنر، Dessert، کولڈ ڈرنک، کیک، ریفریشمنٹ، لنچ، ہاٹ ڈاگ، ہیمبرگر۔

مونث: Patty، پیسٹری، ٹافی، چاپ، کٹلیٹ، ٹی۔

۶۔ منشیات میں Beer کو چھوڑ کر بقیہ سب مونث ہیں۔

ایل ایس ڈی، براؤن، شگر، برانڈی، ڈرائی جن، رم، شیم پین، شیری، میری جوانا، وائن، وسکی، ہیروئن۔

۷۔ موسیقی و ساز میں صرف بگل مونث دکھائی دی۔ اسے بھی کئی حضرات مذکر بولتے ہیں۔

بقیہ سب یقیناً مذکر ہیں۔

اسٹیریو، بینجو، بیگ پائپ، پیانو، ٹیپ ریکارڈر، ٹرمپیٹ، ٹو ان ون، تھری ان ون، ڈرم، رکارڈ، فلوٹ، کلیریونیٹ، کیسیٹ، گٹار، گراموفون، لاؤڈ اسپیکر، مائکروفون، میوزک، ہارمونیم۔

۸۔ رقص کے تمام الفاظ مذکر ہیں۔

بیلی ڈانس، ٹوئسٹ، جاز، ڈانس، راک اینڈ رول، شیک۔

۹۔ کھیل اور اس کے متعلقات زیادہ تر مذکر ہیں۔

اسپورٹ، Squash, Score، اسنوکر، اسٹیڈیم، ان ڈور گیم، آؤٹ، آؤٹ ڈور گیم، باکسنگ، بیڈمنٹن، بلیرڈ، بنٹم، ویٹ، پولو، پویلین، ٹینس، ٹیبل ٹینس، جمناسٹک، جوڈو، Draw، Run، Race، ریکیٹ، فاؤل، فیدر ویٹ، کرکٹ، کورٹ، کیرم، گول، گولف، لانگ جمپ، لائٹ ویٹ، ہائی جمپ، ہیوی ویٹ، ہیمر تھرو۔

ذیل کے الفاظ مونث ہیں۔

Innings، بال اور اس سے متعلق تمام کھیل، باسکیٹ بال، بیس بال، تھرو بال، فٹ بال، ہینڈ بال، ہاکی، Chess۔

فیلڈ، ہاکی اسٹک کی جنس مشترک معلوم ہوتی ہے۔

۱۰۔ عمارتوں اور ان کے اجزا کے نام مذکر ہیں۔

ہاؤس، کوارٹر، فلیٹ، بنگلا Apartment، ہوٹل، ہوسٹل، فورٹ، گیٹ، کمپاؤنڈ، برآمدہ، کچن، اسٹور، باتھ روم، Floor، Terace، کمرا، ہال، گودام، گیسٹ ہاؤس، Palace، صرف دو الفاظ بالکونی اور گیلری مونث ہیں، کیوں کہ یہ 'ی' پر ختم ہوتے ہیں۔

۱۱۔ فرنیچر میں بیشتر الفاظ مونث ہیں۔

الماری، ٹیبل، Chair، شیلف، Safe۔

یہ الفاظ مذکر ہیں۔

ڈیسک، بنچ، Book Rack، کاؤنٹر، صوفہ۔

۱۲۔ بیماریوں میں بیشتر مذکر ہیں۔

انفلوئنزا، بلڈ پریشر، پولیو، ٹائفائڈ، ممپس، جانڈس، ڈائریا، سفلس، کالرا، کینسر، ہارٹ اٹیک، لیوکیمیا، ملیریا، نمونیا۔

میرا خیال ہے کہ Enceph ˊitis اور Conjuntivitis بھی مذکر بولے جاتے ہیں۔

ذیل کے امراض اپنے اردو مترادفات کی تانیث کے سبب مونث ہیں۔

آرتھرائٹس (گٹھیا)، اسمال پاکس (ماتا، چیچک)، پلیگ (طاعون)، ٹی بی (تپ دق) ڈائی سینٹری (پیچش)۔

میرا خیال ہے کہ سب سے موخر مرض Aids مونث ہے۔

۱۳۔ چوں کہ بیشتر علوم کے نام 'ی' پر ختم ہوتے ہیں اس لیے وہ مونث ہیں۔

آرکیالوجی، ایسٹرالوجی، ایسٹرانومی، بوٹنی، پامسٹری، جیالوجی، زوالوجی، سائیکالوجی، سوشالوجی، فائلالوجی، فلاسفی، کیمسٹری۔

ذیل کے تین علوم کے آخر میں 'ی' نہیں جمع کا لاحقہ 'س' ہے۔ یہ بھی مونث ہیں۔ پالکس، فزکس، Linguistics۔

لیکن ذیل کے تین علوم بدرنگ ہو کر مذکر ہو گئے ہیں۔

Arithematic, Mathmatics, Statistics

آخر الذکر کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ یہ مذکر ہے یا مونث!

۱۴۔ سائنسی ایجادات میں بہت بڑی تعداد مذکر ہے۔ بہتوں کا پیچھے ذکر آچکا ہے، چند نام ملاحظہ ہوں

اسپتنک، اسٹیتھس کوپ، ایٹم بم، ایکس رے، بائناکیولر، برتھ کنٹرول، تارپیڈو، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، Tank، راکیٹ، رڈار، ریڈیو، سینما، سیٹلیے لائٹ، فیملی پلاننگ، کارڈیوگرام، کیمرا، مائکراسکوپ Grenade وغیرہ۔

میرا خیال ہے کہ ٹیلسکوپ اردو لفظ دوربین کی تانیث کی وجہ سے مونث بولی جاتی ہے۔ ٹی۔وی اور الیکٹرسٹی آخری ای کی وجہ سے مونث ہیں۔ تھرمس فلاسک اپنے ترجمے میں بوتل کے اثر سے مونث ہے۔

اب زمرے کو چھوڑ کر لغات کو لیتے ہیں۔ چوں کہ فیروز اللغات میں فرہنگِ آصفیہ کے مقابلے میں انگریزی الفاظ زیادہ ہیں اس لیے پہلے اس کا جائزہ لیتا ہوں۔ اس میں ذیل کے الفاظ کو مونث لکھا ہے، میری رائے میں مذکر ہیں۔

آرز، Appointment، اسپرنگ، امریکن، انسٹیٹیوٹ، ایڈوانس، ایم۔او۔ایل، ایم۔ اے بارک (رشید احمد صدیقی کی بچی بارک کے باوجود میرے نزدیک بیرک مذکر ہے) بریک Brake، بالشیوزم، پارلیمنٹ، پالش، پروپوزل، پولو، ڈیڈیکیشن، رجسٹریشن، ریفرریشمنٹ، اسٹک، تھرڈ کلاس، Turn، ٹریفک، ٹمپر، ڈسپیچ، ڈسکارڈ، ڈکٹیشن، سیف (الماری) سیلف رسپکٹ، سکیل، سوشلزم، فرسٹ کلاس، فیڈریشن، Canvas، لفٹ، Liquidation، مارکیٹ، مانسون، نیشلزم، Hat۔

ذیل کے الفاظ کو مذکر لکھا ہے۔ میں انھیں مونث سمجھتا ہوں۔

اپیل، اسٹیج (مسعود حسن رضوی صاحب نے لکھنؤ کا شاہی اسٹیج لکھا ہے۔ میں مونث قرار دیتا ہوں)، اکسائز، ایمبولینس، بٹالین، بکرم، بگل، پوٹاش، پڈن (Pudding کی تخریب۔ پالش سے پہلے کا استر) پلیٹنم، پوسٹ، ٹریژری، ٹفن باکسٹ، ٹن (Tin) جرنل، جیالوجی، چاپ (Chop)، ڈریس، ڈسکاؤنٹ، ڈویژن، Sauce، ساورن (گنی)، فائل، فنانس، Funnel کارپوریشن، کلٹ، کسٹمر، کوآپریشن، میچ، میگزین، ورکشاپ، وسل (سیٹی) وی پی، بک میچ کے بارے میں مجھے تذبذب ہے۔ یہ مشترک جنس ہونی چاہیے۔

فیروز میں بہت سے الفاظ کی جنس نہیں دی۔ میرے نزدیک ان میں سے ذیل کے الفاظ مذکر ہیں۔

آرٹکل، اسپرٹ، اکزکٹو (افسر کے معنی میں)، الارم، ایٹ ہوم، انکیشن، ایڈورٹیزمنٹ، المونیم، بائیکاٹ، ٹانک، ٹینس، ٹیوب، ریڈیو، سیفٹی ریزر، سیکنڈ، سین، شوہارن، فراک، فرنٹ، کارٹون، کارنیوال، کالم، کوچ (Couch) میس، لائن کلیر، لیمپ۔

جن الفاظ کی جنس مذکور نہیں ان میں سے حسب ذیل مونث ہیں۔

آرتھوگرافی، آیوڈین، اکزکٹو (کونسل)، انڈین نیشنل کانگریس، ایجوکیشن، بال، پالکس، پرمٹ پریکٹس، پلان، ڈرائنگ، سائیکل، سپلائی، سیلون، فلالین، کونین، گراؤنڈ، ملٹری، ہیلتھ۔

گراس (گھاس)، ڈرائنگ، ٹیلیگرام، شو (جوتا)، کسریٹ، ان سب کو مذکر و مونث دونوں لکھا ہے۔ میری رائے میں پہلے دو مونث اور آخری تین مذکور ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں ان میں سے اکثر الفاظ نہیں۔ آصفیہ میں ذیل کے الفاظ کو مذکر لکھا ہے۔ میری رائے میں مونث ہیں۔

بگل، Boat، پارٹی، پتلون، پلٹس، Damage، ربڑ، سینٹ، فائل، گارڈ (گارڈ مذکر ہے لیکن اردو میں گارد ہو کر مونث ہو جاتا ہے)، میچ۔

ذیل کے الفاظ کو مونث لکھا ہے، میری رائے میں مذکر ہیں۔

اسپرٹ (اسپرٹ پی لیا مذکر، اس کی اسپرٹ کو نہیں سمجھے مونث) اکناج منٹ، انسٹی ٹیوشن، پارلیمنٹ، پالش، Cheque، ڈپو، کمپاس، کنسرینٹ، کوچ (Couch)۔

چوں کہ فیروز اللغات میں انگریزی الفاظ کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ میں نے اس سے قواعدی جنس والے الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی۔ فرہنگِ آصفیہ میں جو چند مزید الفاظ مل سکے انھیں شامل کیا۔ ان الفاظ کی جنس کو اپنے فیصلے کے مطابق درست کیا۔ اپنی طرف سے کچھ مزید الفاظ کا اضافہ کیا۔ اس فہرست سے ذیل کے دو طرح کے الفاظ خارج کر دیے۔

۱۔ جن کا اس مضمون میں پیچھے ذکر آ چکا ہے۔

۲۔ جو الفاظ عام استعمال کے نہیں یا جن کو شامل نہیں کیا جانا چاہیے مثلاً Aconite، Unknown (فیروز)، Bobbin (رنگین ڈوری، آصفیہ و فیروز دونوں میں)۔ بابن نٹ یا بابن لٹ (Baby-Lonic Net) ایک باریک جالی (فیروز آصفیہ دونوں)، پاتا کیری (Apothecary) دوا ساز (آصفیہ و فیروز دونوں)، جارج، جنیوا، سرف ڈم، سٹریٹ سیٹلمنٹ، شام پرتی (Champerty) یعنی وکیل کا اس شرط پر مقدمہ لینا کہ ڈگری کا کچھ حصہ اسے بھی ملے گا (آصفیہ و فیروز دونوں)، کاملیٹ (Camlet) اونٹ کی اون اور ریشم کا بنا کپڑا۔ (فیروز)

مذکر الفاظ

آڈٹ	اسٹرلنگ	الاسٹک	انجم ٹیکس
آرڈر	اسٹور	البم	اوپیرا
ارا روٹ (Arrow)	اسٹیل	الپکا	اوور ٹائم
روٹ (Root)	اسٹینڈرڈ	الفابیٹ	انجن
آرگن	اسکریو	امپائر	ایٹم
اسپتال	Escort	آملیٹ	ایٹی کیٹ

اسٹاپ	اسکول	انارکسٹ	ایڈریس
اسٹار	آفس	ایٹ ہوم	ایڈیٹوریل
اسٹاف	اکاؤنٹ	انجن	ایرپورٹ
اسٹاک	اکسائز	انڈنٹ	ایروڈوم
اسٹامپ	الارم	انڈیکس	ایسٹر
ایکٹ	بورڈ	پروف	تارپین
ایم۔اے	بورڈنگ ہاؤس	پروتار	ترپال
ایمونیا	بیج Badge	پستول	تمباکو
ایوارڈ	بیچ Batch	پکچر ہاؤس	تھیٹر
بائیکاٹ	بیرومیٹر	پلٹن	تھینکس
بپتسمہ	بیگ	پلیٹ فارم	ٹائپ
بٹن	بیلون	پمپ	ٹائٹل
براڈکاسٹ	بینڈ	پمفلیٹ	ٹائر
برتھ ڈے	بونڈ	پورٹ	ٹائم
برش	بینک	پورٹریٹ	ٹائم پیس
برگیڈ	پارٹ	پوسٹ آفس	ٹائم ٹیبل
بریک (Brake)	پارک	پول (Pole)	ٹاؤن
بک پوسٹ	پاس	پولیس	ٹب
بکس	پام (تاڑ)	پونڈ	ٹرسٹ
بل	پبلک ورکس	پیپرویٹ	ٹرنک
بلاٹنگ پیپر	پیٹرول	پیٹرن Pattern	ٹریڈ مارک
بلاک	پرامسری نوٹ	پنچ	ٹکٹ

بلاکیڈ	پراونس	پیڈ	ٹریڈ مارک
بلیڈ	پراوڈینٹ فنڈ	پیڈل	ٹکٹ
بلیک مارکیٹ	پرائز	پیراگراف	ٹن(Ton)
بمبو	پرس	پیک	ٹوسٹ
بنڈل	پروپیگنڈا	پیکٹ	ٹول(Tool)
بورژوا	پروسٹ	چین	ٹی۔اے
ٹی پاٹ	روبل	سوپ	فول
ٹیبل کلاتھ	رومان	سوئچ	کاپی رائٹ
ٹیکس	ریزرو	سوڈا	کاربن
جگ	ریسٹ	سیزن	کارتوس
جم خانہ	ریکارڈ	سیکنڈ	کارڈ
جیل	رم(Ream)	سیمنٹ	کارک
چارج۔چارج شیٹ	ریمارک	سیونگ بینک	کالج
چرچ	ریمینڈ	شلنگ	کالر
چیلنج	ریویو	Show	کافی ہاؤس
چیمبر	زار(Czar)	Share	کپ
ڈائجسٹ	سائز	فارسٹ	کٹ گلاس
ڈائل	سائن بورڈ	فارمولا	کراؤن
ڈائمنڈ	ساؤنڈ بکس	فائن (جرمانہ)	کرسس
ڈائنامائٹ	سبت(Sabbath)	فٹ نوٹ	کرفیو
ڈپلوما	Set	فرجFridge	کلاتھ
ڈراما	Sir	فرسٹ	کلب

ڈزائن	سرٹیفکیٹ	فرلانگ	کلنڈر
ڈسٹرکٹ	سرکل	فرنٹ	کلوروفارم
ڈیری فارم	سسٹم	فروٹ	کلومیٹر
ڈیمریج	سکریٹری	فریم	کمپاؤنڈ
رائٹ	سگنل	فلٹر	کنٹن جنٹ
رزلٹ	سمن	فنڈ	کوپن
ریسٹورینٹ	سن (Sun)	فوٹو	کوسٹل گارڈ (گارڈ)
کورٹ مارشل	لپ اسٹک	موڈل	وارنٹ
کورس	لوڈ (Load)	مون (Moon)	وارنش
کورم	لیبل	Map	وائرلیس
کیس	لیٹربکس	Mate	وکٹوریہ کراس
کیش	لیدر	میجک	ویل کم
کیمپ	لیمپ	میڈل	ہالی ڈے
گارڈن	لیمن۔ لیمونیڈ	میس	ہنی مون
گڈ فرائی ڈے	ماڈریٹ	Misa	ہارن
گریڈ	مارتول (پرتگالی)	میل (Mile)	ہوم
گزٹ	ماسٹرپیس	میموریل	ہیلی پیڈ
گلاس	مشن	نمبر	ہینڈل
گلوب	مڈل	No	یارڈ
گولڈ	مشن	نوٹ	Yes
گیس (مشترک جنس)	مگ	نوٹس	یونسکو

گیسٹ	ملی میٹر	واٹر	یونین جیک
Law	ممبر	واٹر پروف	
لاک (تالا)	منی آرڈر	وارڈ	

مونث الفاظ

ایمپی (کیس)	اسپیچ	اسٹیٹ	اسکرین
اسپرینو	اسٹاک ایکسچینج	اسکاچ (وسکی)	اسمبلی
اسٹیج	اسٹرائک	اسکرپٹ	آکسیجن
	اسٹریٹ	اسکیم	اکیڈمی
انڈین پینل کوڈ	Place	سائڈ	فسیٹ
انڈسٹری	پلان	سائن	فیکلٹی
انگلش	پٹرومیکس	سائنس	فیملی
Estate	پیراشوٹ	ساؤنڈ	Female
ایگری کلچر	پنسل	سروس	کاپی
امپائر	پنشن	سفرمینا (Sappers)	کاٹن
ایمرجنسی	ٹرے	Miners	کارنس
ایوننگ	Tandam ٹنڈم	سلیٹ	کافی
بائبل	ٹول Twill	سنڈیکیٹ	کامن ویلتھ
برانچ	ٹیکسٹ بک	سول لسٹ	کانگریس
بک	ٹیم	Seat	کرنسی
بوتل	جارجیٹ	سیفٹی	Curry
بوٹ	جمی	سیکیورٹی	کمپنی
بایوگرافی	Chain	سی۔آئی۔اے	کمشنری

پالیسی	ڈپازٹ	شاپ	کمیٹی
پبلک	ڈرل	شارک	کوکاکولا
پرابلم	رائفل	Shame	کوکو
پراپرٹی	رپبلک	فر	کونسل
پریکٹس	رجسٹری	فائر	کونین
Privacy	رفارم	فرلو	کیتلی
پرمٹ	روڈ	فرم	کیٹیلاگ
پلٹن	ریزیڈنسی	فلالین	کینڈل
پلیٹ	ریل (Reel)	فیس	گارنٹی
گڈ ایوننگ	لائٹ	مشین	واٹر سپلائی
گڈ بائی	لائن	میجک لینٹرن	واچ
گڈ مارننگ	لبرٹی	ماچس	War
گڈ نائٹ	لیبر	Maternity	واسکٹ
گرامر	لیجر	میرج	ویڈنگ
گرانٹ	Lace	میونٹی	Whale
گراؤنڈ	لیگ	میونسپلٹی	ہائڈروجن
گنی	Levy	نب	ہیلتھ
گیس (مشترک جنس)	مارننگ	نوٹ بک	یو۔این۔او
لالٹین	مارفیا	نیچر	یونین

چوں کہ اب ہم انگریزی کے بہت زیادہ الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں، تھوڑے سے غور کے بعد اس فہرست میں بہت اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا الفاظ کی جنس سے بہت سے قارئین و سامعین کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ بعض الفاظ کی جنس کے

بارے میں مجھے بھی بے یقینی ہے۔ وثوق سے کون کہہ سکتا ہے؟ آپ ان الفاظ کی جنس اپنے ذوق کے مطابق طے کریں۔ میں نے انتشار میں ایک باقاعدگی لانے کی پہلی نحیف کوشش کی ہے اور بس میرا عرض کیا ہوا کسی طرح مستند نہیں۔

(اکادمی لکھنؤ۔ جنوری فروری ۸۷ء

اردو کراچی۔ جنوری تا مارچ ۸۷ء

سب رس حیدرآباد، اپریل ۸۷ء)

حواشی

۱۔ میرے گھر میں دہی کو مونث اور میری بیوی مذکر بولتی ہیں کیوں کہ وہ سہارنپور کی ہیں۔ میری ہندوئیت مشکوک ہو سکتی ہے، ان کی نہیں۔

۲۔ عبدالماجد دریا بادی۔ "پریم چند بحیثیت افسانہ نگار" مشمولہ زمانہ پریم چند نمبر، ۱۹۳۷ء۔ باز طباعت۔ منشی پریم چند، شخصیت اور کارنامے، مرتب ڈاکٹر قمر رئیس (رام پور، ۱۹۶۲ء) ص ۱۹۸

۳۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک (کراچی، ۱۹۶۰ء) ص ۱۶۴

۴۔ ممتاز حسین "منشی پریم چند بحیثیت ناول نگار، مشمولہ منشی پریم چند، شخصیت اور کارنامے، ص ۲۵۵

☆

لسانیات کا ایک محسن ڈاکٹر سنتی کمار چٹر جی

علم زبان کے آسمان پر ۲۶ نومبر ۱۸۹۰ء کو جو سورج اگا وہ ۲۹ مئی ۷۷ء کو بکھر گیا۔ آج ہم اسی کی مقدس یاد تازہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے اس آقائے لسانیات کا نام ڈاکٹر سنتی کمار چٹر جی تھا جنھوں نے شب پور کلکتہ میں ایک علم دوست خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ دادا ایشور چندر چٹر جی متوفی ۱۹۰۶ء فارسی سے بھی واقف تھے۔ سنتی بابو ان سے گلستان اور چندنامے کے قصے سنا کرتے تھے۔ والد ہری داس چٹر جی ایک انگریزی فرم میں نوکر تھے اور بنگلہ کے اچھے شاعر اور موسیقار تھے۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ سنتی کمار کی ابتدائی تعلیم کلکتے کے موتی لال فری اسکول اور اسکاٹش چرچز کالج میں ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں انھوں نے فرسٹ کلاس میں بی۔اے آنرز کیا اور خاص مضمون انگریزی میں اول آئے۔ ۱۹۱۳ء میں انگریزی میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے کیا۔ اسی سال کلکتہ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ انگریزی شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۱۸ء میں ویدک سنسکرت کی ڈگری لی اور پریم چند رائے چند انعام اور کلکتہ یونیورسٹی کا جبلی ریسرچ انعام حاصل کیا۔

اسی سال وظیفہ حاصل کر کے لندن گئے جہاں ۱۹۲۰ء میں صوتیات کا ڈپلوما لیا اور ۱۹۲۱ء میں انڈو آرین فلالوجی پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ لندن میں انھوں نے لسانیات کے علاوہ پراکرت، ہند آریائی زبانیں، فارسی، قدیم انگریزی، قدیم آئرش اور گوتھک پڑھیں۔ ۲۲-۲۱ء میں پیرس یونیورسٹی میں لسانیات کا مزید درس لیا۔ یہاں سلاو (روسی)، آسٹرک ایشیاٹک لسانیات، قدیم کھوتانی، یونانی، لیٹن وغیرہ پڑھیں اور ڈاکٹر تاراپوروالا کے ساتھ قدیم

اوستائی پڑھی۔ یورپ سے واپس آ کر ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں آپ کلکتہ یونیورسٹی کے تقابلی لسانیات کے شعبے کے کھیرا پروفیسر ہو گئے، جہاں سنسکرت، پالی، جدید ہندوستانی زبانوں، فرانسیسی اور تاریخ تمدن اسلام کی تدریس بھی کی۔ ۱۹۵۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے پر لسانیات کے شعبے میں ایمرٹس پروفیسر ہو گئے۔ اسی سال گریجویٹوں کے حلقے سے بنگال لجسلیٹو کونسل کے رکن اور صدر ہو گئے اور تب سے مسلسل صدارت پر فائز رہے۔ ۱۹۵۷ء میں آپ کلکتہ یونیورسٹی کی فنون لطیفہ اور موسیقی کی فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔ مئی ۶۴ء میں حکومت کی طرف سے علوم انسانی میں نیشنل پروفیسر مقرر کیے گئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے قومی پروفیسر کو تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور وہ اپنے حسب منشا ریسرچ میں مشغول رہتا تھا۔ یہ اعزاز ملک میں دو ایک علماء ہی کو ملا ہے۔

ڈاکٹر سنتی کمار نے علمی مشاغل کے سلسلے میں متعدد بار دنیا کے بیشتر ممالک کا دورہ کیا ہے۔ کبھی وہ کہیں لکچر دینے جا رہے ہیں، کہیں کسی وفد یا کانفرنس میں شریک ہو رہے ہیں، کہیں حکومت کی طرف سے، کہیں بین الاقوامی انجمنوں کی طرف سے۔ یورپ کے ممالک، روس، امریکہ اور چین تو وہ دسیوں بار گئے۔ ان کے علاوہ ذیل کے ممالک کی سیاحت بھی کر چکے ہیں۔

ملیشیا اور انڈونیشیا کے ممالک۔ مغربی افریقہ بشمول نائجیریا، لائبیریا، منگولیا، تھائی لینڈ، ایران، ہوائی جزیرہ، جاپان، فلپائن۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۴ء تک انھوں نے اٹھارہ بڑے بین الاقوامی سفر کیے ہیں اور ہر سفر میں کئی ملکوں میں گئے۔

ان میں سے کوئی سفر محض تفریح کے لیے نہیں تھا بلکہ ہر ایک میں علم کی نشر و اشاعت کی۔ اپنے بیرونی اور اندرونی سفروں میں وہ ایک دیو قد رئیس لسانیات کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ برلن کے مشرقی انسٹی ٹیوٹ اور گجرات سبھا کے پوسٹ گریجویٹ و ریسرچ شعبے میں دیے گئے خطبات سب سے اہم ہیں۔ انھوں نے آسام میں "ہندوستانی تمدن میں منگولیاں کی دین" پر عالمانہ لکچر دیے۔ امریکہ کی پین سلوینیا یونیورسٹی کے جنوبی مشرقی مطالعے کے اسکولوں میں

آپ ایک سال وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے لیکچر دیا کیے۔ ۱۹۵۱ء سے آپ ہندوستان میں لسانیات کے موسم گرما اسکولوں میں بھی شرکت کرتے تھے جس کے طفیل ۱۹۶۱ء میں اس ہیچ میرز و ہیچ مداں کو آپ کی شاگردی کا شرف ہوا۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں لسانیات کے اسکول میں بحیثیت طالب علم درس لیا۔ وہاں آپ نے ایک مہینے تک ہند آریائی لسانیات پڑھائی۔ کئی بار شام کو ان کا توسیعی لیکچر ہوتا تھا۔ مجھے ان خطبات سے استفاضے کا بھی فخر ہے۔

ان کی غیر معمولی خدمات کے سبب انھیں گاڑی بھر اعزاز، انعام، خطاب وغیرہ ملے۔ ان کی تفصیل پیش کروں تو بھور ہو جائے گی۔

ع سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

چند کے بارے میں سنیے:

آپ ان بیرونی سوسائٹیوں کے اعزازی رکن منتخب ہوئے۔

اورینٹل انسٹی ٹیوٹ پولینڈ ۱۹۳۹ء۔ ایشیاٹک سوسائٹی پیرس ۴۶ء اورینٹل سوسائٹی امریکہ ۴۷ء۔ اورینٹل سوسائٹی ویٹ نام ۴۹ء، اکادمی آف آرٹ اینڈ سائنس ہالینڈ ۵۰ء۔ اکادمی آف سائنس ناروے ۵۴ء۔ سیام سوسائٹی تھائی لینڈ ۵۷ء۔ لسانیاتی سوسائٹی امریکہ ۵۸ء۔

رکنیت سے بڑے اعزاز یہ ہیں:

رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ۳۶ء میں فیلو اور ۵۳ء میں صدر چنے گئے۔ ۴۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن الٰہ آباد نے انھیں ساہتیہ واچسپتی کا اعزازی خطاب دیا۔ ۵۵ء میں انھیں پدم بھوشن اور ۶۳ء میں پدم وبھوشن کا خطاب ملا۔ ۵۶-۵۵ء میں آپ حکومتِ ہند کے سرکاری زبان کمیشن کے رکن مقرر ہوئے جہاں آپ نے ہندی کے خلاف ایک معرکے کا اختلافی نوٹ درج کرایا۔ ۵۷-۵۶ء میں حکومتِ ہند نے انھیں سنسکرت کمیشن کا صدر مقرر کیا۔ ۵۸ء میں انھیں ناگری پرچارنی سبھا نے رتنا کر انعام اور حکومتِ مغربی بنگال نے ٹیگور انعام دیا۔ مارچ ۶۱ء میں روم یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ ادھر کئی سال تک آپ ساہتیہ

اکادمی کے صدر بھی رہے۔

آپ کے خطبات بالخصوص افتتاحی خطبات کسی تحقیقی مقالے سے کم نہیں ہوتے۔ ان کے علاوہ آپ کی مستقل تصانیف کی تعداد بھی کثیر ہے۔ کچھ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں آپ کی سب سے وقیع اور سب سے عالمانہ کتاب Origin and Development of Bengali Language شائع ہوئی۔ یہ ۱۱۷۹ صفحات کی دو جلدوں کو محیط ہے۔ اسے ہندوستانی زبانوں کی قاموس کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں بنگالی کے علاوہ پوری ہند آریائی پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب نے انھیں لسانیات کی چوٹی پر متمکن کر دیا ہے۔ ۲۷ء میں لندن سے 'خود سیکھو سلسلے' کے تحت بنگالی پر ان کی کتاب شائع ہوئی۔ گجرات ودیا سبھا احمد آباد میں دیے ہوئے ان کے عالمانہ خطبات کتابی شکل میں (Indo-Aryan and Hindi) کے نام سے ۴۲ء میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ ۵۴ء میں آیا۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی نے کیا ہے۔ جو حال ہی میں ترقی اردو بورڈ سے شائع ہوا۔

۴۳ء میں انھوں نے Language And Linguistic Problem اور اس کے بعد مدراس سے Languages Of India شائع کی۔ راجستھان وشوودیا پیٹھ اودے پور میں دیے گئے خطبات ۱۹۴۹ء میں راجستھان کے نام سے چھپے۔ ۱۹۵۴ء آسام اینڈ انڈیا نامی کتاب نکلی۔ ۵۷ء میں آپ نے انا ملائی یونیورسٹی میں دراوڑی لسانیات کے شعبے کا افتتاح کیا۔ اس کا عالمانہ خطبہ ۵۶ء میں Dravidian کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں کلکتے سے ضخیم کتاب Languages And Literatures Of Modem India شائع کی۔ ۶۸ء میں Balts And Aryans اور ۶۹ء میں India And Ethopia نکلیں۔ انھوں نے کئی قدیم ادبی کتابوں کا لسانی مطالعہ بھی کیا۔

ڈاکٹر چٹرجی کی تصانیف لسانیات تک محدود نہیں۔ انھوں نے سفرناموں کے علاوہ ادبی تنقید اور تہذیب اقوام پر بھی مستقل تصانیف کی ہیں۔ آخر الذکر میں دو کتابیں "قوم، تہذیب اور ادب" اور "ہندوستانی تمدن" قابلِ ذکر ہیں۔

رسالوں میں شائع شدہ آپ کے لسانیاتی مضامین کی تعداد اڑھائی سو ہے۔ ہندی میں کچھ مضامین کا مجموعہ تسجرا کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں ان کی ایک کتاب 'بکھرے ورق' ۶۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے ان کی تین بنگلہ کتابوں سے مضامین کا انتخاب کیا اور انھیں اردو میں منتقل کر دیا۔ مضامین کے اس مجموعے کے دیباچے میں ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر چٹرجی عربی، فارسی اور اردو کے ادب سے سرسری طور پر آگاہ ہیں۔ انھوں نے ان زبانوں کے ادبوں کا مطالعہ فارسی رسم الخط میں بہت کم کیا ہے، زیادہ تر انگریزی کی مدد ہی سے رسائی کی ہے۔ انھیں اردو پڑھنے کا ربط نہیں ہے۔ لیکن اس مجموعے میں ان کا ایک مضمون 'کابلی والے ہم سفر' شامل ہے۔ اس میں انھوں نے سرحد کے ایک پٹھان سے فارسی میں گفتگو کی اور اس قسم کے جملے ادا کیے۔

اند کے جائے بدہ برائے یک آدمی۔

از چہ طرف افغانستان می آئی کہ در زبانِ فارسی گفتگو کردن طاقتِ شما نیست۔

ڈاکٹر چٹرجی نے اس مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ انھیں ٹوٹی پھوٹی فارسی ہی آتی تھی۔ لیکن اگر وہ مندرجہ بالا جملے بول سکتے ہیں تو یہ بھی بساغنیمت ہے۔ میں نے ساگر کے لسانیات اسکول میں ان سے ان کے مستقر پر نیاز حاصل کیا۔ وہاں دورانِ گفتگو انھوں نے عربی کی مخصوص آوازوں مثلاً ذ اور ض وغیرہ کو ان کے مبینہ اصل عربی مخرج سے ادا کر کے دکھایا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ تلفظ واقعی صحیح مخرج کے مطابق تھا کہ نہیں۔ محترم استاد سے میری دوسری ملاقات ۷۳ء میں کلکتے میں ہوئی۔ جب میں گجرال کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے وہاں گیا۔ انھوں نے کمیٹی کے سامنے شہادت دی۔ ان کی شہادت کے بعد کمیٹی سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔

ڈاکٹر چٹرجی بنیادی حیثیت سے تاریخی لسانیات کے عالم ہیں۔ وہ ہند آریائی لسانیات کے دو جید معلمانِ اول و ثانی ہارنلے اور گریرسن کے نظریات کو چیلنج کرتے ہیں اور ان میں اصلاح کرتے ہیں۔ میں صرف دو مثالیں دوں گا۔

ہارنلے اور گریرسن دونوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آریہ ہندوستان میں دو گروہوں میں آئے۔ ایک گروہ بیچ میں بس گیا۔ دوسرا اطراف میں۔ اس مفروضے کی بنا پر ان علماء نے ہند آریائی زبانوں کو اندرونی اور بیرونی میں تقسیم کیا۔ ڈاکٹر چٹرجی نے اندرونی اور بیرونی کے نظریے کو رد کر کے اس کی شافی تردید کی۔ اسی کے ساتھ ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی ختمی ہے۔ گریرسن نے انھیں اندرونی، بیرونی اور مدھیہ دیش میں تقسیم کیا۔ چٹرجی نے اس میں ترمیم کر کے پانچ گروہ قائم کیے جو زیادہ قابلِ قبول ہیں۔

اردو والے ڈاکٹر چٹرجی کی تصانیف میں انڈو آرین اینڈ ہندی سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔ عتیق صدیقی کے ترجمے سے بہت پہلے سے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کتاب میں انھوں نے اردو کی سخت مخالفت کی ہے لیکن آزادی کے بعد جب ہندی کو قومی زبان تسلیم کیا گیا تو وہ ہندی کے کٹر مخالف ہو گئے جس کا ثبوت سرکاری زبان کمیشن رپورٹ میں ان کا پرزور اختلافی نوٹ ہے۔ گجرال کمیٹی کے سامنے وہ اردو کے متعلق کم اور ہندی کے خلاف زیادہ بولے۔ فرمایا کہ ہندی پر سرکار جو کروڑوں روپیہ خرچ کر رہی ہے وہ سب ضائع ہو رہا ہے۔ ہندی کو سرکاری زبان کی گدی سے ہٹا کر غیر معینہ مدت کے لیے انگریزی کو یہ مقام دے دیا جائے۔

اردو کے بارے میں اب ان کا نظریہ زیادہ انصاف پر مبنی ہے۔ سرکاری زبان کمیشن والے نوٹ میں کہتے ہیں:

> ''کھڑی بولی کے بارے میں عجیب بات یہ ہے کہ جو اسے وراثت کے طور پر گھر کی زبان کے طور پر بولتے ہیں وہ پچھلے ڈھائی سو برس سے فارسی عربی الفاظ کو صریحاً ترجیح دیتے ہیں۔''

دوسری جگہ کہتے ہیں:

> ''اپنے عربی فارسی الفاظ کے بڑے تناسب کے باوجود یو۔ پی میں اردو دھرتی سے زیادہ نزدیک ہے۔''

انگریزی کتاب "نئے ہندوستان کی زبانیں اور ادبیات" میں اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "دراصل قواعد، محاورے اور ڈکشن کے معاملے میں اردو کے طریق استعمال بارہا موجودہ ادبی ہندی کے لیے رہبر یا نمونے کا کام دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر چٹرجی جیسا عالم صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ آج ان کی پہلی برسی کے دن میں لسانیات کے اس عظیم محسن، ہندوستان کے اس عظیم سپوت اور اپنے عظیم استاد کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

(ذکر وفکر)

☆

ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات

ڈاکٹر زور، ماہر لسانیات، نقاد، مورخ، سوانح نگار، مرتب، مدیر بھی کچھ تھے اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان کی جولانیاں محض صفحۂ قرطاس تک محدود نہ تھیں۔ وہ میدانِ عمل کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی ذات ہزار شیوہ ایک ادارہ تھی جس نے بہت سے ادارے بنائے۔

ایک بار میں نے بھوپال کے اسٹیشن پر ڈاکٹر زور سے پوچھا کہ آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کس کتاب پر ملی تھی انھوں نے کہا کہ ہندوستانی صوتیات اور اردو شہ پارے پر۔ چوں کہ ڈاکٹر زور کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں مل چکی تھی اور یہ کتابیں اس کے بعد مرتب ہوئیں اس سے ظاہر ہے کہ ان کا تحقیقی مقالہ ان کتابوں کے نقشِ اول کا مرقع ہوگا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لسانیات کے باب میں اردو ہندی سے ۲۵ سال پیچھے ہے یعنی آزادی کے بعد اردو کی دکانِ لسانیات میں جو متاعِ فخر دکھائی دیتی ہے وہ ہندی میں کم از کم ۲۵ سال پہلے وجود میں آچکی تھی۔ لیکن ڈاکٹر زور نے صوتیات پر جس وقت کام کیا اس وقت تک ہندی کے موجودہ علماء میں سے کسی نے لسانیات پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ بابو شیام سندر داس اس کی بھاشا وگیان ۱۹۲۸ء تک ہندی لسانیات کی کل کائنات تھی۔ ڈاکٹر زور لسانیات کی دنیا میں بڑی گھن گرج سے آئے۔ وہ نہ صرف اردو میں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں علم زبان کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس انھوں نے اپنے شوق کو جاری نہ رکھا۔ ۱۹۲۹ء میں لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد وہ ڈی۔ لٹ کے لیے پیرس پہنچے

اور پروفیسر جیولز بلاک کی رہنمائی میں گجراتی فارم آف ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسے پورا نہ کیا۔ اگر مرحوم لسانیات سے دلچسپی لیتے رہتے تو ملک کے بڑے ماہرین لسانیات میں شمار کیے جاتے۔ لسانیات کے سلسلے میں ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ Hindustani Phonetics ۱۶ صفحات کا یہ انگریزی کتابچہ ۱۹۳۰ء میں پیرس سے شائع ہوا۔

۲۔ ہندوستانی لسانیات ۱۹۳۳ء

ان کے علاوہ دو مضامین میری نظر سے گزرے "اردو اور پنجابی" یہ مضمون نقوش لاہور میں غالباً پہلی بار ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ یہی نقوش کے ادب عالیہ نمبر بابت اپریل ۱۹۶۰ء میں شامل کیا گیا۔

۳۔ 'اردو کی ابتدا' یہ مضمون دلی یونیورسٹی کے رسالے "اردوئے معلیٰ" کے لسانیات نمبر جلد سوم شمارہ ۴۔۵ بابت ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

ان کی کتاب ہندوستانی لسانیات اور ان کے اردو مضامین سے قارئین اردو متعارف ہیں۔ ان تحریروں میں اردو کی ابتدا سے متعلق جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس سے اختلاف بھی کیا گیا ہے لیکن لسانیات میں ان کا اصل کارنامہ ہندوستانی فونٹکس ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کا اردو ترجمہ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اردو دنیا اس کے نام سے بھی روشناس نہیں حالانکہ ڈاکٹر زور کو لسانیات کی تاریخ میں کوئی مقام دیا جائے گا تو اسی کی بدولت۔

ڈاکٹر زور کی لسانی تحقیقات پر تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں لسانیات، بالخصوص صوتیات کا علم زمین سے آسمان تک پہنچ چکا ہے۔ آج ہمیں ڈاکٹر زور کی تحریروں میں سقم نظر آتے ہیں لیکن ۱۹۳۰ء میں یہی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ ذیل میں ان کے کارناموں کا سرسری تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی فونٹکس (انگریزی میں)۔ اردو دنیا ڈاکٹر زور کو تاریخی و تقابلی لسانیات کے

ماہر کی حیثیت سے جانی ہے لیکن ان کا زیادہ اہم کام صوتیات کے ضمن میں ہے۔ لندن اور پیرس کی تجربہ گاہوں میں ڈاکٹر زور نے آوازوں کا جو تجزیہ کیا، ہندوستانی صوتیات اسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں علم زبان کے وہ موتی بھرے ہیں کہ جب بھی اس کی سیر کی جائے کوئی نہ کوئی گوہر غلطاں ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔

تمہیدی باب میں مصنف نے اردو کے آغاز کے بارے میں اپنا مشہور نظریہ پیش کیا ہے کہ بارھویں صدی سے قبل صوبۂ سرحد سے الٰہ آباد تک ایک زبان بولی جاتی تھی۔ بارھویں صدی کے بعد زبانوں کا اختلاف شروع ہوا۔ پنجاب میں پنجابی بن گئی۔ یو پی میں کھڑی بولی۔ اردو نہ پنجابی سے مشتق ہے نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس نے ان دونوں کے مشترک ماخذ سے تشکیل پائی ہے۔ میں اس نظریے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کیوں کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اسے اچھی طرح پرکھ چکے ہیں۔ اس باب کے دوسرے جزو میں زور صاحب نے شمالی اور دکنی اردو کے اختلافات بڑی وضاحت اور تفصیل سے پیش کیے۔ اس سے پہلے کسی نے دکن کی خصوصیات کے بارے میں شاید ہی لکھا ہو۔ زور صاحب نے دانائے راز کی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے پہلے صوتیاتی اختلافات کی شرح کی ہے بعد میں صرف ونحو کی۔ یہ سب ڈاکٹر زور کے اپنے مشاہدے اور غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ آئندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لیے ان کی یہ تحریر مشعلِ راہ ہے۔

دوسرے اور تیسرے باب میں اردو کی اصوات میں ایک ایک کو لے کر اس کا تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں ۹ مصوتے اور ۶ جڑواں مصوتے (Diphthong) قرار دیے ہیں جس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ مصمتوں میں انھوں نے نھ۔ لھ۔ رھ۔ ڑھ۔ دھ۔ زھ کو بھی شامل کیا ہے۔ حالاں کہ ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی اردو یا ہندی عالم نے ان آوازوں کو مفرد تسلیم نہیں کیا لیکن ہندی (ہندی لفظ) کو اردو مصمتوں میں جگہ دے کر انھوں نے حقیقت نگری کا ثبوت دیا ہے۔ پھر مختلف ماحولوں میں اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی شرح کی۔

ہے۔ مزید وضاحت کے لیے کم از کم ہر آواز کا ایک (Palatograme) دیا ہے (پیلیٹو گرام تالو کے اس نقشے کو کہتے ہیں جس سے یہ واضح ہو سکے کہ کسی خاص آواز کو ادا کرتے وقت زبان تالو کے کس حصے کو چھوتی ہے) اس کے علاوہ بعض آوازوں کے نازک اختلافات کو کائموگراف سے بنی ہوئی لکیر کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو کی ایک ایک آواز کو لے کر اس کا تجزیہ پیش کرنا ڈاکٹر زور کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر تا حال اردو اور ہندی کی کسی کتاب میں نہیں ملی۔ گولوگ بہاری ڈھل کی ہندی کتاب 'دھونی وگیان' میں انگریزی آوازوں کا اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے، ہندی آوازوں کا نہیں۔ اس میں پیلیٹو گرام دیے ہیں لیکن کائموگراف کے چارٹ نہیں دیے۔

مصمتوں کے تجزیے میں ڈاکٹر زور نے کس باریک بینی اور عمق نظر کا ثبوت دیا ہے وہ چند مثالوں سے واضح ہوگا۔

۱۔ لفظ کے آخری (ب) کے بعد ہم عموماً ایک نہایت خفیف مصوتہ بھی بولتے ہیں۔ ثبوت میں دو الفاظ 'تب' اور 'ڈھب' کا کائموگرافی خط درج کیا ہے جس میں ب کے بعد ایک خفیف مصوتہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ لفظ کا ابتدائی 'ت' درمیانی یا (آخری ت) کی نسبت زیادہ وضاحت سے ادا ہوتا ہے۔

۳۔ درمیانی (تھ) اور (دھ) میں ابتدائی (تھ) اور (دھ) کی نسبت تنفیس یعنی ہکاریت کم ہوتی ہے۔

۴۔ درمیانی (ٹ) ابتدائی (ٹ) کی نسبت شدت سے ادا ہوتی ہے۔

۵۔ لفظ کے درمیان (ٹھ) کے بعد کوئی غیر مصمتی اگھوش آئے تو (ٹھ) (ٹ) کی آواز دیتا ہے مثلاً بیٹھنا اور کٹھ پتلی میں۔

۶۔ لفظ کا آخری (چ) نہایت خفیف ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ یہ پادر ہوا دعوی نہیں۔ ان سب کو پیلیٹو

گراف یا کائموگراف کے نقشوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

آوازوں کے تجزیے کے بعد ڈاکٹر زور نے مرکب الفاظ کی ان آوازوں کی تفصیل درج کی ہے جو متعاقب آواز کے اثر سے کسی حد تک بدل جاتی ہیں مثلاً "چپ بیٹھو" میں (پ) کی آواز (ب) سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ 'کتبہ' میں (ت) کی آواز (د) جیسی۔ 'پیچ دار' میں (چ) کی آواز (ج) کے مانند اور 'بات چیت' میں (ت) کی آواز (چ) سے مماثل ہو جاتی ہے۔ اصولوں اور مثالوں کی کثرت ان کے مشاہدے کی وسعت اور ہمہ گیری کی غماز ہے۔

چوتھے باب میں بل اور سُر لہر سے بحث کی ہے۔ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے آج بھی قلم کو لرزش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو زبان میں بل اور سر لہر کی تعیین جس وقت کی اس وقت تک کسی ماہر لسانیات نے اردو یا ہندی کے اس پہلو پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے ڈاکٹر زور کے اصول غنیمت ہیں۔ انھوں نے دو رکنی اور سہ رکنی الفاظ کے بل کو بڑی حد تک صحیح طور پر گرفت کر لیا۔ چنانچہ ان سے ۴۳ سال بعد لکھتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے انگریزی کتابچے میں ان کی تائید کی۔ زور صاحب کے اصولوں سے کہیں کہیں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ترقی کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں کیا لیکن ۱۹۲۷ء، ۱۹۲۸ء کا زمانہ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر زور کے اجتہاد کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس باب کے دوسرے جزو میں اردو کلام کی سر لہر کی تشریح ہے اس موضوع پر ابھی تک کوئی دوسرا کام سامنے نہیں آیا۔

غرضکہ یہ رسالہ کوزے میں دریا سما دینے کی اچھی مثال ہے۔ اس میں محض اصول و نکات ہیں۔ حشویات یا اطناب کا نام نہیں۔ آج اردو صوتیات کے کسی بھی مسئلے پر لکھنا ہو، ہندوستانی فونیٹکس کی ورق گردانی ناگزیر ہے کیوں کہ جویائے علم کے لیے یہ رسالہ

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

کی مثال ہے۔

ہندوستانی لسانیات، میں ڈاکٹر زور نے ان موضوعات پر لکھا جو نہ صرف اس زمانے میں بلکہ اس کے بہت بعد تک اردو میں نئے تھے مثلاً زبانوں کی صوتی تبدیلی اور اس کے اسباب، دنیا کی زبانوں کے خاندان، ہند آریائی کی گروہ بندی وغیرہ۔ صوتی تبدیلی کا بیان آج کی معلومات کے لحاظ سے تشنہ ہے لیکن ہند آریائی کی تفصیلات آج بھی بیشتر صحیح ہیں۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں ہندوستانی کے آغاز اور ارتقا سے بحث کی ہے جس کا مرکزی حصہ ان کے اپنے نظریے کی تشریح ہے۔ اسے سب سے پہلے وہ اپنی انگریزی کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔

اس حصے کا ایک عالمانہ باب "ادبی بولیاں، گجراتی۔ دکنی۔ شمالی" اس میں ڈاکٹر زور کے ڈی۔ لٹ کے نامکمل کام "گجراتی اردو" کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آج کے اہل قلم میں کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دکنی اور گجری مختلف بولیاں ہیں۔ انھیں ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے لیکن زور صاحب نے دونوں بولیوں کے چار اختلافات پیش کیے اور اس طرح دکنی کو گجری سے ممیّز کیا۔ اگر وہ اس کام کو جاری رکھتے تو اس بولی کا مکمل نقشہ سامنے آ جاتا۔ دکنی اور گجری میں فرق کرنے کے بعد ڈاکٹر زور نے دکنی اور شمالی اردو کے اختلافات کا مجمل بیان کیا ہے۔ یہ وہی ہیں جو انگریزی رسالے میں تفصیل سے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اپنے دو مضامین میں ڈاکٹر زور نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی۔ اردو سے متعلق اپنے نظریے کا اعادہ کیا ہے۔ ۲۸ء کے بعد اردو اور ہندی کی تاریخی تحقیق بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن زور صاحب کو اپنے نظریے کی صحت پر یہاں تک اعتماد تھا کہ وہ بعد کی تحقیقات کی روشنی میں ترمیم کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر زور کی لسانیاتی کا صحیح اور منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نہ عقیدت کے جوش میں ہیرو پرستی کی گئی ہے نہ ۱۹۶۳ء کی عینک سے دیکھ کر خواہ مخواہ خوردہ گیری کی گئی ہے۔ اس جائزے سے روشن ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی طبیعت تاریخی لسانیات سے زیادہ تجزیاتی لسانیات بالخصوص صوتیات سے مناسبت رکھتی تھی۔ وہ ہمارے ملک کے ابتدائی

علمائے صوتیات میں سے تھے۔ اگر وہ لسانیات سے قطع تعلق نہ کر لیتے بلکہ خود بھی پڑھتے لکھتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے لکھنے پر مائل کرتے تو اردو زبان اس صنف میں اتنی پچھڑی نہ ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش ہوتی۔

(۱) سب رس حیدرآباد (زور نمبر) اکتوبر تا دسمبر ۶۲ء (۲) لسانی مطالعے

☆

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بحیثیتِ ماہر لسانیات

دس بارہ سال پہلے شمالی ہند میں کسی مقام پر لسانیات کے شعبوں کے اساتذہ کا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں شدت سے شکایت کی گئی تھی کہ ملک میں ادب کے شعبوں کے اساتذہ بالخصوص ہندی والوں، نے لسانیات کو خراب کر رکھا ہے۔ ان لوگوں کو تھوڑی سی فرسودہ لسانیات آتی ہے اور یہ اس کم مائگی کے باوجود لسانیات کی کتابیں لکھتے ہیں اور اس میں تحقیق کراتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہندی میں یہ وبا بے طرح پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں جس شٹ پونجیے کو دیکھیے ریسرچ اسکالروں سے لسانیاتی موضوعات پر کام کرا رہا ہے۔ راقم الحروف نے اپنے محدود علم کے پیشِ نظر کبھی کسی ریسرچ اسکالر کو لسانیات کا موضوع نہیں دیا۔

اردو ادب کے شعبوں میں جو حضرات لسانیات دانی کے مدعی ہیں ان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سابقہ عبارت کی تعریض سے مستثنیٰ ہیں۔ انھوں نے امریکہ میں واقعی لسانیات کا درس لیا یہاں تک کہ صوتیات کی لیبارٹری میں کھوج کی، آوازوں کے نقشے کھینچے۔ امریکی اساتذہ کے اشتراک سے مضامین لکھے جن میں سے ایک مشہور عالم لسانیاتی جریدے Language میں شائع ہوا۔ وہ ایک مانے ہوئے نقاد ہیں اس لیے سستی شہرت کی تلاش میں لسانیات کے کوچے میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اب انھوں نے لسانیات میں اسلوبیات کو چن لیا ہے اور اس کے اصولوں کے تحت اردو ادیبوں کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ نارنگ کی لسانیاتی تحریروں کی تعداد کافی ہے جن میں سے ایک کتاب اور کچھ مضامین انگریزی میں بھی ہیں۔ جو مضامین ادبی تنقید سے متعلق ہوتے ہیں ان میں بھی لسانیاتی نقطۂ نظر آ جاتا ہے۔ میں انھیں چھوڑ کر صرف

ایسی تحریروں کو لے رہا ہوں جو خالص لسانیاتی یا اسلوبیاتی ہیں۔ان میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) عام لسانیاتی تحریریں:

۱۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (کتابچہ) دلی جولائی ۱۹۶۱ء

۲۔ اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت نقوش ستمبر ۱۹۶۷

۳۔ کربل کتھا کا لسانیاتی جائزہ رسالہ اردو کراچی۔اپریل ۱۹۶۸ء

۴۔ کیفی لسانی خدمات منشورات کیفی کا مقدمہ ۱۹۶۸ء

۵۔ احتشام صاحب کی لسانی خدمات۔شب خون الہ آباد اگست تا ستمبر ۱۹۷۷ء

۶۔ اردو ہماری اردو دوسری غیر مسلم اردو کانفرنس اپریل ۱۹۸۱ء کا خطبہ صدارت

(۲) تقابلی لسانیات:

۷۔ اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک رسالہ ہندوستانی زبان بمبئی۔جنوری تا اپریل ۱۹۷۳ء

۸۔ اردو اور ہندی کا رشتہ نذر زیدی ۱۹۸۰ء

(۳) زبان اور بولی:

9- Karhandari Dialect Of Delhi Urdu, Delhi 1961.

(۴) صوتیات:

۱۰۔ اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی نذر ذاکر ۱۹۶۸ء

۱۱۔ اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی ارمغان مالک ۱۹۷۱ء

12-Aspiration and Nasalization in the Generative Phonology Of Hindi Urdu By Narang And Becker, Language, Sep 1971, U.S.A.

13-Generative Phonology And The Retrofflex Flaps Of Hindi-Urdu, General Linguistics Vol 14, No 3, 1974, Pennsylvania State University Press, U.S.A.

(۵) صرف:

۱۴۔ اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر   انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے مجموعے مقالات ۱۹۶۷ء میں

(۶) معنیات:

۱۵۔ اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ   نذر عابد

(۷) تحریر:

۱۶۔ ہمزہ کیوں   ہماری زبان علی گڑھ یکم، ۸ اور ۱۵ مئی ۱۹۶۷ء نیز لسانیاتی تحقیق، ۱۹۷۱ء

۱۷۔ اردو رسم الخط، تہذیبی اور لسانیاتی مطالعہ   رسالہ جامعہ دہلی۔ اپریل مئی ۱۹۷۲ء

(۸) اسلوبیات:

۱۸۔ ذاکر صاحب کی نثر، اردو کے بنیادی اسلوب کی ایک مثال   اردو ادب شمارہ، ۱۹۷۰ء

۱۹۔ اسلوبیات انیس   آج کل فروری ۱۹۸۱ء (تصنیف ۱۹۷۶ء)

۲۰۔ اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام   نقوش اقبال نمبر ۲ دسمبر ۱۹۷۷ء

۲۱۔ اسلوبیات اقبال   اقبال کا فن ۱۹۸۳ء

۲۲۔ اسلوبیات میر   آج کل میر نمبر مارچ ۱۹۸۳ء (تصنیف مارچ ۸۳ء)

بعد میں یہ پوری کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق یادگاری لکچر کے طور پر کراچی سے ۱۹۸۴ء میں اور دہلی سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔

ان تحریروں کا تعارف پیش کرنے سے پہلے میں اعتراف کرتا ہوں کہ لسانیات میں میرا مبلغ علم محدود ہے۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں ساگر کے لسانیات کے گرمائی اسکول میں بنیادی کورس کا درس لیا اور ۱۹۶۲ء میں دھارواڑ کے گرمائی اسکول میں لسانیات کے اگلے کورس کا سرٹیفکیٹ لیا۔ مندرجہ بالا تحریروں کا تعارف پیش کرتا ہوں لیکن صوتیاتی اور اسلوبیاتی تحریروں کا گہرائی سے جائزہ نہیں لے سکتا۔

(ا) عام لسانیاتی تحریریں:

۱۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو آزاد کتاب گھر، کلاں محل دلی۔ جولائی ۱۹۶۱ء

اس پر تاریخ اشاعت جولائی ۶۱ء درج ہے لیکن مصنف نے مجھے اس کی ایک کاپی ۳۔ اپریل ۶۲ء کو پیش کی جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دراصل ۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کتابچے کا متن ۴۱ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ہے جو اس کی افادیت کے پیش نظر بہت ارزاں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ روایتی طریقۂ تعلیم زبان بالکل فرسودہ ہے۔ اس سے اہل زبان کی طرح زبان بولنی نہیں آتی۔ کوئی نئی زبان سیکھنی ہو تو اس کا ذخیرۂ الفاظ جاننا ہی کافی نہیں، اس کا صوتیاتی اور صرفی ونحوی نظام بھی جاننا چاہیے۔ اس ضرورت کے پیش نظر مصنف نے اردو زبان کی صوتیات کا مفصل بیان کیا ہے۔

آگے بتایا گیا ہے کہ زبانوں کے سیکھنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں، لسانیاتی طریق کار اور ڈائرکٹ طریق کار۔ آخر الذکر میں اس فطری عمل کی نقل کی جاتی ہے جس پر چل کر بچہ اپنی مادری زبان سیکھتا ہے۔ اس طریق میں مادری زبان استعمال اور ترجمے دونوں ممنوع ہیں۔ روایتی گرامر بھی نہیں پڑھائی جاتی۔ اشیا کے معنی تصویروں، ماڈل اور حرکات وغیرہ سے سمجھائے

جاتے ہیں۔ لسانیاتی طریق کار میں سماعی اور تقریری مشینوں سے زبان کی امتیازی آوازوں کی مشق کرائی جاتی ہے اور پھر بنیادی جملوں اور لب و لہجہ پر توجہ کی جاتی ہے۔ اس میں سماعی بصری آلات سے مدد لی جاتی ہے۔ علامات خط کا استعمال بین الاقوامی صوتی رسم الخط کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ پھر مزید الفاظ سکھائے جاتے ہیں اور روایتی نہیں، لسانیاتی گرامر سکھائی جاتی ہے۔

یہ مسلم کہ اس رسالے میں تدریس زبان کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ نہایت مفید ہے لیکن یہ مادری زبان کے بجائے دوسری زبان سکھانے کے لیے ہے۔ دوسری قباحت یہ ہے کہ اس طریق سے زبان سیکھنے والے طلبہ کو لسانیات اور صوتیاتی رسم الخط وغیرہ کا علم ہونا چاہیے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بچوں کے نہیں، پڑھے لکھے بالغوں کے لیے ہی ہے۔ اگر ہم کسی اردو ہندی کے علاوہ کوئی دوسری زبان بولنے والے کو اردو سکھانا چاہیں تو یہ طریقہ مفید ہو سکتا ہے۔

۲۔ اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت

یہ سب سے پہلے رسالہ نقوش شمارہ ۱۰۸ بابت ستمبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ۱۹۷۱ء میں بمبئی سے 'اردو میں لسانیاتی تحقیق' نام کا مجموعہ ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس میں مختلف حضرات کے مضامین ہیں جس میں ڈاکٹر نارنگ کا یہ مضمون بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ جدید ترین لسانیاتی نقطۂ نظر سے آراستہ ہے۔ اس میں انھوں نے چار اہم نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۔ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے۔

۲۔ زبان بنیادی طور پر بول چال کے لیے ہے۔ تحریر ثانوی چیز ہے۔

۳۔ زبان تغیر پذیر ہے۔

۴۔ زبان ایک نظام رکھتی ہے۔

انھوں نے پہلی دو شقوں کے تحت دکھایا کہ اردو میں مصوتوں کی تعداد زیادہ ہے اور ان کی علامتیں کم۔ دوسری مصمتوں کی آوازیں کم اور خطی علامات زیادہ ہیں۔ لوگوں کو یہ حشو علامتیں اس لیے عزیز ہیں کہ انھیں عربی فارسی سے عقیدت ہے۔ ڈاکٹر نارنگ بڑے لطیف انداز میں

کہتے ہیں۔

'لسانیات کے پاس عقیدے کی آنکھ نہیں ہے، نہ ہی اس کے پاس جذبے کی دھڑکنیں ہیں۔ یہ سائنس ہے۔۔۔۔لسانیات قدر (Values) سے نہیں، واقعہ (Facts) سے بحث کرتی ہے' (ص ۲۵۴)

پھر وہ روایتی مروجہ گرامروں کی خرابی دکھا کر چامسکی کی تشکیلی (Transformational) گرامر کی وکالت کرتے ہیں۔ اس کی مبادیات کر کے واضح کرتے ہیں کہ تشکیلی گرامر ہی وہ گرامر ہے جو ہر قیاتی ذہن کے ساتھ دے سکتی ہے اور جو مستقبل کی ضرورتوں کو پورا کرے گی۔

۳۔ کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ اردو اپریل ۱۹۶۸ء

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ۱۹۶۱ء میں کربل کتھا چھاپی۔ ڈاکٹر نارنگ کا مضمون، اسی کے ساتھ شامل ہونا تھا لیکن بہ وجوہ نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر نارنگ نے یہ مضمون رسالہ اردو کراچی کو بھیج دیا جہاں یہ اپریل ۱۹۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ادھر ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اسی موضوع پر مضمون لکھا تھا۔ بعد میں دونوں دوستوں نے اپنے مضامین کو ضم کر دیا اور ایک کتابچہ، کربل کتھا کا لسانی مطالعہ، کے نام سے مکتبہ شاہراہ دہلی سے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ یہ کتابچہ ۷۱ صفحوں کا ہے۔

اردو میں علمی و ادبی اشتراک کی روایت کمزور ہے، چہ جائیکہ لسانیاتی کاموں میں۔ اس کتابچے سے ثابت ہوتا ہے کہ تحقیقی کاموں میں ایک سے زیادہ افراد شریک ہوں تو نتائج کتنے بارآور ہوتے ہیں۔

چوں کہ فی الوقت ڈاکٹر نارنگ کے کاموں سے سروکار ہے۔ اس لیے میں رسالہ اردو کے مضمون کو سامنے رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نارنگ نے اشاعت سے قبل مضمون کا مسودہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو بھیج دیا جنھوں نے اسے پڑھا اور فٹ نوٹ میں چھے مقامات پر مختصر حواشی لکھے۔ ڈاکٹر نارنگ کے فٹ نوٹ میں ایک ماہر لسانیات کے حواشی ہیں۔ انھوں نے کربل کتھا کا تجزیہ بہت گہرائی اور جامعیت سے کیا ہے اس قدیم متن کو انھوں نے نہایت توجہ سے پڑھ کر

مفصل اور جامع یادداشتیں لکھی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فٹ نوٹ بہت مفید اور معلومات افروز ہیں۔

اب وہ اپنے مجموعے میں اس مضمون کے عنوان کو لسانیاتی تجزیہ کے بجائے لسانیاتی مطالعہ کر رہے ہیں تاکہ نثری آہنگ بہتر ہو جائے۔

مضمون کے بعد کتابچہ، کربل کتھا کا لسانی مطالعہ، دیکھا تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ رسالہ اردو میں مضمون باریک ٹائپ میں چھپا ہے، کتابچہ کھلے نستعلیق میں ہے۔ اس لیے خواہ مخواہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کے مضمون کا انداز کسی قدر لسانیاتی ہے، رسالہ عام قارئین کے لیے زیادہ قابلِ فہم اور دلچسپ ہے۔ اس میں مواد اور مثالیں زیادہ ہیں کیوں کہ یہ دو مضامین کا مال اپنی بغل میں مارے ہوئے ہے۔

۴۔　کیفی کی لسانی خدمات

ڈاکٹر نارنگ نے کیفی کی کتاب منشورات کو انجمن ترقی اردو دلی کی فرمائش پر مرتب کر کے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ اس کا مقدمہ ۴۴ صفحات کا ہے۔ اسے ڈاکٹر نارنگ زیر طبع لسانی مجموعے میں، کیفی کی لسانی خدمات، کے نام سے شامل کر رہے ہیں۔ نارنگ نے اپنے مقدمے میں کیفی کے اجتہادِ زبان اور روایت شکنی کو بڑی خوبی سے افشا کیا لیکن ان کا مقدمہ محض تشریح، توضیح اور تحسین نہیں۔ انھوں نے کیفی پر اعتراض بھی کیے ہیں مثلاً

۱۔　وہ ژولیدہ بیانی اور مخالف قیاس لغوی کے خلاف ہیں لیکن بعض جگہ ان کے اسلوب میں بھی یہی عیب پائے جاتے ہیں۔

۲۔　یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں کسی کی تنقید سننے کے روادار نہ تھے۔ زبان کے معاملے میں وہ بت پرست بھی تھے۔

۳۔　اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں ان کی معلومات تشنہ ہیں۔

۴۔　ان کے یہاں نئے مرکبات و مشتقات کو جائز کرنے کی لے یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ اپنے وضع کردہ کتنے الفاظ و مرکبات کو رائج کرنے پر مصر تھے۔

۵۔ حیرت ہے کہ اپنے اجتہاد کے باوصف وہ کئی مروج الفاظ مثلاً مواد، احتجاج، استبداد، فی الحال، قریب المرگ، دائم المریض، بین بین، ہر چند، ہنوز، مدام اور امسال کو اردو سے خارج کرنے کے حق میں تھے۔

بالعموم مقدمہ نگار مصنف کی تعریف ہی کرتا ہے، اس سے اختلاف نہیں کرتا۔ چوں کہ نارنگ ایک مرحوم کی کتاب کا مقدمہ لکھ رہے تھے اس لیے غیر جانب داری اور بے باکی سے اپنے من کی بات کہہ سکے۔

پوری کتاب پڑھے بغیر نارنگ کے مقدمے سے کتاب کے اہم مطالب کا علم ہو جاتا ہے۔

۵۔ احتشام صاحب کی لسانی خدمات شب خون۔ اگست تا اکتوبر ۷۷ء

اس مضمون میں جملہ لسانی تحریروں کا ۔۔ جو تعداد میں زیادہ نہیں۔ جائزہ لیا گیا ہے۔ احتشام صاحب کے پسندیدہ موضوع زبان اور سماج، اردو اور ہندی کا رشتہ اور رسم الخط تھے۔ ان موضوعات کے بارے میں ان کے خیالات میں جو ارتقا اور تبدیلی ہوئی ڈاکٹر نارنگ نے اس کی خوب نشاں دہی کی ہے۔ احتشام صاحب شروع میں رسم الخط کو زبان سے بالکل آزاد سمجھتے تھے بعد میں انھیں احساس ہوا کہ رسم الخط کا زبان بولنے والوں کی تہذیب سے بھی تعلق ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اگر پنجاب سے بہار تک ہر شخص کو اردو اور ہندی دونوں کے رسوم الخط سکھائے جائیں تو آگے چل کر یہ دونوں زبانیں ایک ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ اس خیال کو خوش فہمی قرار دیتے ہیں۔

اس مضمون کے ضمن میں اردو اور ہندی کے تعلق سے ڈاکٹر نارنگ کے خیالات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ اردو اور ہندی کو الگ زبانیں قرار دینا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

'حقیقت یہ ہے کہ ہندی اور اردو ایک زبان تو ہیں لیکن غیر مشروط طور پر نہیں یعنی اصل اور بنیاد ایک ہیں لیکن دونوں کی ادبی روایتوں کا فروغ اور ارتقا اس طرح ہوا ہے کہ اب یہ دو الگ الگ مستقبل زبانیں بن چکی ہیں۔' شب خون ص ۸

تیجے اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت، کا ذکر آ چکا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے کہا تھا، Language is basically speech, writing is its secondary and derivative manifestation. یہاں وہ اردو اور ہندی کو اصل کے اعتبار سے ایک مانتے ہوئے بھی مختلف ادبی روایات کے پیش نظر دونوں کو الگ اور مستقل زبانیں مانتے ہیں۔ غالباً ان کا لسانیاتی ضمیر دونوں زبانوں کو ایک قرار دیتا ہے لیکن ادبی ارتقا اور روایت کے پیش نظر وہ دونوں کو دو الگ زبانیں قرار دیتے ہیں۔

۶۔ اردو، ہماری اردو

لکھنؤ میں ۱۸ تا ۲۰ اپریل ۱۹۸۱ء دوسری کل ہند غیر مسلم اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر نارنگ نے خطبۂ صدارت دیا۔ اب وہ اس خطبے کو "اردو ہماری اردو" کے نام سے اپنے مجموعے میں شامل کر رہے ہیں۔ اس میں اردو کی مدح میں لکھتے ہیں:

> "اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اردو محض زبان نہیں، ایک طرز زندگی، ایک اسلوب زیست بھی ہے۔"

کیا واقعی اردو یہ سب ہے؟ میں سوچا کرتا ہوں کیا، اردو کلچر، نام کی کوئی امتیازی کلچر قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا زبان کی بنا پر تہذیبیں الگ ہو سکتی ہیں۔ میرے دادا، والدین اردو سے نابلد تھے اور میری بیوی بھی نابلد ہے۔ کیا ان کی اور میری تہذیب مختلف ہے اور کیا میری اور کرناٹک کے اردو بولنے والے مسلمانوں کی تہذیب ایک ہے؟ کیا اہل انگلستان کی تہذیب جنوبی افریقہ کے انگریزی بولنے والوں کے ساتھ مشترک ہے؟ کیا کناڈا کے انگریزی اور فرنچ بولنے والوں کی تہذیبیں الگ ہیں؟ کیا سوئٹزرلینڈ میں جرمن اور فرنچ بولنے والوں کے سوچنے کا طریقہ اور طرز زندگی مختلف ہیں۔ میں اس خیال کا حامی نہیں۔ تہذیبیں علاقے، مذہب اور سیاسی نظام کی بنیاد پر بنتی ہیں زبان کی بنیاد نہیں۔

اس مضمون میں ڈاکٹر نارنگ نے اردو اور ہندی کے اشتراک پر زور دیا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ اردو رسم الخط عربی فارسی خط نہیں بلکہ اس کی ایک آزادانہ حیثیت ہے۔

(۲) تقابلی لسانیات:

۷۔ اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک آج کل نومبر ۱۹۷۳ء

یہ مضمون پہلے آج کل نومبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ پھر رسالہ ہندوستانی زبان بمبئی نے اسے اپنے جنوری تا اپریل ۱۹۷۴ء کے شمارے میں ڈائجسٹ کیا۔ اس میں فہرست عنوانات میں مضمون کے عنوان میں 'لسانی رشتہ' ہے لیکن مضمون کے اوپر عنوان میں 'لسانی اشتراک' ہے۔ آج کل میں بھی 'لسانی اشتراک' ہے۔ ذیل میں 'ہندوستان زبان' سے صفحوں کا حوالہ دیا جائے گا۔

ڈاکٹر نارنگ اردو کی تہذیب کے پرجوش مبلغ ہیں لیکن اس مضمون کی بعض جزئیات سے مجھے اختلاف ہے مثلاً:

ڈاکٹر نارنگ نے اردو کے آغاز کا وہی نظریہ پیش کیا ہے جسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں وغیرہ نے پیش کیا کہ اردو بعض زبانوں اور بولیوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی۔ اختلاط کے نظریے پر مجھے دو اعتراض ہیں۔ اول یہ کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں یا بولیوں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان نہیں بن سکتی۔ ہر زبان اپنے سے پیشتر کی کسی ایک زبان کا ارتقائی روپ ہوتی ہے۔ دخیل الفاظ سے زبان کا شجرہ متعین نہیں ہوتا۔

دوسرے یہ کہ 'کھڑی بولی' اردو کے ترکیبی اجزا میں سے ایک نہیں بلکہ یہی اردو کا بنیادی روپ ہے جس کی بنا پر کھڑی بولی، ہندی اور اردو ایک ہی زبان کی مختلف شکلیں ہیں، دونوں (اردو ہندی) نے سب سے زیادہ طاقت کھڑی سے حاصل کی، ص ۶۱

"دونوں کا معیاری روپ کھڑی سے متاثر ہے"

میری رائے میں محض، متاثر نہیں، ایک ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر نارنگ اردو اور ہندی کے اشتراک کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو میں صرف پانچ آوازیں عربی، فارسی سے آئی ہیں بقیہ سب ہندی سے مشترک ہیں۔ انھوں نے ان پانچ آوازوں کا شمار نہیں کرایا۔ ان کے ذہن میں یہ ہوں گی۔

خ، ز، غ، ف، ق۔

میرا خیال ہے ان میں ایک آواز 'ژ' اور بڑھائی جائے۔ یہ شاذ ہے، لیکن ہے۔ ہم پژمردہ 'ژالہ' ژرف نگاہی جیسے الفاظ کو 'ز' سے ادا نہیں کر سکتے۔ انگریزی اور فرنچ الفاظ، پلیشر، میشر، رپورتاژ، موشار وغیرہ کی وجہ سے ہم اس آواز کو بخوبی ادا کرتے ہیں۔

ہندی کے صرف ونحو کے اشتراک کے مثال میں وہ کچھ سیدھے سادے جملے دیتے ہیں، مثلاً آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کہاں جائیں گے؟ اس وقت کیا بجا ہے؟ ص ۶۲

اور پھر کہتے ہیں 'یہ ہندی بھی ہے اور اردو بھی'

اگر دو زبانوں میں پورے جملے مشترک ہو سکتے ہیں تو یہ دو زبانیں کیوں کر ہیں ایک کیوں نہ ہوئیں؟ کیا دو مختلف زبانوں میں جملے مشترک ہو سکتے ہیں؟

دونوں کے اشتراک کے سلسلے میں وہ متعدد عناصر کا ذکر کرتے ہیں جن میں مشترک محاوروں میں آنکھ کے محاورے ۱۵ سطروں میں آئے ہیں۔ بنیادی الفاظ کی مثالیں گنا کر کہتے ہیں۔

'بنیادی لفظیات دونوں کی سوفی صد ایک ہے'۔ ص ۶۷

ان کے مطابق یہی کیفیت کہاوتوں کی ہے۔ اگر دونوں کا مغز ایک ہے تو حشوبات پر کیوں توجہ کی جائے۔

۸۔ اردو اور ہندی کا رشتہ　　نذر زیدی ۱۹۸۰ء

یہ مضمون پہلے کے مقابلے میں مختصر اور کسی حد تک اسی کی توسیع ہے۔ اس میں اردو ہندی کے مشترک سرمائے کے ذکر کے بعد دکھاتے ہیں کہ اردو نے کس طرح عربی آوازوں کو ہندیایا اور عربی فارسی الفاظ کے تلفظ اور معنی میں ترمیم کی۔ آگے چل کر پھر بنیادی الفاظ اور کہاوتوں وغیرہ کے اشتراک کی مثالیں دیتے ہیں۔ پہلے مضمون میں مختصر اور اس مضمون میں زور دے کر کہتے ہیں کہ اردو میں تین چوتھائی الفاظ ہندی الاصل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرہنگ آصفیہ میں دیئے ہوئے شمار کی بنا پر کہا ہوگا۔ مجھے فرہنگ کے شمار پر شبہ ہے۔ وہ محاوروں کو علاحدہ الفاظ کے

طور پر درج کرتی ہے مثلاً آنکھ کے بے شمار محاورے سے مندرج ہیں۔ قدما کے سامنے لفظ کے تعین کا کوئی اصول نہ تھا۔ اردو میں ہندی الاصل الفاظ کی تعداد کسی طرح اتنی زیادہ نہیں، دوسرے یہ کہ الفاظ کے تکرر استعمال (Frequncy) کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ ہم عربی فارسی الفاظ زیادہ اور ہندی الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نارنگ اپنی سیر چشمی کے تحت لکھتے ہیں۔

''ظاہر ہے اردو مستعار اور دیسی لفظوں سے برابر کا سلوک کرتی ہے'' ص ۲۸۰

ایسا ہرگز نہیں۔ اردو جملے میں اصل مفہوم کے حامل الفاظ عربی فارسی کے ہوتے ہیں، ہندی الاصل الفاظ محض امدادی حیثیت رکھتے ہیں۔ عربی فارسی الفاظ پالکی نشین امیر ہیں، ہندی الفاظ پالکی گردار کہار۔ عروض میں ہندی الفاظ کے آخری الف، 'واؤ' ی گرائے جاسکتے ہیں لیکن عربی فارسی الفاظ کے آخر میں نہیں کیوں کہ اس طرح عربی فارسی الفاظ کی عظمت مجروح ہوتی ہے۔ یہ الفاظ اتنے مقدس ہیں کہ انھیں ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی عطف واضافت کی سلک سے نہیں باندھا جاسکتا۔ اردو میں عربی فارسی الفاظ کا احساس برتری ڈھکا چھپا نہیں۔

(۳) زبان اور بولی:

۹۔ دہلوی اردو کی کرخنداری بولی انگریزی کتاب۔ دلی۔ ۱۹۶۱ء

انگریزی کی یہ کتاب منشی رام منوہر لال نے ۱۹۶۱ء میں شائع کی۔ مصنف نے مجھے یہ کتاب اپریل ۶۲ء میں عطا کی جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ ۶۲ء ہی میں شائع ہوئی ہوگی۔

ڈاکٹر نارنگ نے یہ دلچسپ کتاب انگریزی میں لکھی۔ شاید ان کا مقصد یہ رہا ہو کہ انگریزی میں یہ غیر اردو دونوں تک بھی پہنچ جائے گی۔ اس میں بولی کی مثالیں بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط میں دی ہیں۔ اس سے تلفظ صحت سے تو اردو ہو جاتا ہے لیکن عام انگریزی قارئین کے لیے بڑی حد تک ناقابل فہم رہتا ہے۔ میں صوتیاتی رسم الخط کو پوری طرح پڑھ لیتا ہوں لیکن اس میں آنکھوں اور ذہن کو خاصی دقت ہوتی ہے۔ اگر یہ کتاب اردو میں بھی شائع کر دی جائے اور جملہ اعراب، جزم سمیت لگائے جائیں تو تلفظ کما حقہٗ صحت سے درج ہو سکے گا۔

ڈاکٹر نارنگ کا وطنِ مالوف بلوچستان ہے جہاں ان کا لڑکپن گزرا۔ اردو ان کی مادری زبان نہیں۔ ان کے لیے کرخنداری اردو کو گرفت کر کے ضبطِ تحریر میں لانا قابلِ قدر ہے۔ کتاب کے ابواب لسانیاتی ترتیب سے ہیں۔ کرخنداری ایک طبقاتی بولی ہے۔ اس کے جن الفاظ و اصوات کو کرخنداری روپ کہا گیا ہے ان میں سے زیادہ تر دلی اور مغربی یوپی میں عام طور سے بولے جاتے ہیں اس لیے اس کتاب سے ان علاقوں کے رہنے والے زیادہ محظوظ ہو سکتے ہیں۔ میں محجوب ہو کر اعتراف کرتا ہوں کہ کرخنداری کے بہت لسانی روپ میں بھی اپنے گھر میں بولتا ہوں، یہ میری بولی کا جزو ہیں۔ کھڑی بولی کے تقریری روپ یا طبقاتی بولی کے جائزے میں یہ کتاب دلچسپ و مفید ہے۔

(۴) صوتیات:

ایک قسم کی دو مضامین پر ایک ساتھ تبصرہ کرتا ہوں۔

۱۰۔ اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی۔ امتیازی خصوصیات کی روشنی میں نذیر ذاکر ۱۹۶۸ء

اپنے زیرِ طبع لسانی مجموعے میں ڈاکٹر نارنگ نے اس کا پورا عنوان یوں بدل دیا ہے۔

(۱)

اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی

امتیازی خصوصیات اور سمعیات کی روشنی میں

(مصحح)

۱۱۔ اردو مصوتوں کے نئی درجہ بندی۔ امتیازی خصوصیات کی روشنی میں ارمغانِ مالک ۱۹۷۱ء

زیرِ طبع مجموعے میں شمول کے لیے اس کا عنوان یوں کر دیا ہے۔

(۲)

اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی

امتیازی خصوصیات اور سمعیات کی روشنی میں

صوتیات کی ایک شاخ سمعیاتی صوتیات (Acoustic Phonetics ہے)، یہ خالص

طبیعات (Physics)، بلکہ اس کی ایک شاخ Acoustics۔ اس کے لیے صوتیاتی لیبارٹری میں کام کیا جاتا ہے جس میں اسپیکٹروگرام اور سونوگرام جیسے سائنسی آلے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے یہ کام ۶۵۔۶۴ء میں امریکہ کی وسکانسن یونیورسٹی اور انڈیانا یونیورسٹی میں کیا۔ اردو میں اس قسم کا کام ڈاکٹر نارنگ نے پہلی بار پیش کیا ہے۔ سچ ہے کہ اس کام کو ادب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ یہ خالص تکنیکی اور مشینی لسانیات ہے جسے اردو زبان میں پیش کرنا بے سود ہے۔ ان دونوں مضامین میں اردو مصمتوں اور مصوتوں کی امتیازی خصوصیات دی گئی ہیں نیز اسپیکٹروگرام سے لیے ہوئے ان کے فوٹو دیے ہیں۔

12. Aspiration and nasalization in the generative phonology of Hindi Urdu by Narang and Donald. A becker, Language, Vol 47, No 3, Sep, 1971.

یعنی ہندی اردو فونیمیات میں ہکاریت اور انفیت۔ اس کے شریک مصنف بیکر وسکانسن یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ یہ مضمون بہت گاڑھا اور خالص لسانیاتی انداز کا ہے۔ جدید لسانیات میں صوتی اور قواعدی اصولوں کو الجبرے کی علامات میں لکھنے کا بہت میلان ہے تاکہ لسانیات طبعی سائنسوں جیسی دکھائی دے۔ اس مضمون میں بھی الجبرائی ہیت کے اصولوں کا وفور ہے۔

میں نے اس تکنیکی مضمون کو گہرائی سے نہیں پڑھا۔ اس کے لیے میرے پاس دماغ، وقت اور یکسوئی نہیں۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا ہے۔ کوئی عالمانہ تجزیہ معلوم ہوتی ہے جس میں ہکاریت اور انفیت کو اصولوں میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اس میں دی ہوئی چند مثالوں کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

انھوں نے یہ بجا لکھا ہے کہ ہماری زبان میں طویل انفی مصوتے عام ہیں لیکن مختصر انفی مصوتے شاذ ہیں۔ آخر الذکر کی مثال میں انھوں نے ذیل کے الفاظ بھی دیے ہیں۔

سکنا (سینکے جانا) گنٹھی۔ گنٹھیلا (پیچے دار، مضبوط)۔ گنوئی (گاؤں کی آبادی) ص ۶۵۴۔ میری رائے میں پہلے تین الفاظ میں نون غنہ نہیں بولا جاتا۔ گٹھری کو گھنٹری کوئی نہیں

بولتا۔ تیسرے لفظ گنوٹی کو میں نے کبھی نہیں سنا۔

ص ۶۶۵ پر سکنا، پنپیرا، گنھڑی، گنٹھیلا کی مثالیں دی ہیں۔ میری رائے میں پنپیرا میں بھی نون غنہ بولنے کا رواج کم ہے۔

ص ۶۵۴ پر ایسے انفی مصمتوں (م، ن) کی مثالیں دی ہیں جو اپنے بعد آنے والے بندشی مصمتوں کے ساتھ ہم مخرج (Homorganic) نہیں ہوتے۔ ان مثالوں میں کنبہ کا اضافہ بھی کیا جا سکتا تھا کیوں کہ اس کا تلفظ کن بہ ہے۔ لیکن انھوں نے ص ۶۵۸ پر ہم مخرجی م کی مثالوں میں کنبہ کو بھی شامل کر کے اس کا تلفظ کمبا لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں۔

میرے لیے ص ۶۶۵ پر یہ مشاہدہ دلچسپ ہے کہ معصیتی بندشیوں سے پہلے صوتی انفیت میں ضعیف سا ہم مخرجی انفی مصمتہ جھلک آتا ہے۔ میں نے یہ مشاہدہ اپنے مضمون اردو کی اصوات اور صوتیے (نقوش لاہور شمارہ ۹۳ بابت جولائی ۱۹۶۲ء ص ۴۲) میں کیا تھا۔ مزید تفصیل سے اپنے مضمون اردو کی غنائی اصوات، مشمولہ لسانی مطالعے ص ۸۲۔۸۳ء پر پیش کیا۔

13. Generative phonology and the retroflex flaps of Hindi Urdu by Donaid A Becker and G.C. Narang General Linguistics, Vol 14, No 3, Fall, 1974, Pennsvivania State University Press.

یہ مضمون پہلے مضمون سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں ڑ اور ڑھ کو ڈ اور ڈھ کے ساتھ ہم صوت قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب، مقدمہ تاریخ زبان اردو، میں لکھا ہے کہ 'ڈ' لفظ کے درمیان اور آخر میں ن کے بعد ہی آتا ہے یا آخر میں مشدد ہو کر آتا ہے۔ بقیہ صورتوں میں یہ لفظ کے درمیان یا آخر میں نہیں آتا۔ وہاں 'ڑ' آتا ہے۔ جو اصول 'ڈ' 'ڑ' کے ہیں وہی ڈھ اور ڈھ کے ہیں اس لیے ہم غیر ہکاری صورتوں کو زیادہ اہمیت دیں گے۔ راقم الحروف نے ہماری زبان بابت یکم اگست، ۱۵ اگست اور یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء میں ایک مضمون، اردو کے چند کوزی تجصوتیے، لکھا تھا جس میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے موقف سے اختلاف کیا اور 'ڈ' اور ڈھ کو لفظ کے درمیان اور آخر میں ڑ، ڑھ کے ساتھ جملہ مقامات پر واقع ہوتے دکھایا۔ ڈاکٹر

نارنگ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے موید ہیں۔

ڈاکٹر اشوک کیلکر صوتیات کے جید عالم ہیں۔ مجھے پڑھا چکے ہیں۔ میں نے ان سے ڈ، ڑ کے مسئلے پر بات کی تھی۔ انھوں نے مجھے اصول بتایا کہ فونیم کی بحث میں صرف کو درمیان میں نہیں لایا جاسکتا۔ یہ دو سطحوں کو گڈمڈ کرنا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کے زیر بحث مضمون ص ۱۳۰ سے معلوم ہوا ہے کہ یہی موقف بلوم فیلڈ اور نو قواعدیئن Neo-Grammarians کا تھا۔ نارنگ اس اصول کو نہیں مانتے اور ڈاکٹر مسعود حسین خان سے اتفاق کرتے ہیں کہ لفظ کے وسط اور آخر میں ڈ، ڈھ تو 'ن' کے بعد ملتے ہیں یا تشدید کی صورت میں۔ وہ سڈول اور نڈھال جیسے الفاظ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے کیوں کہ مارفیمی اعتبار سے یہ واحد نہیں۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ صوتیات یا فونیمیات زبان کے صوتی مزاج اور اس کے صوتی رد و قبول پر نظر رکھتے ہیں، لفظ کی صرفی حیثیت اور اس کی تاریخی لغوی روپ غیر متعلق ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کوئی لفظ فی الوقت عام بول چال میں کس شکل میں بولا جاتا ہے۔ اب بجر لش میں اس کا کیا تلفظ تھا، لغت کیا متعین کرتی ہے۔ فونیمیات کو اس سے کیا لینا دینا۔

دوسری زبانوں کی مخصوص آوازوں مثلاً عربی کے ث، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع یا انگریزی کے th، d، اور چند مختصر مصوتوں والے الفاظ ہماری زبان میں آئے تو چوں کہ یہ ہمارے صوتی مزاج کے خلاف تھے اس لیے ہم نے اپنے تلفظ میں انھیں اپنی زبان کی مماثل آوازوں سے بدل لیا۔ سنسکرت اور عربی کے بعض مصمتی خوشے ہماری زبان کے مطابق نہیں اس لیے انھیں توڑ دیا جاتا ہے۔ سنسکرت اور عربی متحرک الآخر الفاظ ہوتے ہیں ہم انھیں ساکن کر لیتے ہیں، لیکن متعدد انگریزی یا سنسکرت الفاظ کا تلفظ ہماری زبان میں نہیں بدلا جاتا۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ یہ تلفظ ہماری زبان کے مزاج کے مطابق ہے۔ ہم ایسے دخیل الفاظ کو بھی اپنے جائزے میں شمار کر سکتے ہیں۔ آئیے اب وسطی اور آخری 'ڈ' والے الفاظ کو دیکھیں۔

ا۔ لفظ کے وسط میں:

الف: ان الفاظ میں جہاں یہ سابقے یا لاحقے کے ساتھ نہیں یعنی جہاں مارفیمی حد پر

نہیں۔

گڈریا۔ اگر سنسکرت میں ڈوب کر یہ کہا جائے کہ یہ گڈر (غالباً بمعنی بھیڑ) + یا کا مجموعہ ہے تو بھی 'ڈ' مارفیمی حد پر نہیں بیچ میں ہے۔

گوڈا بمعنی گھٹنا۔ کھڑی بولی علاقے میں اب بھی بولا جاتا ہے۔ ہردوار کے پاس، بھیم گوڈا، اس کی دلیل ہے۔ اودھی میں اس لفظ کو گوڑ بولتے ہیں جہاں اس کے معنی گھٹنا نہ رہ کر پیر ہو جاتے ہیں۔ کھڑی بولی میں گوڑ نہیں بولا جاتا۔

ڈوڈا۔ پودوں کا وہ خول جس میں بیج رہتے ہیں۔ یہ لفظ آہنگ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس کی تانیث و تصغیر 'ڈوڈی' ہے۔ پوست (خشخاش) کی ڈوڈی عام طور پر بولتے ہیں۔

گڈولنا۔ بچوں کی چھوٹی گاڑی۔ فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص ۷۷ پر اسے 'گڑولنا' کے تحت اس کا متبادل تلفظ دیا ہے۔ میں نے اپنے وطن ضلع بجنور نیز سہارنپور میں اسے محض 'گڈولنا' سنا ہے، گڑولنا کسی کو بولتے نہیں سنا۔

اڈانا۔ ایک پکا راگ ہے۔ ملاحظہ ہو کلیات شاہی مرتبہ سید مبارز الدین رفعت (علی گڑھ ۱۹۶۲ء) میں ص ۱۸۰ پر عنوان در مقام اڈانا، نیز ص ۲۰۳ پر عنوان 'اڈانا'۔

مڈلچی۔ ورنا کیولر مڈل پاس۔ اس معنی میں انگریزی نہیں، اردو لفظ ہے اور فرہنگ آصفیہ میں ہے۔

مڈاسا۔ پگڑی۔ پلیٹس اور آصفیہ دونوں میں منڈاسا سے الگ دیا ہے۔

آڈنبر۔ ہندی لفظ ہے جو کھڑی بولی علاقے میں بولا جاتا ہے۔

اہلِ ہندی ایک لفظ وڈبنا (تذبذب) کا بھی استعمال کرتے ہیں۔

گڈمڈ۔ اس میں پہلے جزو 'گڈ' کی ڈ لفظ کے وسط میں ہے۔ یہ لفظ دو مارفیموں سے مرکب نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ تنہا گڈ اور مڈ کے کوئی معنی نہیں۔

ڈالڈا۔ ایک بناسپتی گھی کا نام۔ اب یہ لفظ اسم نکرہ کے طور پر بناسپتی کے معنی میں بولا جانے لگا ہے۔ یہ انگریزی سے دخیل لفظ نہیں بلکہ ایک نیا لفظ ہے جو ہماری زبان میں تقریباً ۳۵

سال پہلے وضع ہوا۔

ب: ان الفاظ میں جہاں یہ سابقے یا لاحقے کے ساتھ ہے یعنی مارفیمی حد پر ہے۔
غڈر، سڈول، لاڈلا، اڈا (اڈنا کا ماضی مطلق)، دو سندیں

اشک جو اڈے، دمِ گریہ تو پھر دریائے خوں
موج زن تھا دل سے لے کر چشمِ تر تک ایک سا
ظفر

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے
فانی

میگڈمبر۔ ہاتھی پر رکھی ایک شاہانہ سواری۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق اس کی اصل میگھ + ابمر ہے لیکن پلیٹس کی ڈکشنری سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ میگھ + آڈمبر ہو۔

ع وہ فیلوں کی اور میگڈمبر کی شان (بحرالبیان)

ج: انگریزی سے دخیل الفاظ میں مثلاً سوڈا۔ ایڈیٹر۔ ہولڈال۔

د: مقامات کے نام میں۔ کسی علاقے کے مقامات کے نام وہاں کی زبان اور بولی کے دیرپا صوتی مصمتے ہوتے ہیں۔ بھیم گوڈا کا اوپر ذکر کیا گیا۔ میرے وطن سیوہارہ ضلع بجنور سے تین میل دور پر گاؤں 'بڈیرن' ہے۔ ضلع بجنور میں دو اور گاؤں گنڈانا اور بڈگرہ ہیں۔

(۲) لفظ کے آخر میں:

گنڈمڈ۔ اگر اس لفظ کو مرکب سمجھا جائے تو دونوں اجزا کے آخر میں، ورنہ محض مڈ کے آخر میں۔

لاڈ۔ کھڑی بولی میں لاڑ کے علاوہ لاڈ بھی بولتے ہیں گو نسبتاً کم۔ 'لاڑ' زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

کھنڈ، اجڈ۔ اردو ہندی کے موجودہ تلفظ کو لفظ کے آخر میں مشدد مصمتے کی تاب نہیں، اسے

اکہرا کر لیا جاتا ہے۔ضد اور حد کو کوئی مولوی ہی مشدد دال سے بولے گا۔

غالب کے دو شعر ہیں۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں　　بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے　　آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

اسی طرح ہندی الفاظ کھڈ اور اجڈ کو بول چال میں بغیر تشدید کے بولا جاتا ہے مثلاً۔

یہ جملے دیکھیے۔

بدری ناتھ جاتے ہوئے ایک بس کھڈ میں گر پڑی

وہ پکا اجڈ آدمی ہے۔

ہوسٹل میں رہ کر اس کا اجڈ پن اور بڑھ گیا۔

کوئی عام اس قسم کی اطلاع دے گا تو وہ کھڈ، اجڈ کو کبھی تشدید سے نہیں بولے گا۔

کھڈ میں ڈ کا وہی مقام ہے جو کھڑ کھڑ میں ڑ کا اور اجڈ کا اگلی جوڑا اجڑ ہے۔گڈمڈ اور گڑبڑ

مماثل جوڑے ہیں۔

اڈنا۔لغت میں یہ لفظ امنڈنا لکھا ہے لیکن لغت پیچھے رہ گئی ہے بولی آگے بڑھ گئی ہے۔

اب اس لفظ کو نون غنہ کے بغیر اڈنا بولا جاتا ہے جس کا ماضی مطلق اڈا ہے۔حیدرآباد کے ایک

اچھے شاعر مضطر مجاز کی غزل کا مصرع ہے۔

ع اڈ گیا ہے تو دریا کا جسم ٹھہرا ہے

دخیل الفاظ: رولڈ گولڈ اور گولڈ کپ میں۔

ڈھ کے چند الفاظ کی مثالیں

ا۔لفظ کے وسط میں

(الف)۔ساڈھو۔ہم زلف کے لیے کھڑی بولی میں ساڈھو اور ساڑھو دونوں کا استعمال

تقریباً برابر ہے۔کنڈھیلا۔یہ نہایت دیہاتی اور شاذ الاستعمال لفظ ہے لیکن پلیٹس اور فرہنگ

آصفیہ دونوں میں موجود ہے جہاں اس کے معنی سوتیلا بیٹا دیے ہیں۔

ب۔ سابقے سے مرکب الفاظ: ڈھال، کڈھب، بے ڈھب۔ کڈھنگا۔

ج۔ اشخاص اور مقاموں کے ناموں میں۔ ہمارے یہاں ایک نام کڈھیرا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کڈھیرنا کے معنی گھسیٹنا ہیں۔ جس کے بچے نہیں جیتے وہ عوامی توہم کے تحت نوزائیدہ بچے کو چھاج میں رکھ کر کھینچتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب یہ بچہ زندہ رہے گا۔ ایسے بچے کا نام کڈھیرا یا جھجھر رکھ دیا جاتا ہے۔ اشخاص کا ایک نام روڈھا ملتا ہے جو معلوم نہیں کیوں بھنگیوں ہی میں رائج ہے۔

د۔ مقاموں کے نام میں مثلاً ضلع مظفر نگر میں بڈھانا۔ ضلع انبالہ میں ساڈھورا جو زار علامی کا وطن ہے۔

۲۔ لفظ کے آخر میں

مڈھ۔ سرغنہ، چودھری

مڈھ بھیڑ۔ میں نے ہماری زبان میں اپنے مضمون میں یہ لفظ لکھا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ اپنے زیرِ نظر انگریزی مضمون (ص ۱۴۰) میں لکھتے ہیں کہ اس کا دوسرا تلفظ مٹھ بھیڑ ہے جو واضح طور پر مٹھ (مٹھی) اور بھیڑ (بھڑنا) کا مجموعہ ہے یعنی مٹھی سے لڑتے ہوئے بھڑنا۔ مجھے تسلیم ہے کہ مڈھ بھیڑ کا متبادل تلفظ مٹھ بھیڑ ہے لیکن مجھے اس کے تجزیے پر شک ہے۔ یہ مڈھ (بمعنی سر) اور بھیڑ (بھڑنا) کا مرکب ہے۔ یعنی سروں کا ٹکرانا۔ اس طرح مڈھ بھیڑ اصل تلفظ ہے، مٹھ بھیڑ ثانوی۔

ڈھ، کی مثالیں 'ڈ' کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔

'ڈ' ڈھ کے اتنے الفاظ ہوتے ہیں کیسے مان لوں کہ یہ دونوں آوازیں محض ن کے بعد یا تشدید کے ساتھ آتی ہیں اور ان کا اور ڑ، کا وقوع جدا جدا ہے۔ کھڑی بولی علاقے کا کوئی باشندہ انھیں ایک نہیں مان سکتا۔

ڈاکٹر نارنگ کے اس مضمون کے ص ۱۳۲ پر کھڑی بولی اور ہریانی میں معیاری ہندی اردو کے الفاظ کا ذیل کا تلفظ دیا ہے۔ قوسین میں معیاری تلفظ درج کرتا ہوں۔

بڈا (بڑا)۔ بڈھیلا (بڑھیلا)۔ ڈھوڈی (ڈھوڑی)۔ ایڈ (ایڑ)۔ گنڈھ (گڑھ)۔ گاڈی

(گاڑی)۔لاڈ(لاڑ)۔میڈا(میٹرا)۔پیڈھی(پیڑھی)۔سڈا(سڑا)۔

لاڑ کو کبھی کبھی لاڈ بول دیا جاتا ہے لیکن بقیہ الفاظ میں 'ڈ ڈھ' کا تلفظ میں نے کبھی نہیں سنا۔ کوئی بڈا، سڈا، ایڈا، گاڈی نہیں بولتا۔ ضلع سہارنپور میں گاڑی کو گنڈی بول دیتے ہیں 'گاڈی' ہر گز نہیں۔ ڈیوڑھی کا تلفظ ڈھوڈی کہیں بھی نہیں کہا جاتا۔

اس مضمون میں بعض الفاظ ٹھیٹ سنسکرت کے ہیں مثلاً شٹ پڈ، شٹ کنڈ، شٹ کرن، شڈ انن، شڈ رتو، شڈ ریو (ص ۱۴۰)۔ یہ ہندی بول چال میں بھی رائج نہیں۔ میری رائے میں کتابی زبان کو نظر انداز کر کے مثالوں کو صرف بول چال کی زبان تک محدود رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔

(۵) صرف:

۱۴۔ اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر مقالات ۱۹۶۷ء

یہ مضمون محض چھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۶۶ء میں انجمن اساتذہ جامعات ہند کی پہلی کانفرنس دلی یونیورسٹی میں ہوئی۔ یہ مضمون اسی میں پڑھا گیا اور اس کے مجموعے 'مقالات' (۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا۔ اس میں تمنا عمادی کی کتاب افعال مرکبہ، کراچی ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر دلوی کے مرتبہ مجموعے اردو میں لسانیاتی تحقیق، میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مضمون اردو کے مرکب افعال شامل ہے۔ معلوم نہیں یہ ڈاکٹر نارنگ کے مضمون پر مقدم ہے کہ موخر۔ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے مضمون میں فعل مرکب کی تعیین کی ہے۔ مولوی عبدالحق کی قواعد سے اختلاف کرتے ہوئے صرف اسی فعل کو فعل مرکب قرار دیا ہے جس کے تمام اجزا فعل ہوں یعنی جو فعل+ فعل یا فعل+ فعل ہو۔ نارنگ نے اس قسم کے افعال کا تجزیہ کیا ہے۔

(۶) معنیات:

۱۵۔ اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ نذر عابد ۱۹۷۳ء

۱۳ صفحات کا یہ مضمون نہایت دلچسپ ہے، اس حد تک کہ اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے اور لکھا جاتا۔ اس کا نفسِ مضمون عنوان سے ظاہر ہے۔ اس میں محاوروں کی موضوعاتی گروہ بندی کی گئی ہے اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ۔ کہاوتوں کا جزو تشنہ ہے۔ اس مضمون کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ محاورے اور کہاوت پر الگ الگ پی ایچ ڈی کا کام ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر نارنگ محاورے کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

''علما نے محاورے کی تعریف یہ کی ہے کہ محاورہ کم سے کم دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔''

برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اس بات پر صحیح زور دیا ہے کہ ''اکثر محاوروں کی بنیاد استعارے پر نہیں بلکہ تمثیل پر ہوتی ہے۔'' ص ۳۷۴

میرے نزدیک محاورے کی تعریف یہ ہے کہ یہ کم سے کم دو لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سے کم سے کم ایک لفظ یا زیادہ الفاظ پر پورا محاورہ مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ میری رائے میں محاورہ کبھی مکمل جملہ نہیں ہوتا، جملے کا جزو ہوتا ہے۔ کہاوت کے پیچھے کوئی فرض یا اصلی واقعہ پوشیدہ ہوتا ہے اس طرح ان کی محاوروں کی فہرست میں کم از کم حسب ذیل یقیناً کہاوتیں ہیں۔

مرغ (مرغے) کی ایک ٹانگ۔ ص ۳۷۵

اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔

چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل

احمد کی پگڑی محمود کے سر ۳۷۶

چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات

درزی کی سوئی کبھی گاڑھے میں، کبھی کمخواب میں ۳۷۷

مضمون سے ضرب الامثال سے متعلق دو قدیم کتابوں: نجم الامثال از نجم الدین دہلوی ۱۸۷۶ء اور مخزن الامثال از چرنجی لال دہلوی ۱۸۹۰ء کا علم ہوا۔

(۷) فنِ تحریر:

۱۶۔ ہمزہ کیوں ہماری زبان علی گڑھ یکم، ۸، ۱۵ مئی ۱۹۶۷ء

علی گڑھ میں ۳۰ دسمبر ۱۹۶۵ء تا ۲ جنوری ۱۹۶۶ء 'اردو زبان و ادب اور تعلیم' پر ایک سیمینار ہوا جس میں اپنے مضمون میں ڈاکٹر نارنگ نے کہا کہ اردو میں ہمزہ علامت بے صوت ہے، نیز یہ کہ اردو رسم الخط میں حرف و صوت کے باہمی رشتے سے بے توجہی برتی جاتی ہے۔ اس پر ڈاکٹر محمد عقیل نے ہماری زبان بابت ۲۲ فروری ۱۹۶۶ء میں ایک مضمون 'اردو کا استعمال' لکھا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر نارنگ نے مندرجہ بالا مضمون لکھ کر کل ہند اورینٹل کانفرنس علی گڑھ منعقدہ فروری تا مارچ ۱۹۶۶ء میں پڑھا اور اسے ہماری زبان میں مئی ۶۷ء میں تین قسطوں میں شائع کیا۔ اس کے بعد یہ مضمون ڈاکٹر دلوی کے مجموعے لسانیاتی تحقیق ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔

مضمون میں ہمزہ کے استعمال کے قواعد بڑی باقاعدگی سے وضع کیے ہیں۔ واضح کیا ہے کہ یہ علامت دو مصوتوں کے بیچ استعمال ہوتی ہے بجز دو مستثنیات مسئلہ اور جرأت کے۔ لکھتے ہیں کہ مسئلہ میں ہمزہ عربی کی طرح حلقی بندشی مصمتے کے طور پر بولا جاتا ہے۔ میری رائے میں یہ ہرگز نہیں ہوتا۔ کوئی اردو والا ہمزہ کا عربی تلفظ ادا نہیں کرتا۔ جرات میں الف کے اوپر ہمزہ لکھنا کم از کم اردو میں زائد بات ہے۔

میری رائے میں اردو املا میں ہمزہ کے دو مصرف ہیں۔

۱۔ لفظ کے درمیان میں یہ الف متحرک کا قائم مقام ہے۔ یہ صوت رکن (Syllable) سے پہلے کھلا اتصال (Open-Juncture) ظاہر کرتا ہے۔ ہمزہ کی جگہ الف لکھ کر آزما لیجیے۔

آئے = آ + اے۔ کئی = ک + ای۔ لکھنؤ = لکھن + او۔ کوئی = کو + ای

۲۔ جہاں یہ صوت رکن کی حد ظاہر نہیں کرتا وہاں یہ دوہرے مصوتے یا جڑواں مصوتے (Dipthong) کے بیچ تجرید یہ (Glide) ظاہر کرنے کی علامت ہے مثلاً آئے، کوئی وغیرہ ذیل کی مثالوں میں۔

ع آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالبؔ
ع کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانے
ع اشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں
ع ہونٹوں پہ ترے دیکھوں ہنسی آئی ہوئی سی

اضافت کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"اگر مضاف اردو میں الف یا واؤ پر ختم ہو تو اضافت یائے مجہول سے لکھی جائے گی"

(لسانیاتی تحقیق ص ۳۶)

جیسا کہ ڈاکٹر نارنگ نے مجھے ذاتی خط میں لکھا ان موقعوں پر یائے مجہول کے اوپر ہمزہ نہیں ہونا چاہیے۔ غالب نے اسے عقل کو گالی دینا کہا ہے۔ میں نے اس پر ایک مفصل مضمون، یائے اضافت اور ہمزہ، لکھا جو میرے مجموعے حقائق ۱۹۷۸ء میں شامل ہے۔ میں نے کہا ہے کہ چلن اور آواز کے پیش نظر اردو میں ایسے موقعوں پر یائے مجہول پر ہمزہ لکھنا چاہیے۔ اس کے چلن کی یہ شدت ملاحظہ ہو کہ ڈاکٹر نارنگ کے مندرجہ بالا مضمون میں اضافت کی صورت میں یائے مجہول پر ہمزہ نہ لگانے کی مثالوں میں کئی جگہ ہمزہ لگا ہے۔ ہماری زبان ۸ مئی ۶۷ء ص ۴ دوسرے کالم میں 'صلائے عام' اور 'بقائے دوام' محض دو ترکیبوں میں ہمزہ ہے لیکن ٹائپ سے چھپے ہوئے رسالے ہندوستانی زبان میں ۱۷ مثالوں میں سے ۱۲ میں ہمزہ موجود ہے۔ 'لسانیاتی تحقیق' میں ۱۴ ترکیبوں پر ہمزہ ہے محض تین پر نہیں۔ اس سے اردو میں اضافت کی شکل میں ہمزہ کے استعمال کا اندازہ ہوتا ہے خواہ یہ کاتب کی مہربانی سے کیوں نہ ہو۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے زیر اہتمام ۲۳ تا ۲۵ جون ۱۹۸۵ء اسلام آباد میں اردو املا اور رموز اوقات کے مسائل پر سہ روزہ سیمینار ہوا تھا۔ اس کی سفارشات کا خلاصہ ہماری زبان دہلی بابت 15 مارچ ۱۹۸۶ء میں ہے۔ ص ۲ پر سفارش ۱۹ (ب) یہ ہے، جو الفاظ الف یا واؤ پر ختم ہوتے ہیں ان کے بعد اضافت کے لیے ہمزہ اور یے (ے) لکھی جائے مثلاً اردوئے معلی، بوئے گل، نوائے ادب۔

ڈاکٹر نارنگ کا یہ مضمون بڑا معقول ہے۔اس میں پہلی بار جامعیت کے ساتھ ہمزہ کے استعمال کے قواعد متعین کیے گئے ہیں۔

۱۷۔ اردو رسم الخط، تہذیبی اور لسانیاتی مطالعہ جامعہ دلی۔ مارچ اپریل، مئی ۱۹۷۲ء یہ مضمون رسالہ جامعہ کے تین شماروں میں شائع ہوا۔اس کی ابتدا میں انھوں نے مالک رام کی بڑی پتے کی بات، درج کی ہے کہ

'ہندوستان میں تقسیم کا بدلہ اور کسی چیز سے نہیں لیا جاسکتا۔ یہ لیا جاتا ہے اردو سے یہ اتنی پتے کی بات نہیں۔ کسی کا مشہور مصرع ہے۔

ع لے رہے ہیں مجھ سے تقسیم وطن کا انتقام

اگر تقسیم وطن کا انتقام ہی لینا ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں سے لیا جاتا، ان کی مبینہ زبان سے کیوں؟ ہر الیکشن سے پہلے ہر سیاسی پارٹی اردو نوازی کے خاص طور پر سے وعدے کرتی ہے۔بہر حال میں بھی پتے کی دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

مولوی عبدالحق نے ۱۵ فروری ۱۹۶۱ء کو کراچی میں غالب کی برسی کے موقع پر کہا۔

" پاکستان کو نہ جناح نے بنایا نہ اقبال نے بلکہ اردو نے بنایا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی اصل وجہ اردو زبان تھی۔ سارا دو قومی نظریہ اور سارے ایسے اختلافات صرف اردو کی وجہ سے تھے۔"

(قومی زبان کراچی۔۱۶ فروری ۱۹۶۱ء ص ۲۱)

انجمن ترقی اردو پاکستان سے ایک تحقیقی مقالہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ از ڈاکٹر معین الدین عقیل ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ انجمن کے جنرل سیکرٹری جمیل الدین عالی نے اس کے مقدمے میں جو شکوہ کیا وہ انھیں کے الفاظ میں سنیے۔

" انھوں نے انجمن ترقی اردو اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ان تاریخ ساز سرگرمیوں پر بہت ہی مختصر انداز میں تبصرہ کیا ہے جو ہماری جنگ آزادی اور بطور خاص تقسیم ہند کے سلسلے میں کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہمارے لیے تحریک آزادی آخری تجزیے میں کیا ہے؟

قیام پاکستان اور قیام پاکستان کے لیے انجمن اور مولوی صاحب نے جن عظیم مشکلات میں جن طاقت ور عناصر کے خلاف اردو سے جس طرح کام لیا ہے اس کی کہانی بھی تفصیلی طور پر اس کتاب کی زینت بنتی تو اس کی افادیت میں بڑا اضافہ ہوتا۔"

بیسویں صدی کے سب سے بڑے مجاہد اور مولوی عبدالحق تھے۔ وہ کہتے ہیں پاکستان اردو نے بنایا اور دو قومی نظریہ اردو کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ انھیں کی انجمن ترقی اردو کے بعد کے جنرل سیکرٹری کہتے ہیں کہ تقسیم ملک سے پہلے کی اردو تحریک اور انجمن اور انجمن ترقی اردو کا مقصدِ قیام پاکستان اور ملک کی تقسیم تھی جسے مولوی عبدالحق نے چابک دستی سے سرانجام پہنچایا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے دو جنرل سیکرٹریوں کے بیانات کے ساتھ ساتھ حسن عسکری کی یہ رجز خوانی بھی پڑھیے جسے ڈاکٹر نارنگ نے نقل کیا ہے۔

اردو رسم الخط ملتِ ابراہیم حنیف کا پرچم ہے بلکہ یہ رسم الخط تو موذن ہے جو ہر وقت لا الہ الا اللہ پکارتا رہتا ہے... غازی ہے جو اللہ اکبر کے نعروں سے تعینات کی فوجوں کو غارت کر کے واحدیت اور احدیت کا اقتدار قائم کرتا ہے۔ (جامعہ، فروری ۲۷ء، ص ۱۲۰)

ڈاکٹر نارنگ نے اس نقطۂ نظر کی بھی مذمت کی، اس کی بھی جو اردو رسم الخط کو بدل کر دیوناگری اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی سنجیدہ، ذمے دار طبقہ اردو کو رسم الخط بدلنے کا مشورہ نہیں دیتا۔ ڈاکٹر نارنگ نے غیر جذباتی علمی انداز سے یہ اصول پیش کیا۔

"لسانیات کی رو سے اصل اور بنیادی چیز بولی جانے والی زبان ہے، رسم الخط ثانوی ہے۔ اس سے لازم آیا کہ اردو زبان کا تصور اردو رسم الخط کے بغیر ممکن ہے۔" (ص ۱۲۴-۱۲۵)

اس کے بعد انھوں نے اس مغالطے کی تردید کہ اردو رسم الخط غیر ملکی ہے، اس کی متعدد اضافہ شدہ علامتوں (حروف) کے پیش نظر وہ اسے ہندوستانی رسم الخط مانتے ہیں۔

مضمون کی تیسری قسط میں انھوں نے رسم الخط کا صوتی تجزیہ کیا۔ اس کے بعد املا میں اصلاح کی مختلف تجویزوں پر غور کیا اور اپنی طرف سے بھی کئی ترمیمات پیش کیں۔ مضمون کے

بڑے حصے کا موضوع یہی ہے چوں کہ اس مسئلے پر ترقی اردو بورڈ نے مفصل غور و خوض کے بعد ۱۹۷۴ء میں املا نامہ شائع کیا ہے جس کے مرتب نارنگ ہی ہیں اس لیے یہاں ان کے مضمون کے اس پہلو پر تبصرے کی ضرورت نہیں۔

(۸) اسلوبیات:

۱۸۔ ذاکر صاحب کی نثر اردو کے بنیادی اسلوب کی ایک مثال۔

یہ مضمون امریکہ میں لکھا گیا اور شب خون بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ بنیادی اسلوب کی اصطلاح رشید احمد صدیقی کی تراشی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے اسلوب کو اس کا ایک نمونہ قرار دیا ہے۔ مضمون میں پہلے عام انداز کی ادبی تنقید ہے لیکن آخر میں لسانیاتی تجزیہ ہے یعنی جملوں کی نحوی ساخت کو تشکیلی قواعد (Transformational Grammar) کی نظر سے دیکھا ہے۔ عبارت کے الفاظ و تراکیب کا شمار کیا اور آخر میں اس میں آنے والی آوازوں کا ذکر کیا۔ اس جائزے میں دکھایا ہے کہ عربی، فارسی آوازیں ہندی آوازوں سے زیادہ ملتی ہیں۔

آخری پیرے میں ایک مفید اعتراف ملاحظہ ہو۔

''اگرچہ نثر میں آوازوں کو چن چن کر اور لفظوں کو گن گن کر نہیں لکھا جاتا لیکن نثر میں یہ خوبیاں اتفاقاً پیدا نہیں ہو جاتیں۔'' (اردو ادب ص ۴۱)

نظم ہی میں کہاں آوازوں کو چن چن کر اور لفظوں کو گن گن کر باندھا جاتا ہے؟

اب میں چار مضامین کا ایک ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مضامین اسلوبیاتی تنقید کے ذیل میں آتے ہیں۔ میں اپنے مضمون ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک نظر'' میں واضح کر چکا ہوں کہ میں اس تنقید کا قائل نہیں۔ لیکن اگر یہ تنقید قابلِ قدر ہے تو ڈاکٹر نارنگ کے یہ مضامین اس کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان مضامین میں سے تین کا عنوان اسلوبیاتِ انیس، اسلوبیاتِ اقبال، اسلوبیاتِ میر ہے۔ میری رائے میں یہاں اسلوبیات کی اصطلاح درست نہیں، اسلوبیات کے معنی، علم الاسلوب، ہے۔ اسلوبیات اسلوب کے اس علم کو کہنے لگے ہیں جس میں اسلوب کا

لسانیاتی نقطۂ نظر سے تجزیہ ہو۔ پورا عنوان 'لسانیاتی اسلوبیات' ہونا چاہیے لیکن اختصار کی خاطر سے اسے محض 'اسلوبیات' کہنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی مراد ہے 'اسلوب انیس کا اسلوبیاتی یا لسانیاتی تجزیہ' اگر ہم میر امن کی زبان کا مطالعہ کریں تو اسے لسانیات میر امن نہیں کہہ سکتے۔

مضامین یہ ہیں:

۱۔ اسلوبیات انیس۔ آج کل فروری ۱۹۸۱ء نیز انیس شناسی ۱۹۸۱ء یہ مضمون جنوری ۱۹۷۵ء میں انیس سیمینار لکھنؤ میں پڑھا گیا۔

۲۔ اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام۔ نقوش اقبال نمبر ۲۔ دسمبر ۱۹۷۷ء

۳۔ اسلوبیات اقبال، نظریہ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں۔ اقبال کا فن ۱۹۸۳ء

۴۔ اسلوبیات میر آج کل میر تقی میر نمبر مارچ ۱۹۸۳ء

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مارچ ۱۹۸۳ء میں میر سمنار ہوا۔ اسلوبیات میر اس میں پڑھا گیا۔ رسالہ آج کل میں یہ نو صفحات پر ہے اور اس کے آخر میں لکھا ہے، طویل مضمون کا حصہ اول، بعد میں ڈاکٹر نارنگ نے مزید مطالعہ کر کے ۱۹۸۳ء کے اوائل میں از سر نو لکھا اور مئی ۱۹۸۳ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی فرمائش پر بابائے اردو مولوی عبدالحق یادگاری لیکچر کے طور پر کراچی میں پڑھا۔ یہ انھیں کی طرف سے ۸۰ صفحات پر شائع ہوا۔ میں نے اس کا پروف دیکھا ہے چوں کہ اس میں لسانیاتی عنصر آج کل کے مضمون سے کوئی خاص زیادہ نہیں اس لیے میں آخر الذکر کو سامنے رکھ کر دو لفظ کہتا ہوں۔

سچ یہ ہے کہ اس مضمون میں لسانیات کا عنصر کم اور اقداری تنقید کا زیادہ ہے چنانچہ اس مضمون میں ایسی کوئی بات نہیں جو لسانیات نہ جاننے والوں کی سمجھ سے بالاتر ہو۔

لکھتے ہیں کہ میر کی زبان کا سب سے بھرپور تجزیہ وحید الدین سلیم نے کیا ہے۔ صرف ونحو کی حد تک ان کا تجزیہ جامع اور مانع ہے۔

نارنگ نے میر کی مشہور شاذ روکنی بحر کی غزل

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

لی اور اسی زمین میں غالب کے منسوخ کلام میں سے ایک غزل ڈھونڈ لی۔ دونوں کا مقابلہ کر کے انھوں نے دکھایا کہ میر کے مطلع میں صرف تین اسم ہیں اور غالب کے مطلع میں نو۔ دوسری بات یہ کہ میر کی طویل بحروں میں، بلکہ بعض اوقات مثمن بحروں میں بھی نحوی واحدے یعنی تابع جملے کثرت سے ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ میر کے یہاں مصوتوں کا استعمال عموماً اور طویل مصوتوں کا خصوصاً زیادہ ہے اور اس پر مستزاد ہے غنائیت۔ چوتھے یہ کہ میر کی نحوی ساخت میں عموماً نثری گفتگو کی ترتیب برقرار رہتی ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر نارنگ نے جو کچھ کہا ہے وہ لسانیاتی نہیں اقداری تنقید کے ذیل میں آتا ہے جو اس مضمون کا غالب رنگ ہے۔ اگر اس مضمون میں سے 'نحوی واحدے' اور معنیاتی Nodes کی دو اصطلاحیں دور کر دیں تو یہ پورا مضمون عام ادبی تنقید میں سما سکتا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کی مندرجہ بالا لسانیاتی تحریروں کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لسانیات کا مطالعہ وسیع ہے۔ انھوں نے اس کی تمام مشہور شاخوں، تاریخی لسانیات، زبان اور بولی، صوتیات، صرف، معنیات اور اسلوبیات وغیرہ پر مضمون لکھے اور نہایت مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ ادب اور لسانیات کی دورنگی واضح ہے۔ اس لیے اب وہ لسانیات سے ہٹ کر ادب کی طرف آ گئے ہیں۔ اب ان کے مطالعے کا اہم موضوع اطلاقی لسانیات کی شاخ اسلوبیات ہے۔

(الفاظ، علی گڑھ۔ جنوری تا اپریل ۸۷ء)

☆

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ: لسانی تناظر

لسانی تناظر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، ریڈر شعبۂ لسانیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لسانیاتی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ خلیل بیگ کی شخصیت جتنی خوشگوار ہے، وہی کیفیت ان مضامین کی ہے۔ یہ معلومات افروز ہیں لیکن ان میں تکنیکی تحریر کی یبوست نہیں۔ انھیں کوئی بھی اردو قاری دلچسپی سے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔

مرزا صاحب کا اصرار ہے کہ میں اس مجموعے کا تعارف لکھوں۔ قاعدہ ہے کہ مقدمہ یا تعارف اس موضوع کا ماہر لکھتا ہے، ایسا ماہر جس کی اس موضوع خاص میں صاحب کتاب سے زیادہ گہری نظر ہو۔ میں لسانیات کی مبادیات ہی سے واقف ہوں جب کہ مرزا خلیل بیگ اس مضمون کے استاد ہیں۔ میں نے ہزار معذرت کی لیکن میرا عذر قبول نہ ہوا۔ ناچار امتثال امر میں یہ سطور رقم کر رہا ہوں۔

یہ کتاب پانچ زمروں میں تقسیم ہے۔

الف: لسانی مباحث۔ ب: لسانی مسائل۔ ج: لسانی فکر۔ د: زبان اور رسم خط۔ ہ: تدریس زبان۔

پہلے زمرے کا پہلا مضمون ''لسانیات میں سائنسی نقطۂ نظر'' ہے جس میں اس موضوع کی نوعیت متعین کی ہے۔ دوسرا مضمون زبان اور قواعد ہے۔ اس میں روایتی قواعد اور لسانیاتی قواعد کا فرق بڑی تفصیل سے شرح کیا ہے۔ ادبی قواعد کو صرف و نحو کہتے ہیں۔ توضیحی قواعد کی بھی دو شاخیں صرف (Morphology) اور نحو (Syntax) ہوتی ہیں جنھیں ملا کر قواعد کہا جاتا ہے۔

مصنف نے ان دونوں قواعدوں کا اہم ترین فرق بتایا ہے کہ روایتی قواعد معنوی بنیادوں پر ہوتی ہے، توضیحی قواعد زبان کی ساخت اور ہیت کے تجزیے سے سروکار رکھتی ہے۔ مضمون میں دونوں قاعدوں کا موازنہ کر کے ان کی اضافی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا مقالہ ''اردو میں لسانی تحقیق'' ہے۔ یہ قدیم وجدید دونوں قسم کے لسانی کاموں کی تاریخ ہے۔ یہ اس مجموعے کا سب سے طویل مقالہ ہے اور شاید سب سے اہم بھی۔ اس کے مشمولات پر لکھنے سے قبل میں قطع کلام کر کے ایک مسئلے کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ مقالے کے متن پر کئی جگہ حوالے کا اشارہ نمبر ہے، ان حوالوں کی شرح مضمون کے آخر میں دی ہے، فٹ نوٹ میں نہیں۔ ایسا بہت سے قلم کار کرتے ہیں اس میں انھیں بھی سہولت رہتی ہے اور کاتب کو بھی۔ دقت ہوتی ہے قاری کو۔ وہ بار بار طویل مقالے کے اوراق الٹ کر، اس کا خاتمہ تلاش کر کے، مخصوص حوالے کی شرح ڈھونڈنے کی کھکھیڑ نہیں اٹھاتا، حوالے کو نظر انداز کر جاتا ہے۔ اگر مقالہ نگار چاہتا ہے کہ قاری حوالے کی شرح دیکھے تو اپنی سہولت پر قاری کی سہولت کو ترجیح دینی چاہیے اور حوالے کی شرح اسی صفحے کے فٹ نوٹ میں درج کرنی چاہیے۔ ہارورڈ کا طریقہ یہ ہے کہ حوالے متن کے بیچ قوسین ہی میں دینے چاہئیں۔ انگریزی میں مقالوں کی ہیت کا مستند کتابچہ ایم ایل اے ہینڈ بک ہے۔ اس میں بھی یہی ہدایت ہے کہ مختصر حوالے قوسین میں متن کے بیچ میں ہی درج کر دیے جائیں۔ ملاحظہ ہو میری کتاب ''تحقیق کا فن'' (لکھنؤ ۱۹۹۰، ص ۳۲۵)۔ میں حتی الوسع اسی پر عمل کرتا ہوں۔ قاری کو اس طریقے سے سب سے زیادہ سہولت رہتی ہے۔ خلیل بیگ اگر حوالوں کی شرح اسی صفحے پر فٹ نوٹ میں درج کرتے چلتے تو مجھ جیسے قاری کو اسے تلاش کرنے میں سرگرداں نہ ہونا پڑتا۔

ڈاکٹر بیگ نے اردو لسانیات کی تاریخ چار حصوں میں بیان کی ہے۔ پہلا حصہ بیسویں صدی سے قبل کی لسانی تحقیق کا احصاء کرتا ہے۔ بعد کے تین حصے بیسویں صدی کی تحقیق کا جائزہ لیتے ہیں۔ پہلا حصہ چونکہ قدیم کتب سے تعلق رکھتا ہے اس لیے مجھے اس سے خصوصی دلچسپی ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی تک کی لسانی تحقیق کا جائزہ عنوانات کے تحت کیا ہے:

(۱) قواعد نویسی (۲) لغت نگاری (۳) اصلاح زبان اور زبان کی معیار بندی (۴) اردو زبان کا آغاز و ارتقا۔ ان میں لغت نگاری کا جز و سب سے اہم اور بیش بہا ہے۔ اس میں انھوں نے علی اوسط رشک کی لغت کا نام نفس اللغتہ لکھا ہے (ص ۳۳)۔ اس کا حاشیہ ص ۸۵، پر ہے جہاں واضح کیا ہے کہ یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۵۶ھ نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس اللغتہ سے ۱۶۵۱ برآمد ہوتا ہے۔ صحیح نام نفس اللغہ (ہائے مختفی سے) ہے جس کے اعداد واقعی ۱۲۵۶ ہیں۔

بیگ صاحب نے کثرت سے ان عنوانات کے تحت متعلقہ موضوع کی کتابوں کے نام دیے ہیں اور اس کے لیے مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد کی ''کتابیات قواعد اردو'' مولفۂ ابو سلمان شاہجہان پوری اور ترقی اردو بیورو دہلی کی ''اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ'' مولفۂ ڈاکٹر مسعود ہاشمی سے استفادہ کیا ہے۔ ان کتابوں میں قواعد و لغت کی کچھ اور کتابوں کے نام مل جاتے ہیں لیکن وہ چنداں اہم نہیں۔ ''اصلاح زبان اور زبان کی معیار بندی'' کی فصل میں کافی ناموں کے اضافوں کی گنجائش ہے مثلاً ملاحظہ ہو میرے مضمون ''کتابیات، تحقیق'' مشمولہ رسالہ اکادمی (لکھنؤ جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۶۲ تا ۶۴) میں۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر بیگ ایک مضمون لکھ رہے تھے، اس موضوع پر پوری کتاب نہیں اس لیے وہ ہر اہم وغیر اہم کتابچے کا نام نہیں دے سکتے تھے۔

اس سلسلے کا چوتھا عنوان ''اردو زبان کا آغاز اور ارتقا'' ہے۔ اس میں انھوں نے چار ادیبوں: میر امن، سرسید، صہبائی اور محمد حسین آزاد کی تحریروں کا ذکر کیا ہے۔ اس دور میں بعض اور ادیبوں نے بھی اردو کے آغاز کے بارے میں غور کیا ہے جن میں سے دو میر امن سے بھی پہلے کے ہیں۔

۱۔ مرزا جان طپش نے اپنا دیوان ۱۱۹۹ھ میں مرتب کیا اور اس کا نام گلزار مضامین رکھا۔ اس کے طویل فارسی دیباچے میں انھوں نے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ایک مضمون ''اردو زبان کی ابتدا'' (اردو کراچی، اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں شائع کیا۔

۲۔ باقر آگاہ ویلوری نے اپنی مثنوی گلزار عشق کی ابتدا میں اردو نثر میں ایک دیباچہ لکھا جس میں چند سطور اردو کے آغاز کے بارے میں بھی ہیں۔ ان کے مطابق ہندی یعنی برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ کے شامل ہونے سے زبان ریختہ بنی۔ ملاحظہ ہو جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو جلد اول (دلی ۱۹۷۷ء ص ۵۲۳)۔ پورا دیباچہ علیم صبا نویدی کی کتاب ''مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر'' (مدراس ۱۹۹۴ء) میں شامل ہے۔ زبان سے متعلق بیان ص ۱۳۳ پر ملتا ہے۔

۳۔ محمود شیرانی نے جلوۂ خضر سے لے کر صاحب ظہیر الانشا کا فارسی اقتباس درج کیا ہے جو میر امن جیسا نظریہ ہی پیش کرتا ہے (پنجاب میں اردو، لکھنؤ ۱۹۸۱ء ص ۳۱)۔ مجھے ظہیر الانشا کا زمانہ معلوم نہیں۔

۴۔ مرزا قادر بخش صابر نے تذکرہ گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) کی طویل تمہید میں اردو زبان کے آغاز پر بھی لکھا۔ دیکھیے یوپی اردو اکادمی ایڈیشن ص ۶۴۔۶۵۔

۵۔ نساخ کا رسالہ درتحقیقِ زبان اردوئے معلی بہ نام تاریخی زبان ریختہ (۱۲۷۵ھ) تمام و کمال اسی موضوع پر ہے۔ اس کا نیا ایڈیشن ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے شائع کیا۔

بیگ کے مقالے کا جزو ب 'بیسویں صدی میں لسانی تحقیق' ہے۔ اس کا مطالعہ ذیل کے عنوانات کے تحت کیا ہے۔

۱۔ قواعد نویسی ۲۔ لغت نگاری ۳۔ اردو زبان کا آغاز و ارتقا ۴۔ اصطلاحات سازی۔

۵۔ تدوین متن ۶۔ اردو رسم خط کی اصلاح اور معیار بندی۔

اس میں دوسرا جزو تو معلومات افروز ہے ہی' بیت الغزل تیسرا موضوع ہے جو اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ایک سیر حاصل مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جزو کے آخری پیرے میں انھوں نے اردو اور چار علاقائی زبانوں کے رابطے سے متعلق کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک اس طرح کی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو میرے مضمون محولۂ سابق مضمون کتابیاتِ تحقیق'' (اکادمی جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۰ء) کے جزو تقابلی لسانیات ص ۶۱۔۵۹ پر

دیکھی جاسکتی ہے۔ اصطلاحات سازی کا ذیلی عنوان بھی جامع ہے۔ اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ضخیم تالیف "فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ" مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۱ء کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے تھا۔

تدوین متن کے جزو کے بارے میں میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ادبی تحقیق ہے، اسے لسانیاتی تحقیق میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم اردو کی حد تک تو ایسا ہی ہے۔ اس جزو میں انھوں نے تدوین کے متعدد کاموں کے نام لیے ہیں لیکن تدوین متن کے کام تو بے انتہا ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پانسو سے کیا کم ہوں گے۔ ان میں اچھے برے کی تخصیص نہیں۔ اس جزو کے آخر میں تدوین متن کے موضوع پر پانچ کتابوں کے نام لیے ہیں جن میں سے دو یہ ہیں:

عبدالرزاق قریشی: مبادیاتِ تحقیق۔ رشید حسن خاں ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ۔

یہ دونوں پوری طرح تدوینِ متن تک محدود نہیں، عام تحقیق کے بارے میں ہیں جن کے ایک جزو میں تدوین پر بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اگر جزو کتاب کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو میری کتاب "تحقیق کا فن" میں تدوینِ متن کے طویل باب (ص ۴۳۶ تا ۵۰۹) میں اتنا مواد ہے جتنا تدوین سے متعلق کتابوں میں بھی شاید ہی ہو۔ بیگ صاحب نے قریشی کی 'مبادیات تحقیق' کی تاریخ ۱۹۷۷ء لکھی ہے، صحیح تر ۱۹۷۸ء ہے۔ مضمون کی ذیلی فصل "اردو رسم خط کی اصلاح اور معیار بندی" بھی بہت سیر حاصل اور معلومات افروز ہے۔

مضمون کا جزو (ج) "اردو میں جدید لسانیاتی تحقیق" ہے جس کا بیان کئی عنوانات کے تحت ہے۔ اس کی پہلی ذیلی فصل 'عمومی لسانیات' ہے۔ اس میں میری دو کتابوں کا ذکر کلمۂ خیر کے ساتھ ہے۔ میں نے 'لسانی مطالعے' کے تیسرے ایڈیشن میں صوتیات سے متعلق مضامین خارج کردیے ہیں، اس پر بیگ صاحب کو بہت افسوس ہے۔ مجھے اس کا اندازہ ہوتا تو میں انھیں خارج نہ کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے یہ کتاب اردو ادب کے طلبہ کے لیے لکھی ہے، ایم اے لسانیات کے طلبہ کے لیے نہیں۔ اردو کے طالب علم صوتیات سے بھڑ کتے ہیں اس لیے میں نے صوتیات کے بجائے تاریخی لسانیات کے مضامین شامل کردیے۔ یہ بھی خیال تھا کہ

میں اپنی دوسری کتاب "عام لسانیات" میں صوتیات پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ شاید ناشر اس وقت تک نئے مضامین کے شمول کو پسند نہ کرتا جب کہ ان کے برابر کے دوسرے مضامین قطع نہ کر دیے جائیں۔

بیگ صاحب نے مجھ کم سواد کی کم ارز کتاب "عام لسانیات" کی جس مبالغے سے تحسین کی ہے اسے پڑھ کر میں نہ صرف ممنون، بلکہ محجوب ہوا۔ ۹۱۰ صفحات کی یہ جامع کتاب ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ میں اصولاً کسی سے اپنی کتاب پر ریویو یا تاثر درج کرنے کو نہیں کہتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر "عام لسانیات" کے بارے میں کسی نے ایک جملہ، ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کتاب ایسی ہی لکھی ہوگی جس کو کسی نے شایانِ التفات نہیں سمجھا۔ بیگ صاحب جیسے ماہر نے اسے سراہ کر میری عزت بڑھائی، ڈھارس بندھائی۔ علم الاصوات کے سلسلے میں بیگ صاحب میرے بارے میں رطب اللسان ہیں۔

> "پروفیسر مسعود حسین خاں کے بعد اردو صوتیات پر جن لوگوں نے انہماک کے ساتھ کام کیا ان میں پروفیسر گیان چند کا نام سرفہرست ہے۔"

ایک عالم کی اس تحسین کو میں ایک کم علم کی ذرہ نوازی کہوں کہ اظہار الفت۔ ان کے مشاہدے پر لسانیات کے باب میں میری جملہ بے بضاعتی میری نظروں کے سامنے لہرا گئی۔ میں نے خود کو لسانیات کے معاملے میں کبھی قابلِ ذکر نہیں سمجھا۔

بیگ صاحب کے مقالے کا ذیلی جزو "قواعد نویسی" بھی بہت معلومات افروز ہے۔ یہی کیفیت مضمون کی فصل (د) اطلاقی لسانیاتی تحقیق کی ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات میں تدریسِ زبان، اسلوبیات، لغت نویسی اور ترجمہ جیسے مفید موضوعات ہیں۔ مقالے کے آخری جملوں میں اردو کی علاقائی اور طبقاتی بولیوں کا مطالعہ کرنے والے چند محققین کا ذکر ہے۔ متن میں صرف بولیوں کے نام لیے ہیں، محققین اور ان کی کتابوں کا تذکرہ محض حاشیے میں ہے۔ یہ سب بجائے حاشیے کے، متن ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ اس میں دکنی کے سلسلے میں دو کتابوں کا اضافہ

ضروری تھا۔

۱۔ ڈاکٹر حبیب ضیا: دکنی زبان کی قواعد، کراچی ۱۹۶۹ء

۲۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی (مرتب): دکنی اردو بمبئی ۱۹۸۷ء۔ اس مجموعے کا آخری جزو لسانی مطالعے اور مسائل ہے جس کے تحت منجملہ دوسروں کے ڈاکٹر دلوی، مجھ ناچیز، مرزا خلیل بیگ اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کے مضامین شامل ہیں۔ میرا مضمون، دکنی کے لسانی رشتے، میرے مجموعے کھوج میں بھی موجود ہے۔

آخر میں صرف یہ کہوں گا کہ اردو لسانیات کی تاریخ پر بیگ کا یہ مقالہ اتنا سیر حاصل اتنا علم افروز ہے کہ گاگر میں ساگر کو بند کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ پورا مقالہ ایسے علمی لہجے میں لکھا گیا ہے کہ کہیں کوئی درشت کلامی نہیں، کسی کی تنقیص سے زبانِ خامہ کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھا مضمون "جدید صوتیات اور علمِ تجوید" ہے۔ اس کی ابتدا میں لسانیات کا یہ بنیادی مفروضہ درج کرتے ہیں۔

> "کسی زبان کے لسانیاتی مطالعے میں تقریر یا تکلم کو اولین حیثیت حاصل ہے یعنی اصل زبان وہ تصور کی جاتی ہے جو تقریری یا تکلمی ہوتی ہے ۔۔۔ تحریر یا تحریری زبان تکلمی زبان کی محض نمائندہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ صرف اس کی ترجمان یا نمائندہ ہوتی ہے، نہ کہ اصل زبان۔"
>
> (ص ۹۲)

مضمون کے دو بڑے حصے ہیں۔ ۱۔ جدید صوتیات ۲۔ علمِ تجوید صوتیات کا بیان جامع ہے لیکن میں دوسرے جزو سے مسحور ہوں۔ اسے چار نمبروں کے تحت ص ۱۰۴ تا ۱۲۵ پر سمیٹا ہے۔ اللہ اللہ! علم و فضل سے بھرپور یہ پر مغز بیان۔ اردو میں ایسی عالمانہ تحریریں زیادہ نہیں ملتیں۔ میرے لیے یہ ایک نئی دنیا ہے۔ میرا خیال ہے خلیل بیگ عربی کے طالب علم نہ رہے ہوں گے لیکن اس مضمون کو جس عارفانہ انداز سے لکھا ہے، قرآنی صوتیات کا بیان جس طرح جدید صوتیات کے آئینے میں کیا ہے، اسے دیکھ کر ان کے لیے دل سے دعائے خیر نکلتی ہے۔ اس کے

جز و(۴) کا افتتاح وہ اس کلیدی مشاہدے سے کرتے ہیں۔

"صوتیات اور تجوید میں بنیادی فرق یہ ہے کہ صوتیاتی مطالعہ 'صوت' کے تصور پر مبنی ہے جب کہ تجوید میں حرف کا تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔" (ص ۱۰۷)

اہل تجوید کی داد دیتے ہوئے، وہ لکھتے ہیں:

"جہر اور ہمس: قدما کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آج سے کئی سو سال قبل جہر اور ہمس کے فرق کو پہچان لیا تھا۔ انھیں صوتیاتی اصطلاح میں مسموع اور غیر مسموع آوازیں کہتے ہیں۔" (ص ۱۱۳-۱۱۲)

یہاں میں یہ توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں سب سے پہلے پاننی نے تقریباً پانچویں صدی ق م میں اس خصوصیت کو دریافت کیا جسے سنسکرت میں گھوش اور اگھوش کہتے ہیں۔ دیوناگری حروف ہجا کی ترتیب میں یہ واضح ہے۔

کتاب کے جز و ب لسانی مسائل کا پہلا مضمون "اردو، ہندی اور ہندوستانی" ہے۔ آزادی فکر وتقریر کے باعث اس موضوع پر مرزا خلیل بیگ اور میرے درمیان علمی اختلافات ہیں اور یہ زبان وادب میں جمہوریت کا مظہر ہے۔

مضمون کی ابتدا میں وہ نہایت مشہور لیکن بے بنیاد روایت درج کرتے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں ہندی کی موافقت اور مخالفت میں برابر ووٹ آئے اور صدر کے کاسٹنگ ووٹ کی مدد سے ہندی کو سرکاری زبان بنایا گیا۔ اس موضوع کی بہترین تحقیق ہائنڈل برگ، جرمنی کے ادارے کی مس کیرن ڈمر کی ہے۔ جس کا اردو ترجمہ رسالہ جامعہ دلی بابت مارچ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ میں نے اس ترجمے اور بعض دوسرے مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے مضمون لکھا "دستور ساز اسمبلی اور ہندی سرکاری زبان" جو میرے مجموعے کھوج میں شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کو کسی بحث کے بغیر سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا، ہندی اور انگریزی اعداد کے بارے میں ووٹنگ ہوئی۔ دونوں کو برابر ووٹ ملے۔ آخر ہندی کے وکیلوں نے انگریزی

اعداد کو تسلیم کرلیا۔

خلیل بیگ اپنے مضمون "اردو، ہندی اور ہندوستانی" میں میرا ایک جملہ نقل کرتے ہیں:

"ہندوستان کے آئین میں اردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے
درج کرنا سیاسی مصلحت ہے، لسانی حقیقت نہیں۔"

اور پھر کہتے ہیں کہ امرت رائے نے اسی جملے کی بنیاد پر اپنی انگریزی کتاب میں اردو کے خلاف گل افشانی کی (ص ۱۳۰)۔

بیگ صاحب کا خیال ہے کہ میرا مضمون پڑھنے سے پہلے زبان کے مسئلے پر امرت رائے کا ذہن ایک کورا کاغذ تھا جس پر میرے جملے کے عکس ہی نے کچھ فاسد نقوش ثبت کیے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ امرت رائے عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، پریم چند کے بیٹے ہیں، الٰہ آباد جیسے ہندی کے مرکز میں رہ کر زبان کے معاملے میں ان کے نظریات پختہ ہو چکے تھے، میں انھیں کیا گمراہ کرتا۔ انھیں ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکادمی کا ہندی کا انعام ملا تھا، مجھے اس کے ۲۰ سال بعد ۱۹۸۲ء میں اردو کا انعام ملا۔ ۱۹۶۲ء تک تحقیقی مقالے 'اردو کی نثری داستانیں' کے علاوہ میری اور کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔

پھر بھی میں نے حقیقت جاننے کے لیے لکھنؤ سے الٰہ آباد فون کر کے دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۵ء میں یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی مانگ کی جارہی تھی۔ انھوں نے اسی سال ہندی کے کسی اشتراکی رسالے 'مکت دھارا' میں اس مانگ کی مخالفت کی۔ میرے نام اپنے مکتوب مورخہ ۱۷۔ اگست ۱۹۹۵ء میں انھوں نے مزید لکھا۔

"آپ کی کسی بات سے مجھے اپنی کتاب A House Divided لکھنے کی تحریک ہوئی، اس سے زیادہ جھوٹی اور بے بنیاد بات دوسری نہیں ہو سکتی۔ آپ کو معلوم ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ اپنی اس تحقیق کے لیے مجھے نہرو فیلو شپ دی گئی تھی۔ وہ مجھے عطا ہوئی وسط ستمبر (۱۹۷۷ء) میں۔ اس سے چار سال قبل میری ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام ہے، 'آدھنک بھاؤ بھید کی سنگیا'۔ اس میں میرے دو دستاویزی مضامین اپنڈکس میں چھپے ہیں۔

ایک کا عنوان ہے 'سامپروایکتا کا سوال' اردو جھمیتر یہ بھاشا کی مانگ' یعنی علاقائی زبان کا مطالعہ۔ اس میں وہ تمام باتیں ہیں جن سے ان صاحب کو اعتراض ہوگا۔ لہٰذا ان سے کہیے کہ وہ میرے اس مضمون کا مطالعہ کر کے اپنا اطمینان کر لیں۔ الغرض گردن زدنی میں ہوں، آپ کو کیوں پریشان کر رہے ہیں۔''

امرت رائے کے واضح بیان کے بعد بات صاف ہوگئی کہ میرا مضمون پڑھنے سے پہلے ہی انھوں نے اپنا موقف قائم کر لیا تھا۔

کیا اردو اور ہندی لسانیات کی رو سے دو زبانیں ہیں۔ بیگ صاحب اپنے مضمون ''جدید صوتیات اور علم تجوید'' کے ابتدائی حصے میں مان چکے ہیں کہ کسی زبان کے لسانیاتی مطالعے میں تقریر یا تکلم کو اولین حیثیت حاصل ہوتی ہے، تحریری زبان اس کی محض نمائندہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اردو ہندوستانی کے مضمون میں لکھتے ہیں۔

''بول چال کی سطح پر دونوں زبانوں میں بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا لیکن اگر غور کیا جائے تو بول چال کی سطح پر بھی دونوں زبانوں میں صاف فرق موجود ہے۔'' (ص ۱۳۰)

مجھے اس مبینہ فرق سے اتفاق نہیں۔ کیا یہ فرق اتنا واضح ہے کہ اردو ہندی کی بول چال کو مختلف زبانیں تو درکنار، مختلف بولیاں بھی قرار دینے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور شعبۂ ہندی کے اساتذہ کی بول چال یا دلی و یوپی کے ہندو مسلم کسان مزدوروں کی بولی کا مقابلہ کر کے دیکھیں کہ کیا وہ مختلف زبانیں یا مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک ہی زبان اور بولی کا استعمال کرتے ہیں، مردم شماری میں ہندوؤں کی زبان ہندی اور مسلمانوں کی زبان اردو لکھی جاتی ہے۔ میں سفارش کروں گا کہ وہ ایک بار پھر میرے متن مضامین کو غور سے پڑھیں۔

۱۔ اردو ہندی یا ہندوستانی مشمولہ 'حقائق'

۲۔ اردو ماضی، حال اور مستقبل مشمولہ 'کھوج'

۳۔ اردو ہندی کا تعلق، ایک ذاتی وضاحت۔ مشمولہ 'سہیل گیا' بابت دسمبر ۸۹ء نیز معلم اردو

لکھنؤ دسمبر ۸۹ء۔ افسوس کہ یہ مضمون میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔

اس زمرے کا دوسرا مضمون "اردو اور ہندی کا سماجی لسانیاتی تناظر" بہت اہم اور مفید ہے۔ اس میں اردو، ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے بولنے والوں کے جو اعداد و شمار دیے ہیں وہ اس تفصیل اور صراحت کے ساتھ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئے۔ اگلا مضمون "اردو و مراٹھی کا لسانیاتی رشتہ" ہے۔ میں نے بھی اپنے مضمون "دکنی کے لسانی رشتے" مشمولہ 'کھوج' میں اس موضوع پر لکھا ہے (ص ۳۲۲ تا ۳۲۸)۔ خلیل صاحب نے اس زمرے کا آخری مضمون "اردو زبان پر برج کے اثرات" لکھا ہے۔ اس میں وہ زیادہ تر ڈاکٹر مسعود حسین خان کی کتاب مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو تک محدود رہے ہیں جب کہ محمود شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' میں نیز شوکت سبزواری نے اپنی کتاب 'داستانِ زبان اردو' میں اردو اور برج کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

کتاب کا زمرہ ج، لسانی فکر، ہے۔ اس کا پہلا مضمون "سرسید احمد خاں کی لسانی پالیسی" ہے۔ اس مضمون میں مقالہ نگار نے جہاں اس بات کو سراہا کہ سرسید مسلمانوں میں انگریزی زبان کا فروغ چاہتے تھے وہاں انھوں نے جرات سے کام لے کر قدم قدم پر اس کی بھی نشان دہی کی کہ سرسید اردو بلکہ کسی مشرقی زبان کو مغربی علوم کی تحصیل کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے۔

> "یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ سرسید دیسی زبانوں یا اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا محض یہ خیال ہی نہیں بلکہ یقین بھی تھا کہ دیسی زبان کے ذریعے اعلیٰ تعلیم دینا ناممکن ہے۔"
> (ص ۱۶۷)

حیرت ہے کہ سرسید تعلیم کے باب میں اپنی زبان کو کس چشم کم سے دیکھتے تھے۔ ان کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

> "ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم اور دیسی زبان

اور دیسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت، حشمت و حکومت حاصل کریں گے، بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی امریکا کے اصل باشندوں کو خیال دلائے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں (جو کچھ کہ ہوں) ترقی کر کے اپنی حکم راں قوم میں عزت و دولت، حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔"(۱)

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عام تعلیم کے لیے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیلی اور دیہاتی مکتبوں میں محدود رہنی چاہیے۔"(۲)

ڈاکٹر نذیر احمد کو ناول نگار یا دینی مصنف کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ خلیل بیگ نے اپنے مضمون "ڈپٹی نذیر احمد بحیثیت زبان داں" میں ان کی ایک نرالی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ تحقیقی کتابوں میں نذیر احمد کی قواعد و لغت کی کتابوں کے نام تو مل جاتے ہیں، تفصیل نہیں ملتی۔ بیگ صاحب نے ان کتابوں نصاب خسرو، ضرب صغیر رسم الخط اور ما لابد منہ فی الصرف کا تعارف کرایا جن میں دوسری اور تیسری کتاب پر تفصیل سے لکھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ خلیل بیگ کے مضمون کو پڑھنے سے قبل میں نذیر احمد کی ان کتابوں سے واقف نہ تھا۔

"پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور لسانی تحقیق" ۳۶ صفحوں کا مفصل مضمون ہے۔ ساہتیہ اکادمی ہندوستانی ادب کے معمار سلسلے میں ڈاکٹر بیگ کا کتابچہ "پنڈت برج موہن و تاتریہ کیفی" ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس طرح بیگ کیفی کے سب سے بڑے محقق اور ماہر ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں کیفی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوگا وہ مستند ہونا چاہیے۔ وہ کیفی کی روایت پر چندر بھان برہمن سے منسوب غزل "ڈالا ہے، پیالا ہے" درج کرتے ہیں۔ کئی مصرعوں میں ان کا مکتوبہ متن صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ بعض محققین اس غزل کا برہمن سے انتساب مشکوک یا غلط مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی: علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۳۶۳۔

۲۔ ڈاکٹر ہاشمی: دلی کا دبستان شاعری (لکھنؤ ۱۹۶۵ء) ص ۵۶۔

۳۔ رشید حسن خاں: ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ ص ۲۶۷۔

اردو کی عام روایت ہے کہ کوئی تحقیق یا نقاد کسی ادیب پر مضمون یا کتاب لکھتا ہے تو خود کو اس کا وکیل صفائی مقرر کر لیتا ہے اور اس کی محض غیر مدلل مداحی کرتا ہے۔ مرزا خلیل بیگ اس عیب سے مبرا ہیں۔ انھوں نے کئی جگہ کیفی سے اختلاف بھی کیا ہے۔ کیفی نے لکھا تھا کہ بھینس کا لفظ اس کی آواز، بھیس بھیس، سے بنا اور اس مادے سے اس کا مذکر بھینسا بنایا گیا۔ ماہر لسانیات خلیل بیگ نے توجہ دلائی کہ سنسکرت میں مہش (ش مفتوح) بھینسے کو کہتے ہیں جو اصل لفظ ہے۔ اس سے اس کا مونث مہش (ش مکسور) بہ معنی بھینس بنا (ص ۲۰۶)۔ بیگ نے کیفی کے لسانی بیانات کا تفصیل سے بے لاگ جائزہ لیا ہے، نہ ان کی تحسین میں بخل کیا ہے، نہ حسب ضرورت ان سے اختلاف کرنے میں تامل کیا ہے۔

قاضی عبدالغفار کی شہرت ان کے ناول ''لیلیٰ کے خطوط'' کی وجہ سے ہے۔ خلیل صاحب نے اپنے مضمون ''قاضی عبدالغفار اور اردو تحریک'' میں دکھایا کہ قاضی صاحب اس تحریک کے کتنے فعال سالار تھے۔ اس مضمون سے تقسیم برصغیر کے بعد اردو تحریک کے ابعاد و مسائل واضح ہو جاتے ہیں۔ اس زمرے کا آخری مضمون ''پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریۂ زبان اردو'' ایک شاگرد کی طرف سے اپنے استاد کے لیے ہدیۂ عقیدت ہے۔

کتاب کے زمرہ (د) زبان اور رسم خط کا پہلا مضمون ''اردو رسم خط کی معیار بندی کی ضرورت'' بہت مفصل اور فکر انگیز ہے۔ اس میں انھوں نے لسانی نقطۂ نظر سے اردو حروف کے آزاد اور ترکیبی ادب کی قسموں سے بحث کی ہے۔ انھوں نے کئی حروف کی ترکیبی بلکہ مفرد شکل میں بھی ترمیم کی جو سفارشیں کی ہیں مجھے ان سے اتفاق نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ی اور ن کو ب گروپ کے حرفوں میں شامل کر کے ن لکھا جا سکتا ہے (ص ۲۵۲)۔ اسی طرح وہ دوسری کئی ترکیبی شکلوں کو منسوخ یا ترمیم پذیر کرنا چاہتے ہیں مثلاً وسطی اور آخری ع اور غ کے منھ کو کہ وہ بائیں سمت کے بجائے دائیں طرف کو کھولنے کی سفارش کرتے ہیں۔ جیسے

بعد (بعد)، شمع (شمع)، نغمہ (نغمہ)، بالغ (بالغ) (ص ۲۵۹)

اس موقع پر مجھے اپنے چھوٹے لڑکے کے مشاہدے کی یاد آجاتی ہے۔ وہ سنٹرل اسکول جموں میں شاید ساتویں درجے میں ابتدائی اردو پڑھتا تھا۔ اس نے اردو تحریر پر دو اعتراضات کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

ا۔ بعد کے "ع" کا منھ دائیں کے بجائے یا بائیں طرف کو کیوں کھولا جاتا ہے؟

۲۔ خدا، جدا میں دال کہاں لکھا گیا ہے، یہ تو 'ر' ہے۔

میرے پاس ان سوالوں کا جواب نہ تھا۔ بیگ صاحب حروف کی معیار بندی کی خاطر جو تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں ان کو ص ۲۶۔۲۶۵ پر یک جا درج کر دیا ہے۔ وہ ل کی تحریری شکل کو اردو حروف تہجی سے خارج کرنا چاہتے ہیں، ف اور ق میں صوری یکسانیت لانا چاہتے ہیں وغیرہ۔ ان کی تجاویز دیکھ کر میرے ہوش پراں ہوئے جاتے ہیں۔ زندگی زبان' تلفظ اور املا کوئی بھی پوری طرح معقولیت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے کہ رسم تحریر میں معقولیت نہیں، روایت کا سکہ چلتا ہے۔ حروف کی شکلوں میں کوئی بھی ترمیم نا قابل عمل ہے۔ یہ رسم خط مراقش سے ملیشیا تک مستعمل ہے۔ کہاں کہاں تبدیلی کی جائے گی۔ پھر قدیم و جدید تحریروں کا اب تک کا لامتناہی سرمایہ کون سا مقتدرہ یہ تبدیلیاں نافذ کرا سکے گا۔

وہ ص ۲۶۲ اور دوسری کئی جگہوں پر واؤ لین اور یائے لین مثلاً پودا، پیدا کو دوہرے مصوتے (Diphthong) قرار دیتے ہیں۔ میری رائے میں موجودہ تلفظ میں یہ ہرگز دوہرے مصوتے نہیں۔ ان کا ارتقا دوہرے مصوتوں آؤ اور آئی سے ہوا ہے لیکن یہ اب پوری طرح مفرد مصوتے ہیں۔ امریکی چارٹ کے مطابق ان کا نشان اور مخرج یہ ہے۔

واؤ لین Lower Mid Rounded

یائے لین ع Lower Mid Unrounded (عام لسانیات ص ۱۱۱)

اگلے مضمون "اردو رسم خط، تدریسی نقطۂ نظر" میں وہ پھر انھیں تبدیلیوں کی سفارش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لسانیاتی طریقے سے اردو خط سکھانا آسان ہو۔

آخری زمرہ تدریس زبان ہے جس میں دو مضمون ہیں۔ میں اس موضوع کا نہ کوئی تجربہ

رکھتا ہوں نہ علم، اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ ص ۳۰۶ پر اردو سیکھنے کے محرکات کا شمار کراتے ہیں۔ میں ان میں ایک اور محرک کا اضافہ کرتا ہوں جس کا تعلق میری ذات سے ہے۔

۱۔ سنٹرل اسکول جموں میں مڈل جماعتوں میں ایک اردو کو ایک Additional option کے طور پر رکھا گیا۔ جو طالب علم اسے لیتا اور پاس ہوتا اس کے نمبر نتیجے میں شامل کیے جاتے تھے۔ جو اس حشو مضمون کو نہ لیتا اس کے نتیجے پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا۔ ۲۰ سال پہلے کی بات ہے میرے لڑکے نے اردو لی۔

۲۔ میرا پوتا ۱۹۹۳ء سے ڈون اسکول، دہرہ دون میں پڑھتا ہے۔ وہاں چار سال تک ایک زبان مثلاً فرنچ یا اردو وغیرہ کا درس لینا لازمی ہے۔ میرے پوتے نے اردو لی ہے۔

میرے بیٹے اور پوتے دونوں کا محرک صرف یہ جذباتی رشتہ ہے کہ ان کا باپ یا دادا اردو کا استاد ہے اس لیے انھیں اردو پڑھنی چاہیے۔ میرا پوتا چار سال تک اردو پڑھ کے کافی سیکھ جائے گا۔

خلیل بیگ جدید ترین لسانی طریق تعلیم کو مد نظر رکھ کر کہتے ہیں۔

۱۔ جب تک طلبہ کو زبان کے سننے (سمجھنے) اور بولنے پر قدرت حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک انہیں لکھنا، پڑھنا نہیں سکھانا چاہیے۔ (ص ۳۱۴)

۲۔ زبان کی تدریس کو رسم خط کی تدریس کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ زبان کی تدریس زبان کے سننے (سمجھنے) اور بولنے کی تدریس سے عبارت ہے جب کہ رسم خط کی تدریس پہلے سے سیکھی ہوئی زبان کی صوری نمائندگی کرنے والی علامات کی شناخت کی تدریس ہے اسی لیے رسم خط یا پڑھنے اور لکھنے کی تدریس کو تدریس زبان کے نصاب کے دوسرے حصے میں شامل کرنا چاہیے۔ (ص ۳۱۵)

میرا خیال ہے کہ اس طریقے کو Direct Method کہتے ہیں۔ بچے اسی طرح زبان سیکھتے ہیں۔ اہل لسانیات اسی طریقے سے زبان کو جلدی سکھا دیتے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی امریکی اردو سیکھنی چاہیے تو مختلف الفاظ کو لکھے بغیر کیونکر یاد رکھ سکتا ہے یا فرض کیجیے

مجھ جیسا بڈھا طوطا فرنچ زبان سیکھنا چاہے تو تحریر کی مدد لیے بغیر متعدد الفاظ کو اپنے ضعیف حافظے میں کیونکر محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اس کتاب میں خلیل صاحب نے مختلف مضامین میں ادیبوں کی ولادت و وفات کے سنین درج کیے ہیں۔ یہ تحقیق ادب کی کتاب نہیں۔ اس میں سنین کا دینا غیر ضروری تھا۔ سنین درج کرنا بہت مخدوش ہے بالخصوص سنہ ولادت کا درج کرنا۔ بیگ صاحب کے مندرجہ سنین میں کثرت سے تصحیح کی ضرورت ہے۔ اطناب کے خوف سے میں قطع کرتا ہوں۔

خلیل صاحب رسم خط اور تدریس زبان کے مضامین خالص جدید ماہر لسانیات کے روپ میں سامنے آتے ہیں ورنہ پیشتر کے بھی مضامیں وہ اس ڈکشن میں بات چیت کرتے ہیں جس سے اہلِ ادب کماحقہٗ آشنا ہیں۔ شکر ہے کہ اس کا لہجہ کہیں جارحانہ یا مناظرانہ نہیں۔ اس مجموعے کے مضامین عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ادیبانہ دلچسپی کے بھی امین ہیں۔ کہا جاتا اسلوب قلم کار کی ذات ہے۔ مرزا خلیل بیگ جس طرح خندہ رو اور خوشگوار بشرے کے مالک ہیں وہی رنگ ان کی نگارشات کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر قاری لسانی تناظر کی سیر کر کے خوش وقت بھی ہوگا اور مستفید بھی۔

حواشی

۱۔ تہذیب الاخلاق ص ۳۔۱۳۲ مشمولہ علی گڑھ تحریک، مرتبہ نسیم قریشی ص ۳۶۳

۲۔ تہذیب الاخلاق بابت ۱۸۸۱ء ص ۱۳۸ بحوالہ علی گڑھ تحریک

☆

جلیل مانک پوری: مسائل زبانِ اردو

مولف وناشر: عزیز احمد جلیلی

۱۹۸۳ء، ۹۶ صفحات، قیمت ۱۲ روپے

صحتِ زبان سے غفلت کے موجودہ دور میں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو زبان کے صحیح معیار کو ضبطِ تحریر میں لا کر محفوظ کر سکیں تا کہ عامۃ الناس اردو کا صحیح روزمرہ جان سکیں۔ حضرت عزیز احمد جلیلی نے اپنے والد مرحوم فصاحت جنگ (فصاحت کے ساتھ جنگ کیا معنی؟) جلیل مانک پوری کے خطوط سے ایسے اشارے تلاش کیے جن میں شاگردوں اور عقیدت مندوں کی رہبری کے لیے زبان کا کوئی نکتہ پیش کیا گیا تھا۔ عزیز احمد صاحب نے انھیں سوال جواب کی شکل میں مرتب کر کے یہ مختصر کتابچہ تیار کیا ہے جس پر بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر کا اطلاق ہوتا ہے۔ حسن الدین احمد نے ایک مختصر پیش لفظ لکھا ہے، جسے 'حرف اخلاص کا پر خلوص' کا پر خلوص عنوان دیا ہے۔ پیش لفظ میں انھوں نے اردو میں صحیح زبان، تذکرہ تانیث اور تاریخ گوئی سے متعلق کتابوں کا شمار کرایا ہے، جو تشنہ ہونے کے باوجود بہت مفید ہے۔

اردو میں دلی اور لکھنؤ میں محاورے اور روزمرہ کا فرق ہے۔ ان شہروں کی لسانی قلم رو دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ تمام مغربی یوپی، دلی کی زبان کا تابع ہے اور تمام اودھ لکھنؤ کا مقلد۔ جلیل مانک پوری لکھنؤ سے دور ضلع پرتاپ گڑھ کے قصبہ مانک پور کے رہنے والے تھے۔ وہ لکھنؤ کی زبان کے پیرو ہیں۔ میرا وطن مغربی یوپی کا قصبہ سیوہارہ، ضلع بجنور ہے، جو دلی سے تقریباً سو میل پورب میں ہے۔ یہ قصبہ دلی کی لسانی قلم رو میں ہے۔ اس طرح جلیل اور میں مختلف لسانی

دبستانوں کے پیرو ہیں۔ ذیل میں رسالے کے مشمولات کے بارے میں کچھ مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلا سوال علامتِ فاعل 'نے' کے بارے میں ہے۔ اس کتاب میں دیکھنے پر مجھے پہلی بار منکشف ہوا کہ 'نے' ہمیشہ فعلِ ماضی کے جملے میں آتا ہے، حال و استقبال میں نہیں۔ کیسی سامنے کی بات ہے لیکن کبھی دھیان نہیں کیا۔ 'نے' فعلِ متعدی ہی میں آتا ہے لیکن بہ قول جلیل لانا، بولنا، بھولنا، اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جلیل نے اسی طرح تفصیل سے اس کے استعمال کے ضوابط لکھے ہیں۔

جمع بنانے کے قاعدوں میں ان الفاظ کا بھی ذکر کیا ہے جن کے آخر میں 'ع' آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جس لفظ مذکر کے آخر میں 'ع' ہو اس کی جمع کے لیے حرف ماقبل کے فتحے کو کسرہ سے بدلیے جیسے مصرع سے مصرِع، مرقع سے مرقِع وغیرہ۔ بعض لوگ مرقعے اور مصرعے لکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔'' ص ۴۹

سند کے لیے نوازش اور شعور کے دو شعر لکھے ہیں جن کے متعلقہ مصرعے یہ ہیں: ع

ع ابرو کا وصف دیکھا تو مصرِع چمک گئے
(نوازش)

ع چمن میں کیاریاں ہیں یا مرقِع ہیں حسینوں کے
(شعور)

رشید حسن خاں نہ صرف جمع کی شکل میں بلکہ واحد کے املے میں بھی مصرعے، مطلعے لکھتے ہیں۔

مثلاً:

پہلے مصرعے میں (ادبی تحقیق، اور تجزیہ ص ۱۸۸)

مطلعے میں تسلی اور معنی کے قوافی آئے ہیں (ایضاً ص ۱۹۲)

اس مصرعے میں		(ایضاً ۱۹۵)

مالک رام صاحب کا بھی یہی شیوہ ہے۔ مثلاً:

مطلعے میں،(دیباچہ گل رعنا۔ ۱۹۷۰ء ص ۳۳)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کلیات ذوق میں جمع کی شکل میں مطلعے لکھا ہے (دلی ۱۹۸۰ء۔ ص ۱۲)

میں نے یہ قاعدہ وضع کیا تھا کہ واحد کی شکل میں ع کے ماقبل کسرہ لکھ کر امالے کا کام لیا جائے۔ لیکن جمع کی شکل میں مصرے، مطلعے لکھنا چاہیے (ذکر و فکر۔ ص ۸۔۱۷۷)

جلیل کی ہدایت دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے ان کے قول سے کامل اتفاق ہے۔ واحد کے امالے اور جمع کے صیغے دونوں میں ان الفاظ کا تلفظ یکساں ہوتا ہے۔ مثلاً:

پہلے مصرع میں سکتہ ہے۔

دونوں مصرعے موزوں ہیں۔

دونوں جگہ ہم اس لفظ کو مص + رے (بروزن فعلن) بولتے ہیں۔ مصرے لکھ کر جو تلفظ حاصل ہوتا ہے وہ مص + رے (بروزن مٹ رہے یا فاعلن) ہے۔ تلفظ مقصود مص + رئے ہے۔ اس لیے جمع کی شکل میں بھی اسے مصرع لکھنا ہی ٹھیک ہے، مصرے لکھنا غلط۔ ع ماقبل مکسور سے ضروری تلفظ حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً 'قانع' میں اسی کی مماثلت پر مصرع لکھ کر امالے نیز جمع کا تلفظ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ترقی اردو بورڈ کے املا نامہ میں اس مسئلے پر کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ کوشش کروں گا کہ جلیل کا اصول مان لیا جائے تب میں بھی مصرے لکھنا ترک کر دوں گا۔

جمع ہی کے سلسلے میں ایک اہم اصول یہ بتایا جاتا ہے کہ گھنٹہ، ہفتہ، مہینہ، سال، گھڑی جیسے الفاظ کے ماقبل جمع کے اعداد آئیں تو بھی ان کی جمع 'وں' سے نہیں کی جاتی، واحد ہی مستعمل ہوتے ہیں۔ مثلاً چار گھنٹے۔۔۔ پانچ سال سے۔۔۔ چھ روز کے لیے۔۔۔ دو مہینے تک (ص ۳۵)

اب بات صاف ہو گئی ۔ دو ہفتوں تک، چار مہینوں تک، کہنا غلط ہے ۔ یہاں ہفتے اور مہینے ہی صحیح ہے جو دراصل صیغہ واحد کی امالے دار شکل ہے۔

لیکن میں ہر جگہ حضرت جلیل سے اتفاق نہیں کرتا۔ کسی لفظ کے بعد حرف حصر 'ہی' کی وہ یہ شکلیں طے کرتے ہیں۔

میں ہی، ہمیں، تو ہی، تمھیں، وہی، یہی، اسی، ہی، انھیں، انھیں ۔ (ص ۴۸ ـ ۴۷)

مجھے صرف پہلے صیغے کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ جلیل کی چند مثالیں:

ل میں ہی نے ابھارا تھا اسے قتل پہ لیکن　　فہرست جو نکلی تو مرا نام نہیں ہے (جلیل)

ب۔　زید پر ہی کام کا دارومدار ہے۔

ج۔　عمر ہی سے یہ بات سنی گئی۔

'میں ہی نے' کتنا بھونڈا اور غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ 'میں نے ہی' کہا جائے تو کان اور مذاق پر گراں نہ گزرے۔ بقیہ دو مثالوں میں جلیل نے حروف جار اور حرف حصر 'ہی' کے وقوع میں یکسانی نہیں برتی۔ لیکن جھگڑا دہلی اور لکھنؤ کا ہے۔ مقالات طباطبائی میں طباطبائی لکھتے ہیں:

'ہی' کا استعمال اہلِ دہلی اس طرح ہی کرتے ہیں کہ حروف معنویہ کے بعد اُسے لے آتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ہی لکھا، تم نے ہی پڑھا، اس نے ہی سنا۔ اہلِ لکھنؤ ہمیشہ (ہی) کو مقدم کر کے کہتے ہیں۔ ہمیں نے لکھا، تمھیں نے سنا، اسی نے پڑھا۔ یہ مثلاً وہ کہیں گے 'دل کی دل میں ہی رہی' اور یہ کہیں گے 'دل کی دل ہی میں رہی' ۔ (۱)

جلیل نے اسی اصول کے تحت 'میں ہی نے' باندھا ہے۔

میں دہلی کا رہنے والا نہیں لیکن دلی کی لسانی قلم رو کا باشندہ ہوں۔ میں 'ہمیں، تمھیں' اسی بولتا ہوں اور یقینی ہے کہ دلی میں بھی یہی رواج ہوگا۔ میں 'زید پر ہی' کے بجائے 'زید ہی پر' کو

ترجیح دوں گا۔

ایک موقع پر فاضل مرتب عزیز احمد صاحب حضرت جلیل کے اصول کو صحیح نہیں لکھ پائے۔ 'ہی' کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

اسی طرح تو ضمیر واحد مخاطب کے ساتھ اور تم ضمیر جمع مخاطب کے ساتھ 'ہ' 'ی' نون مستعمل ہے۔ (ص ۴۷)

ان کی مراد ہے کہ تو ہی اور تم ہی کے بجائے 'تو ہیں' اور تمھیں مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن جلیل کی مراد 'تو ہیں' کو ترجیح دینے کی نہ ہوگی۔ مثال کے شعر میں مصرع ہے۔

تو ہی ہر سو نظر آتا ہے مجھے

اس کے معنی ہیں کہ مرتب نے 'تو' کے ساتھ 'ہیں' کے اضافے کی بات تجویز کر کے سہو کیا۔

مجھے جلیل کے اس اصول سے اتفاق ہے کہ 'نہیں معلوم' کے معنی میں 'جانے' کافی نہیں۔ کیا جانے یا نہ جانے کیا' کہنا چاہیے۔ (ص ۵۶)

'پر' کے مخفف 'پہ' کے بارے میں ارشاد ہے:

''پر طرف کی علامت کی جگہ 'پہ' کا استعمال بول چال میں تو نہیں ہے لیکن شعر میں بلا تکلف کہا جاتا ہے اور جائز ہے۔'' (ص ۷۰۔۷۱)

اگر شعر میں جائز ہے تو بول چال میں کیوں نہ ہوگا۔ داغ کے چند تاسے تک میں ہے۔ ع کام کا قطعہ ہے یہ، وقت پہ کام آئے گا۔ میں 'پہ' بولتا ہوں اور دوسروں سے بھی سنا ہے۔ اس کے تلفظ کے بارے میں جلیل لکھتے ہیں:

''جو لوگ 'پہ' کو زیر کے ساتھ کہتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔ زبان کے بالکل خلاف ہے۔'' (ص ۷۱)

پہ بہ زبر صرف مشاعروں میں سننے میں آتا ہے۔ بول چال میں میں نے ہر جگہ زیر کے

ساتھ سنا ہے۔ نظم طباطبائی کہتے ہیں:

"پر کا مخفف لکھنؤ میں 'پَہ' ہے، دہلی کے لہجے میں 'پِہ'۔"

(مقالاتِ طباطبائی۔ ص ۲۱۹)

یعنی دلی میں پہ زیر کے ساتھ ہے، لکھنؤ میں زبر کے ساتھ لیکن میرا مشاہدہ یہ ہے کہ میں نے کبھی لکھنؤ الٰہ آباد میں بھی زبر کے ساتھ نہیں سنا بجز مشاعروں کے اور وہاں بھی یہ بالکل مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔

ایک سوال ہے۔

"یہ اہلِ ہنود کی عبادت گاہ ہے، کیا یہ جملہ صحیح ہے؟"

جواب۔ "یہ جملہ درست ہے۔ ہنود کو اہلِ ہنود بھی کہتے ہیں۔" (ص ۷۲)

ہندو فارسی لفظ ہے۔ اس کی عربی قاعدے سے جمع ہنود بنانا غلط۔ پھر اس پر اہل کا اضافہ غلط در غلط۔ کیا اہلِ مسلماناں، اہلِ پارساں، اہل مسیحاں بولا جا سکتا ہے۔ ہنود اور اہلِ ہنود منشیوں اور مولویوں کی زبان ہے۔ یہ جہل در جہل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مساجد کے وزن پر ہندی لفظ مندر کی عربی جمع منادر بنا دی جائے اور اس پر صحت کا فتوئی دیا جائے۔

سوال۔ "تھی ایک بات تو یہ بھی مجھے جلانے کی، یہاں 'میرے' کا محل ہے یا مجھے کا؟"

جواب۔ "میرے جلانے کا کہنا چاہیے۔" (ص ۷۷)

میری رائے میں 'مجھے جلانے کی' اور 'میرے جلانے کی' دونوں صحیح ہیں' لیکن میں 'مجھے جلانے کی' کو ترجیح دوں گا۔ جلانے فعل متعدی ہے۔ اس کا مفعول 'مجھے' ہوگا۔ 'میرے' اردو میں مضاف الیہ کا صیغہ ہے۔ میرے جلانے میں 'جلانے' مضاف ہوگا۔ اس صورت میں 'جلانے' کو حاصل مصدر مان کر اس سے اسمِ مضاف کا کام لیا جائے گا۔ جیسے میری سوختگی، میری سوزش۔ بہتر صورت یہی ہے کہ 'جلانے' فعل کے ساتھ 'مجھے' مفعول کا صیغہ لایا جائے۔

سوال۔ "قامت اور بہشت تذکیر و تانیث میں مختلف فیہ ہیں۔۔۔ترجیح کس کو ہے مذکر کو یا مونث کو؟"

جواب۔ "دونوں صورتیں درست ہیں۔ترجیح مذکر کو ہے۔" (ص ۷۸)

قامت کی حد تک تذکیر کی ترجیح درست ہے لیکن میری رائے میں بہشت محض مونث ہے، مذکر نہیں۔فرہنگ آصفیہ میں بھی مذکر ہی دیا ہے۔

سوال کیا گیا کہ کیا جمع کی صورت میں 'چاہیے' کی جمع 'چاہئیں' لکھنا درست ہے۔جیسے چار کتابیں چاہئیں۔جواب دیا گیا۔

"واحد اور جمع دونوں حالتوں میں چاہیے کہنا کافی ہے۔" (ص ۸۴)

مجھے 'چاہیے' میں واحد کی بو آتی ہے۔کتابیں چاہیے' میں تعداد کا شتر گربہ دکھائی دیتا ہے۔ میں تو 'کتابیں چاہئیں' کہوں گا لیکن کتابیں چاہیے' کو غلط نہیں کہوں گا۔جس کا جی چاہے 'چاہیے' کو جمع کے طور پر استعمال کرے۔

تاریخ میں ہمزہ کے عدد لیے جائیں یا نہیں۔اس کے بارے میں جلیل کے بیان میں خلفشار ہے۔مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"لکھنؤ میں ہمزہ اوپر سے لکھ دیا جاتا ہے اس کا کوئی عدد محسوب نہیں ہوتا۔" (ص ۹۴)

پھر کہتے ہیں:

"لکھنؤ کا ہمزہ عدد میں شمار نہیں ہوتا لیکن اگر نون کے بعد شوشہ لکھنؤ لکھا جائے تو ایسی صورت میں دس عدد لیے جائیں گے اور شوشہ نہ ہو تو کوئی عدد نہ کیا جائے۔" (ص ۹۵۔۹۶)

لکھنؤ میں ہمزہ کا شوشہ ہمیشہ لکھا جاتا ہے۔ہمزہ کے بغیر اس شہر کا تلفظ لکھ+نو (بروزن مجنو) پڑھا جائے گا۔

غرض یہ ہے کہ اس مختصر رسالے سے زبان کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔کئی مقامات ایسے ہیں جہاں جلیل کے فیصلوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا لیکن غور کرنے کا سامان تو

ملتا ہے۔ انھوں نے صرف لکھنؤ کے روزمرہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ کاش وہ نظم طباطبائی کی طرح لکھنؤ اور دلی دونوں کے استعمال کی وضاحت کر دیتے تو عدل کا حق ادا ہو جاتا۔

(سیاست حیدرآباد۔ ۲۰ فروری ۸۴ء

پرکھ اور پہچان)

حواشی

۱۔ مقالات طباطبائی مرتبہ ڈاکٹر اشرف رفیع (حیدرآباد ۱۹۸۴ء) ص ۲۲۰

☆

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ: اردو زبان کی تاریخ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بعد کی نسل میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اردو کے سب سے ممتاز ماہر لسانیات ہیں۔ یہ ان ماہرین میں نہیں جن کا پہلا عشق ادبیات سے ہے، جو عمر بھر دیار ادب میں رہبری کرتے رہے اور ضمناً لسانیات کے مضافات میں جا دھمکے۔ خلیل بیگ لسانیات کے طالب علم، استاد اور اہلِ کتاب رہے ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ ایک مقتدر تالیف ''اردو زبان کی تاریخ'' ہے جسے ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ اس کا انتساب اردو کے سب سے بڑے ماہر لسانیات اور محقق پروفیسر مسعود حسین خاں کے نام ہے۔

یہ کتاب ۱۸ مضامین کا مجموعہ ہے جو چار حصوں پر منقسم ہے۔

۱۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کے نظریے۔ ۲۔ اردو کا آغاز و ارتقا۔ ۳۔ دکنی اردو۔ ۴۔ اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ۔

پہلے اور دوسرے حصے کی بنائے تقسیم واضح نہیں۔ ایک میں ابتدا اور ارتقا ہے، دوسرے میں آغاز و ارتقا۔ ابتدا اور آغاز ہم معنی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دوسرے حصے میں ارتقا پر زیادہ زور ہے، اسی لیے جزئیات پر اور نمونے دینے پر توجہ کی گئی ہے۔ پہلے دو حصوں میں چار چار مضامین ہیں، بعد کے دو حصوں میں پانچ پانچ۔ ہر حصے کے آخر میں مرتب خلیل بیگ کا مضمون ہے، اس سے پہلے دوسروں کے۔ اس طرح ۱۴ مضامین دوسروں کے ہیں، چار مرتب کے۔ انھوں نے یہ نشان دہی نہیں کی کہ دوسروں کا مضمون کہاں اور کب شائع ہوا اور انھوں نے کس ماخذ سے لیا

ہے۔ قاری کو مضمون کے اولین زمانہ اشاعت کا علم ہو تو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ مضمون میں کون کون سی تازہ ترین معلومات نہیں ہوں گی۔

کتاب کی ابتدا میں 'تعارف' کے عنوان سے مرتب کا پیش لفظ ہے جس میں انھوں نے مجھ معصوم لسانیات کو جو اہمیت دی ہے اسے پڑھ کر میں شرمندہ ہوا۔ مجھے ان کی یہ صراحت ایک انکشاف معلوم ہوئی۔

> ''شوکت سبزواری اور گیان چند جین کے نظریے میں فرق صرف اتنا ہے کہ شوکت سبزواری اردو کا وجود پہلے اور کھڑی بولی کا وجود بعد میں بتاتے ہیں جب کہ گیان چند جین پہلے کھڑی بولی کا وجود بتاتے ہیں پھر اردو کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور یہی صحیح بھی ہے۔'' (ص ۱۲)

خلیل صاحب کے اس دوٹوک بیان سے پہلے میں نے اس فرق پر توجہ نہ کی تھی۔

پہلے حصے 'اردو کی ابتدا اور ارتقا کے نظریے' میں چار مضامین ہیں، ڈاکٹر زور، مسعود حسین خان، منِ کم سواد اور خلیل بیگ صاحب کے۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مضمون میں چوکھی لڑی ہے۔ اپنے علاوہ دوسرے سب لکھنے والوں کے نظریوں پر اعتراض کیے ہیں۔ ان میں محمود شیرانی، پنڈت کیفی، سلیمان ندوی، سنتی کمار چٹرجی، سدھیشور ورما، احتشام حسین، مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری شامل ہیں۔ ہم ان علما کے نظریات کے اہم نکات سے جس سلجھے ہوئے طریقے سے واقف تھے، ڈاکٹر زور نے اپنے تجزیے سے انھیں اس طرح الجھا دیا ہے کہ کم از کم میری تو کچھ ایسی کیفیت ہوگئی ہے۔

ع شد پریشاں خواب من از کثرت تدبیر ہا

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مضمون ''اردو کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات'' ۱۹۷۱ء میں ایک انگریزی رسالے میں شائع ہوا۔ اردو کے قارئین کو اس سے ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا نظریہ ان کی کتاب 'مقدمہ تاریخ زبان اردو' کے آخری ایڈیشن میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ یہ اس مجموعے کے دوسرے حصے میں درج کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ زیر نظر

مجموعے کے زمرہ اور زمرہ ۲ میں کوئی امتیازی فرق نہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں وہ خسرو کی مثنوی نہ سپہر میں مندرجہ زبانوں کی فہرست کا تجزیہ کرتے ہیں۔ خسرو کا ایک مصرع ہے۔

ع معبری ، گوری و بنگال و اَدو

مسعود صاحب گوری کے معنی آسامی لکھتے ہیں (ص ۳۵) جب کہ اس سے پہلے مقدمۂ تاریخ زبان اردو میں وہ اس کے معنی مغربی بنگال کی زبان لکھ چکے ہیں (طبع ۱۹۸۷ء، ص ۸۷ حاشیہ) حقیقت یہ ہے کہ نہ سپہر میں خسرو کی گنائی ہوئی زبانوں کی فہرست کو غیر ضروری اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ انھوں نے ایک عطائی کے طور پر زبانوں کے غلط سلط نام درج کر دیے ہیں جو نہ جامع ہیں نہ مانع۔ انھیں بالخصوص مشرق اور جنوب کی زبانوں کے ناموں اور تشخیص کا کوئی شعور نہ تھا۔ ہم عام طور سے گوڑ کے معنی بنگال سمجھتے ہیں۔ گوری و بنگال تکرار معلوم ہوتی ہے۔ اگر گوڑی سے مراد مغربی بنگال کی زبان ہے تو کیا یہ مشرقی بنگال کی زبان سے مختلف ہے؟ اور اگر اس کے معنی آسامی ہیں تو یہ معنی کس بنا پر متعین کیے گئے۔

زبانوں کے ناموں کی قرأت اور مفہوم پر اتفاق نہیں۔ کشمیری کے بعد وہ 'کبر' کہتے ہیں کہ ڈگر؟ مقدمۂ تاریخ میں مسعود صاحب نے اسے ڈگر کہہ کر ڈوگری اور ممتاز حسین کی روایت میں دگر/ دکیر/ دیوکیر پڑھ کر مراٹھی مراد لی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے کبر کے معنی خسرو شناسی (ص ۲۳۶) اور 'امیر خسرو کا ہندوی کلام' (طبع اول ص ۲۹) میں ڈوگری لکھے ہیں اور آخر الذکر کی طبع دوم میں ممتاز حسین کی تقلید میں مراٹھی۔ 'کبر' یا 'دگر' سے نہ ڈوگری مراد لی جا سکتی ہے نہ مراٹھی۔ مفسروں کے قیاس پر ہیں۔ ڈوگری لاہوری سے اتنی مختلف نہیں کہ اسے علیحدہ زبان کا درجہ دیا جائے۔ دراصل اس فہرست میں اڑیا، آسامی اور مراٹھی غائب ہیں۔ کون جانے کہ گوری 'کبر' دھور سمندری اور معبری سے کیا مراد ہے۔ خسرو دہلوی (کھڑی بولی) اور اود (اودھی) کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن برج بھاشا کا نام حذف رکھتے ہیں۔ ان سب التباسات اور عدم وضاحت کی بنا پر میں اس فہرست کو معتبر لسانی نقشہ نہیں مان سکتا۔

میرا مضمون "اردو کے آغاز کے نظریے" اصلاً ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس سے کہیں بہتر شکل رسالہ نقوش شمارہ ۱۴۰ میں ملتی ہے۔ وہاں مضمون بہت طویل ہے لیکن اس کا مرکزی حصہ لیا جا سکتا تھا۔ اس حصے کی بیت الغزل مرتب مرزا خلیل بیگ کا طویل مقالہ "اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے (ایک تنقیدی جائزہ)" ہے۔ انھوں نے اس سلسلے کے جملہ لکھنے والوں کے نظریات کو بہت سلیم الطبعی کے ساتھ پرکھا ہے۔ دراصل ان کے اس مضمون کے ہوتے دوسروں کے مضامین کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ مرتب نے ان سب کے نظریات کو مختصراً پیش کر دیا ہے۔ ہاں تفصیل کی خاطر نظریہ سازوں کی اپنی تحریر دینے کا جواز ہے۔ اردو کے آغاز کے نظریے پیش کرنے والوں میں مجھے شامل کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ مجھ سے پہلے دوسرے بھی کہہ چکے ہیں۔ ہاں اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنے کی بات نئی ہے۔ میں نے اسے مسئلے کی وضاحت کی خاطر کہا ہے۔

دوسرے حصے کا عنوان "اردو کا آغاز و ارتقا" ہے۔ اس میں مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، سہیل بخاری اور مرزا خلیل بیگ کے مضامین ہیں۔ اب کی بار مسعود حسین خان کا مضمون مفصل ہے۔ اس میں انھوں نے بطور خاص شوکت سبزواری کے پنجابی نظریے اور محمد حسین آزاد کے برج کے نظریے کی تغلیط کی ہے اور آخر میں اپنا نظریہ دیا ہے۔ وہ لسانی تجزیے کے لیے دکنی کی جن تصانیف کو مستند جان کر بنیاد بناتے ہیں ان کی تعداد سات ہے جب کہ مقدمۂ تاریخ زبان اردو میں یہ ۱۰ تھی (ص ۱۳۔۱۱۲)۔ تعداد کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انھوں نے دونوں جگہ کتابوں کی تاریخ ایک عیسوی سنہ میں دی ہے۔ اصلاً ان کتب کے ہجری سنین ہی ملتے ہیں۔ جب تک ماہ و یوم معلوم نہ ہوں احتیاط کا تقاضا ہے کہ دو عیسوی سنین دیے جائیں۔

دکنی کتابوں کے بعد انھوں نے شمالی ہند میں کھڑی بولی کی سب سے مستند تصنیف کتب شتک کا ذکر کیا ہے جسے ماتا پرشاد گپت نے مرتب کیا اور جو ۱۵۷۰ء سے قبل کی تصنیف ہے (ص ۹۴)۔ یہ اطلاع نہایت اہم ہے۔ کاش وہ اس کا نمونہ بھی دے دیتے۔ مقدمۂ تاریخ زبان

اردو طبع ۱۹۸۷ء میں اس موقع پر اس کتاب کا نام نہیں دیا گو کتابیات میں اس کا نام موجود ہے جو بنارس سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی (ص ۲۶۹)۔ میں ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک الٰہ آباد یونیورسٹی میں تھا اور وہاں اردو ہندی کے لسانیاتی امور کے سلسلے میں وہاں کے ہندی ماہرین لسانیات سے اکثر ملا کرتا تھا۔ حیرت ہے کہ مجھے کسی نے اس کتاب کا نام نہیں بتایا۔ زیر نظر مضمون میں دکنی لاحقہ چ کے سلسلے میں ایک بار پھر ص ۹۹ پر کتب شتک کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے نیز عہد شاہ عالم کی ایک نظم کے حوالے سے خیال ظاہر کرتے ہیں کہ لفظ کے آخر میں چ بمعنی ہی دکنی ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شمالی ہند میں بھی پائی جاتی ہے۔ مضمون کے آخر میں وہ یہ اہم مشاہدہ کرتے ہیں۔

"یہی زبان دہلوی ہندی شاعری کی روایات میں کتب شتک کی زبان ہے اور شاعری کے اسالیب میں نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی زبان۔"

میں اس مشاہدے پر تیسرے حصے دکنی کے سلسلے میں عرض کروں گا۔

اس حصے کا دوسرا مضمون 'اردو زبان کا ارتقا' ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ہے۔ واللہ اعلم یہ ان کی کتاب اردو زبان کا ارتقا سے ماخوذ ہے یا علیحدہ مضمون کی شکل میں لکھا گیا؟ میں نے ان کی کتاب 'اردو زبان کا ارتقا' کی سرسری طور پر ورق گردانی کی، اس میں یہ تحریر نظر نہ آئی۔ ممکن ہے اپنی کتاب کی تلخیص ایک مضمون کی شکل میں کی ہو۔ اس میں وہ اردو کے ارتقا کی یہ حیرت ناک تاریخیں بیان کرتے ہیں۔

"اردو کے چار ارتقائی دور ہیں۔ پہلا قدیم دور ۶۰۰ ق۔م پر ختم ہوا، دوسرا ۵۰۰ عیسوی پر اور تیسرا ۱۰۰۰ عیسوی پر۔ چوتھے دور کا آغاز میرے خیال میں ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ ہوا اور ۱۸۰۰ء پر اختتام پر پہنچا۔ درمیان کے دو سو سال (۱۰۰۰ء تا ۱۲۰۰ء) اردو کے لیے عبوری یا تعمیری زمانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔" (ص ۱۰۵)

۶۰۰ ق م تا ۱۲۰۰ء میں اردو کا موجود ہونا میرا سر چکرائے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اردو کے نہیں، ہند آریائی کے دور ہیں، چنانچہ آگے لکھتے ہیں۔

''۱۲۰۰ء کے لگ بھگ اردو نکھر کر سامنے آئی۔'' (ص ۱۰۶)

''میرے خیال میں اردو کا ابھار بارہویں صدی میں ہوا۔'' (ص ۱۰۷)

بارہویں صدی یا ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ اردو کا نکھرنا تو درکنار، یہ ابتدائی حیثیت میں بھی نہ تھی۔ ان کا دعویٰ بے دلیل ہے۔ آخر میں یہ اہم خیال ظاہر کرتے ہیں۔

''بہرحال یہ امر شبہ سے بالاتر ہے کہ قدیم دکنی اردو کا قدیم روپ ہے۔ قدیم اردو کے جلوے دکن کی تصانیف میں دیکھے جا سکتے ہیں جن کا سلسلہ تیرہویں صدی سے شروع ہوا۔'' (ص ۱۱۲)

تحقیق میں صحتِ الفاظ پر خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔ کون سی دکنی تصنیف تیرہویں یا چودہویں صدی کی ہے؟

اس حصے کا تیسرا مضمون ''اردو زبان کا آغاز و ارتقا'' سہیل بخاری کے قلم سے ہے جو اپنے انوکھے نظریوں اور اصطلاحوں کے لیے مشہور ہیں۔ شروع ہی میں کہتے ہیں کہ شاہجہاں کے عہد میں بادشاہ اور حکومت کا عملہ دہلی منتقل ہوا تو ان کے علاقے کو 'اردو محلہ' کہنے لگے۔ دلی کے قدیم شہر کی زبان دہلوی کہلاتی تھی، اس سے امتیاز کی خاطر لوگ نئے محلے کی زبان کو 'زبان اردو محلہ' کہنے لگے جو کتابوں میں 'زبان اردوئے معلیٰ' کی ترکیب میں نظر آتا ہے۔ بعد میں زبان اردو محلہ کو اردو کہنے لگے۔ (ص ۱۱۲۔۱۱۳)

انھوں نے اس انکشاف کا کوئی ثبوت یعنی ماخذ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ 'اردوئے معلیٰ اصلاً' 'اردو محلہ' تھا۔ آگے لکھتے ہیں۔

''کھڑی بولی علاقہ'' کھڑ، کی بولی ہے اور کھڑ غالباً اڑیسہ کے جنوب میں سمندر کے قریب واقع ایک کھٹا پھٹا علاقہ ہے کیوں کہ کھڑے کے متبادل الفاظ کھنڈ اور کاٹ ہیں۔ اسی علاقے میں جارج گریرسن کے قول کے مطابق کھڑیا اور کٹیائی نامی دو ملتی جلتی سی زبانیں بولی جا

رہی ہیں۔۔۔ میرے اندازے کے مطابق یہی اس کھڑی بولی کی جنم بھومی ہے۔ جس کی فارسی لپی میں قلم بند کی ہوئی ایک شکل کو ہم اردو کہتے ہیں اور دیوناگری لپی میں قلم بند کی ہوئی دوسری شکل کو ہم ہندی کے نام سے پکارتے ہیں۔۔۔ اب یہ ذمے داری بھارت کے زبان شناسوں کی ہے کہ وہ کھڑی بولی کی جنم بھومی کا سراغ لگائیں اور اس علاقے کی تحقیق کریں جس کی میں نے نشان دہی کی ہے۔" (ص ۱۱۶-۱۱۵)

ہے کوئی اس لسانی مجذوبیت کا جواب؟ سہیل بخاری کے نشاں دادہ علاقے کی کھوج کے لیے جس لسانی کولمبس کی ضرورت ہے اس کا ابھی کتم عدم سے منصۂ شہود پر ظہور نہیں ہوا۔ اس کے آگے سہیل شمالی ہند کے دیوناگری اور اردو خط میں لکھے ہوئے نمونوں کی مدد سے کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ مفید نشان دہی ہے۔ اس میں انھوں نے کئی ایسی چیزیں بھی شامل کر لی ہیں جن کا انتساب مشکوک، بلکہ کمزور ہے مثلاً نور جہاں سے منسوب آج کی زبان کے اردو اشعار جو رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق تذکرہ میر حسن میں معین بدایونی تلمیذ سودا کے نام سے درج ہیں (ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ ص ۳۴)

اس زمرے کا چوتھا مضمون "اردو کا لسانی ارتقا شمالی ہند میں" مرزا خلیل احمد بیگ کے قلم سے ہے اور یہ طویل مقالہ حسب معمول اس حصے کا عمل سرسید ہے گو مجھے اس کی بعض جزئیات سے اختلاف ہے۔

۱۔ "اپ بھرنش میں (ڑ) اور (ڑھ) مصمتے نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کا ارتقا پیش اردو میں ہوا۔" (ص ۱۳۳)

میں براہ راست کچھ نہیں جانتا۔ ڈاکٹر شیام سندر داس سنسکرت اور لسانیات کے عالم تھے۔ وہ اپنی کتاب بھاشا وگیان میں خبر دیتے ہیں کہ پالی، شورسینی پراکرت اور اپ بھرنش تینوں میں ڑ، ڑھ پائے جاتے ہیں۔ (بھاشا وگیان، بنارس طبع سوم ۱۹۴۴ء، ص ۱۵۲-۵۳)

۲۔ "خسرو کی ہندی (اردو) شاعری مشتبہ سہی، لیکن بقول پروفیسر مسعود حسین خاں خسرو کے صاحب دیوان ہندی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔" (ص ۱۴۱)

اگر مسعود حسین خاں یا خلیل بیگ یہ کہتے کہ خسرو نے ہندی میں ضرور کچھ نہ کچھ کہا ہے تو مجھے اعتراض نہ ہوتا لیکن ان کو ایک پورے ہندی دیوان کا خالق قرار دینا ایسا دعویٰ ہے جس کا کوئی واثق ثبوت نہیں۔ شاید خلیل بیگ صاحب کے لیے مسعود حسین خان کا قول کافی ثبوت ہے۔

۳۔ ''اس کے مصنف روشن علی کا تعلق'' ''سہارنگ پور'' (موجودہ سہارن پور ص ۲۷) سے ہے۔'' بیگ نے حوالہ ۲۷ کے تحت مسئلے پر مفصل حاشیہ لکھا ہے (ص ۷۵-۱۷۳) جیسا کہ میں دوسرے موقعوں پر بارہا لکھ چکا ہوں فٹ نوٹ کا استعمال پر مغز معلومات کے لیے نہیں کرنا چاہیے ایسی تمام معلومات متن ہی میں دینی چاہئیں۔ مجھے دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ انھوں نے سہارنگ پور کو سہارنپور قرار دینے کے دو معترضین ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ کے بیانات دیے، دو اور اشخاص کے ایسے ہی مشاہدات درج کرنے ضروری تھے۔

الف۔ سید قدرت نقوی: مضمون ''عاشور نامہ'' مشمولہ نذر مختار۔ دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۲۹۷ تا ۳۰۰۔

ب۔ گیان چند: مضمون ''ڈاکٹر مسعود حسین خاں بہ حیثیت ادبی محقق'' مشمولہ نذر مسعود، علی گڑھ ۱۹۸۸ء ص ۳۸-۱۳۵۔

ڈاکٹر بیگ سب کچھ درج کرنے کے بعد اپنے استاد سے اتفاق کرتے ہوئے سہارنگ پور کو سہارنپور ہی مانتے ہیں۔ مجھے ان کی شاگردانہ سعادت مندی پر خوشی ہے کہ وہ کہیں اپنے استاد کے کسی بیان سے سر مو اختلاف کو روا نہیں رکھتے۔ میں نے تو اپنے شاگردوں کو کسی سے اختلاف کرنے کی اس حد تک ہمت افزائی کی ہے کہ وہ میری کتاب پر معترضانہ تبصرہ لکھتے ہیں گو نہایت احترام کے ساتھ، یا خود میری نگرانی میں جو پی ایچ ڈی یا ایم فل کے مقالے لکھے گئے ہیں ان میں میرے موقف سے اختلاف کرتے ہیں اور یہ ایک دو شاگردوں نے نہیں، متعدد شاگردوں نے کیا ہے۔ میں ان کی آزادیٔ فکر و اظہار پر خوش ہوں۔ اگر دو یا میں صف اول کے

محققوں (قاضی عبدالودود، مالک رام، عرشی صاحب اور مسعود حسن رضوی) یا نقادوں (سرور، احتشام، شمس الرحمٰن فاروقی، نارنگ اور محمد حسن وغیرہ) سے اختلاف کر سکتے ہیں تو اپنے استاد سے کیوں نہیں؟

۴۔ وہ مولوی عبدالحق کی دریافت شدہ اجے چند بھٹناگر کی منظوم لغت مثلِ خالق باری کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ مصنف نے کتاب کا نام کہیں نہیں بتایا۔ (ص ۱۵۳)۔ یہ بات درست ہے لیکن بیگ صاحب کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے نسخۂ بھوپال سے لے کر یہ پوری مثنوی غالب نامہ دہلی بابت جنوری ۱۹۸۶ء میں چھاپ دی ہے۔ اس کے ترقیمے میں اس کا نام "اجے چند نامہ" لکھا ہے۔ کاتب نے جس قدیم تر نسخے سے نقل کیا ہے اس میں یہ نام دیا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہی مثنوی مولوی عبدالحق کی مثل خالق باری ہے جس کا نسخہ کراچی میں محفوظ ہے۔

حیرت ہے کہ بیگ صاحب آج کے زمانے میں نوطرزِ مرصع کا سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء لکھتے ہیں جب کہ یہ بالیقین ۱۷۷۵ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس کی تدوین پر نورالحسن ہاشمی کا مقدمہ دیکھ سکتے ہیں۔ بیگ لکھتے ہیں کہ قصہ مہر افروز و دلبر اور نوطرزِ مرصع کے درمیان چالیس سال کے فصلِ ربانی میں قرآن پاک کے چند ترجموں سے قطعِ نظر نثر کی ایک کتاب بھی نہیں لکھی تھی۔ (ص ۱۶۴)

ڈاکٹر بیگ نے ان دونوں کتابوں کے سنین بالترتیب ۱۷۵۹ء اور ۱۷۹۸ء لکھے ہیں۔ ان سنین کے درمیان شمالی ہند میں کئی اور نثری کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً

الف۔ رستم علی: قصہ و احوال روہیلہ ۱۷۷۴ء اور ۱۷۸۱ء کے درمیان (جمیل جالبی کی تاریخ، جلد دوم حصہ دوم، ص ۱۰۷۵)

ب۔ میر حسن متوفی ۱۷۸۶ء: یازدہ مجلس معروف بہ اخبار الائمہ (نیا دور جون ۹۵ء، ص ۴۴۔ ۴۵)

ج۔ شاہ عالم: عجائب القصص ۱۲۰۷ھ/۹۳-۱۷۹۲ء

د۔ شاہ حسین حقیقت بریلوی: جذبِ عشق ۱۲۱۱ھ/ ۹۷-۱۷۹۶ء

مضمون کی آخری فصل نمبر ۶ میں شاہ حاتم و میر و سودا کے زمانے کی اصلاحاتِ زبان کی مفید فہرست دی ہے جس میں ۲۰ شقیں ہیں۔ اعتراف کرتا ہوں کہ اردو کے ارتقا کے بارے میں ان کا یہ مضمون بہت جامع اور مفصل ہے۔ چند کم اہم جزئیات کو چھوڑ کر مجموعی طور پر میں اس کی داد دیتا ہوں۔

آخر میں ایک بات۔ ہم اردو والے جب اردو یا کھڑی بولی کے آغاز کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں کہ وہ فلاں اپ بھرنش سے نکلی، فلاں سے نہیں یہ بارھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں فلاں فلاں زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں تو یہ کتنی غیر اصلی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے اصل مآخذ نہیں دیکھے، دوسروں سے سنی سنائی پر انحصار کر کے قطعی دعوے کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور ہوں کہ مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری ہوں کہ سہیل بخاری کہ میں، ہم میں سے کسی کو شورسینی یا دوسری اپ بھرنشوں سے واقفیت نہیں، ہیم چندر وغیرہ کی قواعد، ویر گاتھا کال کے راسو نہیں پڑھے۔ وسطی ہند آریائی کے آخری دور کی زبانوں اور جدید ہند آریائی کی ابتدائی صدیوں کے دیوناگری خط میں دستیاب نظم و نثر کو دیکھے بغیر ان سے نتیجے نکالنا معتبر تحقیق نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈاکٹر بابو رام سکسینہ جیسے سنسکرت اور لسانیات کے ماہر سے پوچھا کہ کھڑی بولی کس اپ بھرنش سے نکلی ہے تو ان کا عالمانہ جواب تھا "بھائی میں نہیں جانتا ہر دیو یا ہری سے پوچھو۔" اس کے مقابلے میں میری یہ جسارت کہ شورسینی اور اپ بھرنش کی بات کرتا ہوں۔ انگریزی کی کہاوت درست ہے "ناواقفیت برکت ہے۔"

مجموعے کا تیسرا حصہ 'دکنی اردو' ہے۔ دکنی بولی پر علیحدہ سے ایک حصہ دینے کا جواز ہے کیونکہ اردو زبان کی ابتدائی تین صدیوں کی تاریخ دکنی کی تاریخ کے علاوہ نہیں۔ اس حصے میں پانچ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون عبدالقادر سروری مرحوم کا ہے 'دکنی زبان' ۳۳ صفحات کو محیط۔ ابتدا میں تاریخی پس منظر ہے، اس کے بعد دکنی زبان کی خصوصیات ہیں جو نہایت مفصل، جامع اور مناسب ترتیب کے ساتھ ہیں۔ سروری صاحب دکنی بھی تھے اور لسانیات کے واقف کار

بھی ،اس لیے ان کا مضمون سلیقے کا تو ہونا ہی تھا۔

دوسرا مضمون ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا ہے "دکنی یا اردوئے قدیم؟" نظریاتی اعتبار سے یہ نہایت اہم مضمون ہے گو متنازع بھی۔ اس کا بنیادی مداد کنی کی انفرادیت اور تشخص سے انکار ہے۔ اہلِ دکن اس موقف سے ناراض اور شکوہ سنج ہیں۔ واضح ہو کہ کئی صدی پہلے باقر آگاہ نے دکنی کی تحقیر پر نعرۂ احتجاج بلند کیا تھا۔

"اکثر جاہلانِ بے معنی و ہرزہ درایان لایعنی زبانِ دکنی پر اعتراض اور گلشنِ عشق و علی نامہ کے پڑھنے سے اعراض کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب لگ ریاست سلاطینِ دکن کی قائم تھی زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج اور طعن و شماتت سے سالم تھی۔"(۱)

مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے دکنی اور دکنیت کی تحریک چلائی۔ مسعود صاحب لسانیاتی جائزہ ہند سے گریرسن کا یہ دلچسپ مشاہدہ درج کرتے ہیں کہ دکنی کو عام طور پر اردو کی بگڑی ہوئی شکل کہا جاتا ہے حالانکہ اس کے خیال میں جدید اردو، دکنی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اس لیے کہ جدید اردو کے مقابلے میں دکنی ،اردو کی زیادہ قدیم شکل ہے۔(ص ۲۱۱)

دکنی اور شمالی اردو کے تعلق کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نظریہ یہ ہے "دکنی بہ استثنائے چند الفاظ اور اختلافِ تلفظ سلاطینِ دہلی کے عہد کے اردوئے قدیم کے سوا اور کچھ نہیں۔" (ص ۲۱۵)

"نہ تو دکنی اردو کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور نہ اردو دکنی کی، دکنی سے ملتی جلتی زبان آج بھی نواح دہلی کے دیہات میں اور شہر دہلی کے مخصوص طبقات میں کرخنداری کے نام سے سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ دکنی زبان کی نہ تو کوئی علاحدہ حیثیت ہے اور نہ دکنی ادب کی کوئی علاحدہ اور مخصوص روایات۔" (ص ۲۱۵)

"تاریخ ہند میں دکن ایک سیاسی مفروضہ رہا ہو تو رہا ہو، لسانی یا تہذیبی

نہیں رہا۔ دکنی کوئی علاحدہ زبان نہیں، منجملہ دیگر نصف درجن ناموں کے یہ بھی اردو کا ایک مقامی نام رہا ہے، اس لیے دکنی ادب یا ادبیات کی اصطلاح نہ تو لسانی اعتبار سے صحیح ہے اور نہ تاریخی اعتبار ہے۔"
(ص ۲۲۲)

صرف ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر آمنہ خاتون نے دکنی کو اردو سے بالکل علیحدہ زبان قرار دیا ہے لیکن یہ دونوں معتبر نہیں۔ یہ مسلمہ ہے کہ دکنی علیحدہ زبان نہیں بلکہ اردو ہی کا پرانا روپ ہے لیکن جب مسعود حسین خان، حنیف نقوی (۲) اور شمس الرحمٰن فاروقی (۳) یہ کہتے ہیں کہ دکنی، شمالی اردو سے مختلف نہیں تو میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ زماں و مکاں کے تفاوت کے سبب دکنی، اردو کی ایک واضح ذیلی بولی ہے۔ تبھی تو اس مجموعے میں دکنی اردو کی فصل میں پانچ مضمون نگاروں نے، بہ شمول مسعود حسین خاں، شمول دکنی کی لسانی خصوصیات درج کی ہیں۔ مسعود صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ دکنی اور شمالی اردو میں محض چند الفاظ اور ان کے تلفظ کا فرق ہے۔ یہ اختلاف سیکڑوں الفاظ میں ہے۔ ثبوت؟ وہ اپنی مرتبہ دکنی اردو کی لغت دیکھ لیں جہاں یہ الفاظ بڑے سائز کے پونے چار سو صفحات سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

مجھے مسعود صاحب کے اس قول سے بھی اتفاق نہیں کہ دکنی ادب کی کوئی علاحدہ اور مخصوص روایات نہیں۔ دکنی میں صوفیوں کے رسالے، مذہب و اخلاق کے موضوع پر مثنویوں کا انبار (جو شمالی ہند میں نہیں ملتا)، غزل کے بجائے مثنوی کا مرکزی ادبی صنف ہونا، غزل میں محبوب کی جنس اور شمالی ہند کی غزل سے عام طور پر موضوعی اختلاف، دکنی کی متعدد مخصوص اصناف نثر و نظم مثلاً جکری، سہیلا، سی حرفی، خواتین اور بچوں کے لیے معرفت و اخلاق کی نظمیں مثلاً آنکھ مچولی، ناری نامہ، لگن نامہ، شادی نامہ، سہاگن نامہ، لوری نامہ، چکی نامہ، چرخہ نامہ وغیرہ پیغمبر اسلام سے متعلق ناموں کے عنوان کی نظمیں جو شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں بہت زیادہ ہیں، کربلا سے متعلق دو اصناف زاری، واویلا وغیرہ دکنی ادب کی ایسی خصوصیات ہیں جو اسے شمالی ہند کے ادب سے ممیّز کرتی ہیں۔ فی الوقت تفصیل کا موقع نہیں۔

افسوس کہ وہ دکنی (بولی) اور دکنی ادب کا لفظ سننے کے بھی روادار نہیں اور اسے محض اردوئے قدیم کہتے ہیں۔ اسی نام سے انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے رسالہ اردوئے قدیم جاری کیا۔ شمس اللہ قادری نے جو اپنی تاریخ کا نام اردوئے قدیم رکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مختصراً ہی سہی لیکن انھوں نے شمالی ہند کے قدیم شعرا اور نثر نگاروں کا بھی ذکر کیا تھا یعنی ان کی کتاب محض دکن کے علاقے اور دکنی ادبیات تک محدود نہ تھی۔ مسعود حسین خاں اور دوسرے علماء کا دکنی بولی کی لسانی اور ادبی انفرادیت سے انکار کر کے اسے اردو زبان کے وسیع سمندر میں ضم کرنا لسانی توسیع پسندی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لسانی اعتبار سے عبدالستار دلوی کی مرتبہ کتاب دکنی اردو، تہذیبی اعتبار سے نصیر الدین ہاشمی کی دکنی کلچر اور ہارون خاں شروانی کی دکنی کلچر کا نام لکھنا کافی ہے۔ جہاں تک دکنی ادبیات کا تعلق ہے اردو میں دکنی ادب کی تاریخ (ڈاکٹر زور)، دکنی رباعیاں (ڈاکٹر سیدہ جعفر)، دکنی غزل (ڈاکٹر محمد علی اثر)، دکنی داستانیں (فرزانہ خاتون)، دکنی مثنویوں میں منظر نگاری (ملنسار اطہر احمد)، دکنی مرثیے (بحوالۂ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند جلد ۶، ص ۴۷۶)، دکنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین (نصیر الدین ہاشمی) جیسی کتابیں اردو ادب کی تاریخ میں دکنی ادب کے تشخص کا اثبات کرتی ہیں۔ خود مسعود صاحب کی صدارتِ شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی میں ۱۹۶۴ء میں مجلہ عثمانیہ کا دکنی ادب نمبر شائع ہوا جس کے متعدد مضامین کے عنوان میں دکنی کا لاحقہ موجود ہے مثلاً دکنی مثنویاں، دکنی غزلیں، دکنی قصائد، دکنی مرثیہ، دکنی رزمیہ شاعری، دکنی رباعیاں، دکنی گیت، دکنی ضرب الامثال، انتخاب جدید دکنی شاعری وغیرہ۔

اس حصے کے تیسرے اور چوتھے مضمون غلام عمر خاں کا ''دکنی کے بعض لسانی رجحانات'' اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا ''گجری اور دکنی اردو'' اپنے اپنے موضوع پر نہایت قابل قدر ہیں۔ مدنی نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ سے اشرف بیابانی کی ایک لغت واحد باری کا ذکر کیا ہے (ص ۲۶۶)۔ یہ سخت غلط فہمی ہے۔ واحد باری کا مصنف بہت بعد کا بریلی الاصل شاعر اشرف ہے جس نے نظام سکندر جاہ کے عہد میں یہ منظوم لغت لکھی۔ اس حصے کا پانچواں مضمون حسب

معمول جناب مرتب کا ہے "دکنی اردو۔ آغاز و ارتقا اور لسانی خصوصیات" وہ لکھتے ہیں:

"اردو کے آغاز و ارتقا کے بارے میں غور کرتے وقت امیر خسرو کی "ہندوی" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امیر خسرو کی ہندی دراصل دہلی اور نواح دہلی (دہلی و ہیرامش) کی بولیوں کا مرکب ہے۔" (ص ۲۷۶)

ڈاکٹر بیگ سے قدرے چوک ہوئی۔ امیر خسرو نے صرف نواح دہلی کی زبان کو ہندوی نہیں کہا بلکہ جملہ ۱۲ زبانوں کے لیے کہا ہے۔ ایں ہمہ ہندوی ست زایام کہن۔

بیگ صاحب نے اپنے مضمون میں دکنی ادب پر بھی نظر ڈالی ہے۔ وہ بھی واحد باری کو اشرف بیابانی سے منسوب کرنے کی غلطی کر گئے ہیں۔ اسی صفحے پر لکھا ہے کہ سید عبداللہ حسینی نے نشاط العشق کا دکنی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے (ص ۲۸۸)۔ صورت حال یہ ہے کہ یہ کتاب کہیں موجود نہیں۔ اسٹیوارٹ نے فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان میں ایک نثری کتاب "نشاط العشق شرح غوثیہ" کا اندراج کیا ہے لیکن اس کے مصنف، مترجم یا شارح کا نام نہیں لکھا۔ اسٹیوارٹ کے بعد کسی نے اس کتاب کو نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں کس بنا پر نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں اور شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں اس تالیف کو سید عبداللہ حسینی سے منسوب کر دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ دونوں مورخوں میں سے کس نے پہلے لکھا اور کون اس کا ناقل ہے۔ میرے پاس دونوں کی کتب کے پہلے ایڈیشن نہیں۔ جس قدیم کتاب کا وجود ہی نہ ہو اس کے بارے میں کیونکر کہا جائے۔

بیگ لکھتے ہیں:

"محمد افضل، افضل (۱۶۲۵ء) جو بکٹ کہانی کا مصنف ہے۔" (ص ۲۹۱)

علی قلی خاں والہ داغستانی نے فارسی شعرا کے تذکرہ ریاض الشعرا میں کسی افضل متوفی ۱۰۳۵ھ کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے سلسلے میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ بکٹ کہانی کا مصنف ہے۔ مصنف بکٹ کہانی کو یہ سنہ وفات عطا کرنے کی کوئی بنا نہیں۔ تاریخی اور ادبی پس منظر کے بعد

خلیل بیگ نے دکنی اردو کی خصوصیات صوتیات، صرف ونحو اور قواعد کے حوالے سے پیش کی ہیں۔ یہ ان کا میدان ہے اور یہ بیان پوری طرح سے طمانیت بخش ہے۔

مجموعے کا چوتھا اور دلچسپ حصہ "اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ" ہے جس میں پانچ مضامین ہیں، سجاد ظہیر، راقم الحروف، گوپی چند نارنگ، عبدالستار دلوی اور مرزا خلیل بیگ کے۔ معلوم نہیں مرتب کو یہ علم ہے کہ نہیں کہ ڈاکٹر رام آسرا راز نے ۱۹۷۵ء میں "اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ" کے نام سے اپنی مستقل کتاب شائع کی۔ زیرِ نظر فصل کا سب سے پہلا مضمون سجاد ظہیر کا "اردو، ہندی اور ہندوستانی" ہے ۳۷ صفحوں کا۔ یہ غالباً ان کے اس نام کے پورے کتابچے کی نقل ہے۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کلاسکی مضمون کی تحقیق قابل قدر ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم ہے اس کا صلح کل جذبہ جو وجد آور ہے۔ دوسرا مضمون میرا ہے جس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ڈاکٹر نارنگ کے مضمون کا عنوان "اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک" ہے جس میں مشترک عناصر کی نشان دہی یقیناً قابل داد ہے۔ مضمون کے آخری چار پانچ صفحے ملاحظہ کیجیے۔

اس حصے کا ایک قابل قدر مضمون "اردو کا ہندوستانی رجحان" ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے لکھا ہے۔ اردو دنیا میں یہ واحد شخص ہیں جو اردو اور لسانیات دونوں میں الگ الگ پی ایچ ڈی ہیں۔ یہ عرصے تک مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے شاندار مضمون میں اردو کے قدیم و جدید ادب سے ہندوستانی انداز کی نظم ونثر کے اتنے وافر نمونے پیش کیے ہیں کہ اسی مسلک کو اختیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سجاد ظہیر اور ستار دلوی کے مضامین محض ادبی نہیں، ایک جذباتی اور ایمانی مسلک کا صحیفہ معلوم ہوتے ہیں۔

آخری مضمون "اردو، ہندی اور ہندوستانی" مرتب ڈاکٹر بیگ کا ہے، محض آٹھ صفحوں کا۔ اس سے پہلے کے صلح وآشتی کے مضامین کے برعکس اس کا انداز مناظرانہ ہے۔ اس میں ایک بار پھر مجھے اعزاز دیا ہے کہ امرت رائے نے اپنی انگریزی کتاب میں اردو کے خلاف جو زہر اگلا ہے، اس کی بنیاد میرا ایک جملہ ہے۔

"اردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں ماننا سیاسی مصلحت پسندی ہے،
لسانی حقیقت پسندی نہیں (۴)" (ص ۳۹۴)

میں نے حقیقت، جاننے کے لیے لکھنؤ سے الٰہ آباد فون کر کے امرت رائے سے دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۵ء میں یو پی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی مانگ کی جارہی تھی۔ انھوں نے اسی سال ہندی کے کسی اشتراکی رسالے (یا مجموعے) 'مکت دھارا' میں ہندی اردو کے موضوع پر مضمون لکھ کر اس مانگ کی مخالفت کی۔ ۱۹۷۷ء میں جب انھیں نہرو فیلوشپ ملی تو انھوں نے اردو ہندی کے موضوع کو منتخب کیا۔ واضح ہو کہ میرا مضمون ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ امرت رائے کو اس سے تحریک نہیں ملی۔ وہ اپنا موقف ۱۹۶۵ء ہی میں ضبطِ تحریر میں لا چکے تھے۔

ڈاکٹر بیگ آگے لکھتے ہیں:

"موجودہ صورتِ حال میں ہندوستانی نام کی کوئی زبان نہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ 'ہندوستانی' کسی زبان کا نام نہیں ۔۔۔ دستورِ ہند کی آٹھویں شیڈول میں بھی ہندوستانی کا ذکر نہیں۔ اردو کو ہندوستانی کہنا یا اردو ہندی کو ملا کر ہندوستانی نام دینا محض مفروضہ ہے۔" (ص ۳۹۶)

یہ درست ہے کہ دستور کے آٹھویں جدول میں ہندوستانی کا ذکر نہیں لیکن دفعہ ۳۵۱ میں ضرور ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون "جدید صوتیات اور علمِ تجوید" مشمولہ "لسانی تناظر" میں لسانیات کا یہ بنیادی مفروضہ تسلیم کیا ہے۔

"کسی زبان کے لسانیاتی مطالعے میں تقریر یا تکلم کو اولین حیثیت حاصل ہے یعنی اصل زبان وہ تصور کی جاتی ہے جو تقریری یا تکلمی ہوتی ہے۔"

ہندی علاقے کے ہندو اور مسلمان جس مشترک زبان میں بات چیت کرتے ہیں، اسے ہندی کہنا درست ہے کہ اردو؟ ہندو اسے ہندی اور مسلمان اردو کہتے ہیں۔ ایک ہی زبان کے دو نام کیا معنی ہیں؟ حقیقت ان دونوں ناموں سے ہٹ کر ہے۔ یہ مشترک زبان "ہندوستانی"

ہے اور صرف ''ہندوستانی'' جو اردو اور ہندی سے کہیں بڑی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر بیگ نے اس مجموعے میں (میرے دو مضامین کو چھوڑ کر) بڑے قابلِ قدر اور اہم مضامین جمع کر دیے ہیں جن سے عنوانِ کتاب ''اردو زبان کی تاریخ'' کا حق بڑی حد تک ادا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے متفرق مضامین کا مجموعہ ایک مستقل کتاب کا نعم البدل تو ہو نہیں سکتا۔ پھر سب مضامین ایک معیار کے نہیں مثلاً خود مرتب کی تحریروں میں پہلے دو مضامین جتنی بلند سطح کے ہیں، بعد کے دو حصوں کے مضامین اس معیار کے نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ غور کرنے والا ہر قاری بعض مضامین کے بعض مشمولات سے اتفاق نہیں کرے گا۔ یہی علم کی جمہوریت ہے۔ اس اختلاف سے مزید غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ قارئین کو اس مجموعے سے بہت کچھ روشنی ملے گی، ان کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوگا۔

حواشی

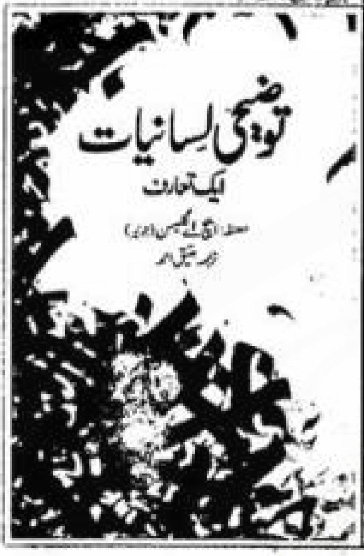
۱۔ دیباچہ، گلزارِ عشق مشمولہ علیم صبا نویدی: مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر (مدراس ۱۹۹۴ء ص ۱۴۳)

۲۔ شب خون دسمبر ۸۷ء تا جنوری فروری ۸۸ء۔

۳۔ شب خون جون تا اگست ۸۸ء۔

۴۔ میرے مضمون میں 'مصلحت' اور 'حقیقت' دونوں کے بعد 'پسندی' کا لاحقہ نہیں۔ دیکھیے میرا مجموعہ حقائق ص ۳۴۳۔

☆☆☆









an artwork by ARTWORKS INTL.
Kh. Afzal Kamal - 0320 - 4031556